

UNIVERSAL  
LIBRARY

**OU\_224480**

UNIVERSAL  
LIBRARY

# BROWN BOOK

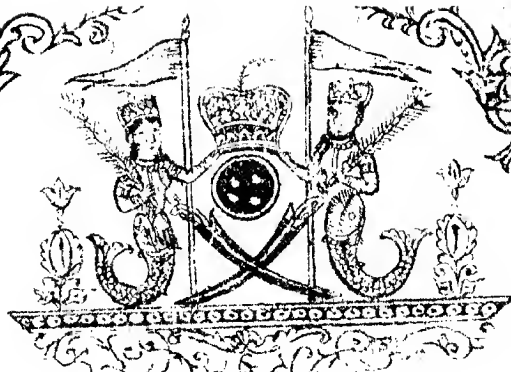
224470











عہد پیری شباب کی باتیں  
ایسی ہیں جیسی خواب کی باتیں

OSMANIA UNIVERSITY  
COLLEGE LIBRARY

شباب کا  
ظہور

مولفہ محمد احد علی صاحب پنی رے

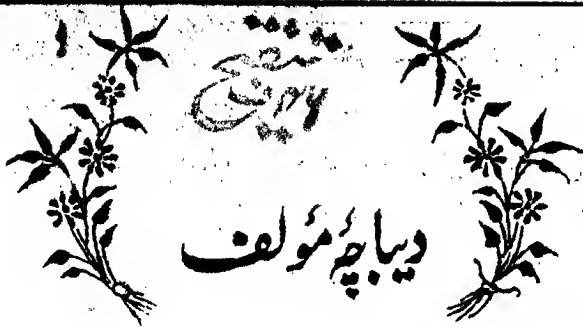
پرنٹر و پبلشر مشقی سخا و تعلی علوی

۱۳۱۹ء

الناظرین واقعہ کنوین طبع ہو

من تالیف محفوظ





انیسویں صدی کے اس چل چلاؤ کے وقت میں جبکہ جمہوری حکومت کے خیالات ہر ایک تعلیم یافتہ شخص کے دل میں رچے بسے ہیں۔ دنیا کا کیا ذکر خود اسی ہندوستان کے توہم پرست اور حاکم وقت کو نظر انداز نہ کیجئے دالے باشندے بھی حکومت خود اختیاری کے مدرسے میں جمہوری اور نسلی سلطنت کے اصول کا سبق پڑھ پڑھ کر آزدی اور مطلق العنانی کا سودا دماغ میں رکھنے لگے ہیں کسی شخصی حکومت کے نظم و نسق یا خود مختار فرمانروا کے ذاتی حالات عیش و عشرت کی داستانیں راجہ اور پرجائی آسائش پسندی اور فائز البالی کی روایتیں حکایتیں قلمبند کرنا ہرگز ایسا نہیں جس سے تعلیم یافتہ فرستے معلومات میں کسی مفید اضافے کی امید ہو۔ لیکن جب تک دنیا آباد ہے اور جب تک دنیا میں انسان بستے ہیں پرانی باتیں اور اگلے تہ کرے ضرور زبانی بیان ہونگے۔ کتابوں میں لکھے جائیں گے۔ لوگ پڑھیں گے اور شوق سے پڑھیں گے اسے چاہے افسانہ پسندی کی طبعی رجحان پر معمول کرو چاہے یہ مجھو کہ گزرے ہوئے وقتوں اور مریے ہوئے انسانوں کے حالات سننے سے نئی عقلیں روشنی آنے کی امید یہ سب کچھ کراتی ہو۔ بہر فرغ تاریخ اور ترجمے کا فن جسکے ذریعہ سے ہم پرانی باتیں وراپنی باسبق سلسلوں کی سرگزشتیں معلوم ہوتی ہیں کسی نہ کسی پرلے میں ہمیشہ مطبوع خاص و عام رہا ہو ور رہے گا۔ اسی خیال کو پیش نظر رکھ کر اقم الحروف نے تصدیق کیا ہو کہ سلطنت اودھ کی تاریخ کا وہ دھبہ حصہ ناظرین کے سامنے پیش کیا جائے جس سے باشندگان اودھ کے عام اخلاقی اور تمدنی عروج و زوال کے اسباب و علل کے دریافت کر نیکے واسطے کافی ذخیرہ معلومات حاصل ہو جائے۔ چنانچہ جس کتاب کے ذریعہ سے سلطنت اودھ کی ابتدائی تاریخ۔ اسکی ترقی و تزل کے اسباب کا ایک جمل خاکہ کھینچا گیا ہو اور اس میں یہ کہ وہ ہر طرح سے مطبوع و دھبہ ثابت ہوگا۔

مجلہ نہایت افسوس کے ساتھ یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اودھ کی تاریخ ایسی تاریکی میں بڑی ہوئی ہو کہ زمانہ حال کے اصول روایت و روایت کے بوجب اگر تنقید کیا جائے تو نا کامی کے ساتھ کسی بھی تاریخ

منصوبہ ہی سے ہاتھ اٹھا مصلحت معلوم ہو۔ ایسوجہ سے میں نے اکثر مقامات پر پچھلے مورخین کے نقش قدم پر چلنے ہی کو محض نظر سمجھ کر محض نقل حکایت کر دی ہو۔

بیشک لکھنؤ میں ابھی اُس نسل کے باقیات صالحات موجود ہیں جسکی نہایت نامکمل سرگزشت اب صرف تاریخ کی جلد و نہیں مل سکتی ہو لیکن یہ فرسودہ حال بوڑھے اب اتنے ہی کے واسطے رہ گئے ہیں کہ مجمع یاران نے کلفت میں ٹھیس تو پرانی داستانیں بیان کر کے دلوں کو گرمائیں پچھلی صحبت کو یاد کر کے روئیں گے۔ لکھنؤ میں تو ٹھنڈی سانسیں ہیں اور اپنی گزشتہ غفلت و شوکت کے تصور ہی سے جی ہلایں۔ اور اگر زمانہ حال کے تعلیم یافتہ لوگوں میں جا پڑیں تو انکی بدقسمتی کی نہایت عجب صورت پیش کر کے انکے دلوں میں یہ حسرت پیدا کر لیں کہ وہ ہاں ہم اُس زمانہ میں کیوں نہوئے؟ انہیں سے بہتر سے ایسے بھی نکلیں گے جنکی آنکھوں کے سامنے ہر وقت وہی اگلے جاد و ہلال کے مرقع رہتے ہیں۔ وہ اسیکی یاد میں اتنے محو ہیں کہ انھیں خبر بھی نہیں کہ زمانہ اتنی دور آگے ٹھیک ہوا ہے انکے کانوں میں اب تک وہی تیغ و تفنگ کی جھجکاں سنائی دیتی ہیں اور جب کبھی بتیہ جاتے ہیں تو انہیں اپنے قوت بازو کے کا زمانے سینہ و شان کے زخموں کی شہادت کے ساتھ سنانے دکھانے سے فرصت بھی کیا ملتی کہ دینا ہے اب کتنی ترقی کی ہو ظاہر ہو کہ ایسے لوگوں سے کسی قسم کے تاریخی مواد مصالحو کی جمع کرنے کی کوشش کتنے دیر کا ہو۔ انکے دماغوں میں خیالات کا نظم بگڑا ہوا ہو۔ وہ سلسلے کے ساتھ واقعات بیان کر سکتے ہیں۔ انہیں حرج کر کے اس بات کا پتا لگ سکتا ہو کہ کچھ وہ بیان کرتے ہیں یہ کیا ہے؟ چشم دید اور کتنا سنا ہوا درج سنا ہوا ہو وہ کس حد تک معتبر راویوں سے سنا ہو اور کتنی بزاری کی شب آئیں شامل ہو گئی ہو۔ انھیں وجہ سے راقم الحروف کو اکثر مقامات پر انگریزی مورخین کے اجتہاد پر تمسک کرنا پڑا اور یورپین سیاحوں کے بیانات کو سچ ماننا پڑا اور انھیں وجہ سے نصیر الدین حیدر کے عہد حکومت کی مفصل حالت آنکے ایک یورپین مصاحب کی لکھی ہوئی کتاب کا ترجمہ کر کے ناظرین کے سامنے پیش کرنا پڑی ہو۔ اگر حیات مستعار باقی ہو تو انشا راحمد آگے چلے اس کتاب کے دوسرے حصہ میں نصیر الدین حیدر کے بعد کے بادشاہوں کی کیفیت و متراع سلطنت اور برطانیہ اعظم کے انتظامات بھی پیشکش ناظرین کے جائیں گے۔

آخر میں مجھے اپنے عم معظم جناب منشی محمد حسن علی صاحب کیل سے اپنی سید شکوری و امتنان ظاہر کرنا ضروری معلوم ہوتی ہو چکی وجہ سے مجھے اس کتاب کی تالیف میں بہت بڑی مدد ملی ہو فقط محمد احمد علی بی لے لکھنؤ۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

## مقتد الکتاب

یہ وہ قصہ نہیں کچھ جھوٹی سچی باتیں ہوں  
بیاں پُر درد ہو گزری ہوئی اگلی کہانی ہے

تمہید المضامین

لکھنؤ میں مسلمانوں کی بادشاہت ایک خیال تھا کہ دماغ میں آیا اور نکل گیا۔ ایک خواب تھا کہ پوری طرح دیکھنے بھی نہ پائے تھے جو انکے کھل گئی اور تعبیر پوچھتے پوچھتے بھول بھی گیا۔ نہیں نہیں ایک طلسم تھا۔ دم کے دم میں بنا اور ایسا بنا کہ جکا ہر کارخانہ سامری کے جادو پر چمکنے لگا تھا اور پھر شہزادوں میں بٹا اور ایسا بنا کہ کہیں نام و نشان تک باقی نہ رہا۔ خدا جانے وہ کون لوگ تھے۔ کیا ساز و سامان رکھتے تھے جنہوں نے یہ طلسم بنایا تھا۔ ابھی بادشاہت کو مٹے آدمی صدی بھی پوری نہیں ہوئی۔ ہمسرے آدمی اب تک زندہ ہیں جو اپنے چشم دید حالات بیان کرتے اور ”ستم از بادہ شبانہ ہنوز“ کی صدا سننا شروع کرتے رہے ہیں۔ تاریخ کی کتابیں بھی کچھ نہ کچھ موجود ہیں جنہیں ”ذکر جوانی در پیری“ یاد دلائی والے واقعات تھوڑے بہت قلمبند ہیں۔ لیکن زمانے کا رنگ ایسی جلد پٹنا ہو کہ زبانی روایتیں حکایتیں سنہنتے ہیں تو کوہ قاف اور راہ اندر کے اکھاڑے کا سماں نظر دیکھنے پر چھ جاتا ہے اور تاغیبن پڑتے ہیں تو انیس امیر حمزہ صاحب قرآن کی داستان اور افراسیاب جادو کی نیرنگ سازی کا مزہ اٹھاتا ہے۔ عقل حیران ہوتی ہے کہ اتنی جلد یہ کیا پلٹ کیسے ہوئی اور زمین و آسمان کیوں مگر بدل گئے۔ دل قبول ہی نہیں کرتا کہ ابھی جاوید جلیس ہنیت الیس برس آدھرا سی لکھنؤ میں مسلمانوں کی یہی نکتہ قوم برسر اقتدار و حکومت تھی اور کھلی گلی کھین برتا تھا۔ اُس زمانے کے فرسودہ حال بڑے بوڑھوں سے پوچھتے ہیں تو وہ آہ سرد بھر کے بس اسناد دیتے ہیں کہ ”اریکیاں وہ گلی کوچے ہی نہیں رہے۔ وہ چلنے پھرنے والے ہی اٹھ گئے زمانے نے نئی سیاط بچھائی ہے“ اُسے اسیر مرحوم کیا خوب فرما گئے ہیں۔

بڑھکئی کھدنے سے زیادہ اور شان لکھنؤ  
لامکان ہوا انہوں ہر اک مکان لکھنؤ

کہتے ہیں جس طرح انسانوں اور حیوانوں کی زندگی کے کئی دورے ہوتے ہیں۔ بچپن۔ شباب۔ جوانی۔ کھوت۔ شیخوخت۔ اسی طرح ملکوں سیاستوں۔ اور قوموں کی بھی عمر ہو اکرئی ہر اور اسیں بھی ایسے ہی دورے ہوتے ہیں لکھنؤ کی بادشاہت کی بھی ایک عمر ہوئی پہلے بچپن ہوا۔ پھر شباب آیا۔ اور شباب کے آتے ہی جوانی۔ کھوت۔ شیخوخت۔ اور موت سب کا پیش خمیہ آیا۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے  
سنبھالے ہوش تو مرنے لگا حسینوں پر  
اُسے تو موت ہی آئی شباب کے بد سے

کیا ہوا۔ اکثر دیکھا گیا اگر انسان بڑھ فوجانی اور غفوان شباب کی مشورہ میں ایسی بے اعتدالیاں کر کرتا ہے کہ اُسے کھوت سے طبیعت کو اک روگ لگ جاتا ہو۔ پھر جب تک قدرت کی مدد برہن کا زور چلتا ہو، ہر ہشاش بشاش۔ توانا و تندرست رہتا ہو۔ اور کھوت نے صورت دکھائی اُدھر دبی ہوئی آگ بھڑک اٹھی اور ضحکہ زندہ شروع ہو گیا۔ پڑوائی بوجاہلی اور پڑائی پوٹ اُپھرائی۔ زخم پھوٹے ہو گئے۔ ناسور پھرنیکے لگا۔ بعینہ ہی حال لکھنؤ کی بادشاہت کا ہوا۔ جو زمانہ غفوان شباب کا تھا۔ جب دل سے دیدے تک ہمارا آئی ہوئی تھی ہر طرح کا اطمینان تھا۔ رفیق راہزن کا کھنکھہ تھا اور انکا موقع تھا کہ ہمت اور اولوالعزمی اپنے جوہر دکھاتی۔ عروس سلطنت کا بناؤ نگار کیا جاتا۔ اُس وقت بے اعتدالیاں بڑھیں۔ نچو دی اور سیستی نے اپنا رنگ بنایا۔ عیش و مجلس کے چہرے زیادہ ہوئے۔ محبت کا رنگ بڑا۔ اصحاب دانش و بنیش کنارہ کش۔ ارباب نشاط مجراؤں میں داخل ہوئے۔ شمع سیات نے جس پیرنی کا انتظار بھی نہ کیا۔ سرشام ہی سے چھٹانے لگی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ

روح غالب میں جو آئی تو قفس ما بھی آئی  
شمع کے ساتھ ہی نفل میں ہوا بھی آئی

اگرچہ مسلمانوں کی قوم کی ترقی و تہذیب کی داستان ہر حصہ و بنیاد میں سراپا حیرت و سرما عبرت ہے لیکن ہندوستان کی اسلامی شناسی اور اُس کے تمام شعبے تو زیر نگین زمانہ کے عجائب نوئے تھے۔ دہلی۔ آگرہ۔ لکھنؤ۔ اور اسی قسم کے دوسرے شہروں میں ذرا جا کے کوئی پُرانے آثار و نشانات دیکھ کر توت خود معلوم ہو جائیگا کہ یہ تباہی زدہ قوم اپنے دقوں میں کیا کچھ طلبیات باندھ چکی ہے۔  
اور اللہ۔ یہ وہی مسلمان تھے جو سو کھی کچھریں اور جو کے سٹو کھا کھا کے عرب کے جلتے پھٹنے لگے تھے

سے کشورتانی اور ہفت اقلیم کی فرما زواری کے پرچم میں آتے چلے گئے تھے انھیں کو بھائی بندوں نے  
 ”ز شیر شتر خوردن و سوسمار پد عرب را بجائے سیدہ ست کار  
 کہ تخت کس را آئند آرزو“

کا طعنہ دیا تھا۔ خدا کی قدرت سے انہیں خاک نشینوں کو اس مرتبہ پر پہونچایا کہ ایک طرف تو تخت کیانی  
 اور فرش کا دیانی پر قبضہ کیا اور دوسری طرف انھیں طعنہ دینے والوں کو دھکے ایسے پڑھا دیئے کہ سبکی  
 برکت سے نیشاپور سے غریب الوطن اور تارک التیاد ہو گئے نکلے تو اودھ میں وہ لطف اٹھائے کہ  
 جشن جمشیدی کا فرما بھول گئے۔

دعوتیں بھولے مرقندی و شیرازی تمام  
 اسقدر البان نعمت کے لگائے آئے خوان

نام مورخین متفق ہیں کہ اودھ کے فرما زواری میں آئے تھے۔ اور اگرچہ اس عمارت کا بنیادی پتھر  
 رکھنے والا ایک خبیث اظرفین سید تھا جو خانہ دامادی کا طعنہ سنے اور دل و جگر برتیج زبان کا زخم کھا  
 کے وطن اور عزیزان وطن سے منہ موڑنے اور ہندوستان کی طرف رخ کرنے پر مجبور ہو گیا تھا لیکن  
 اسکا جائنشین (جسے خانہ دامادی ہی کی بدولت یہ عروج حاصل ہوا) شاہ بدایع کی اولاد تھا اور اسی کی  
 آل اولاد پہلے نواب وزیر اور پھر بادشاہ بنے سو سو سو برس تک اس ملک کی دھماکی تین کروڑ رعایا  
 کی قسمتوں کا فیصلہ کیا کی۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ با اقبال غریب الوطن طالع ہمایوں لیکے دنیا میں آیا تھا کہ جس وقت زمانہ  
 کی مہر ہی نے اُسے خاندان خراب کیا اس وقت ہندوستان کی اسلامی شہنشاہی کا شیرازہ جمیٹ شکست  
 ہو رہا تھا۔ ظاہر بنی الجہد درست تھا مگر ”درخت اقبال کی جڑ کو دھک لگ چکی تھی“ وہ پہونچا اور  
 ایسے سو ف سے پہونچا کہ دست و بازو کے زور و قوت اور دل و دماغ کے فطرتی جوہر دکھانے کے  
 واسطے اُسے میدان ممان ملا۔ پھر تائید بھی اور شہیت ازروی نے وہ رنگ دکھائے کہ اگرچہ چشم  
 بینا ہو تو اُس سے بہت کچھ سبق پڑھ لے۔

اگرچہ زمانے کے ظالم کا تھنے بادشاہ اور بادشاہت سب کا فاتحہ کر دیا ہے۔ اور ”ایک  
 انسان سب سے کئی کے سوا کچھ رو نہیں گیا ہو۔ لیکن وہ لوں کے گمراہنے کیواسطے بہت تیز و زور داغ لگے  
 ”سرگزشت بلا کشاں“ بھی کچھ نہ نہیں۔ اور اسی لیے راقم الحروف نے قصہ کیا ہو کہ نہ مختصر طریقے سے  
 کی پیشہ ہیں۔ اُنھان اور لعلہاتی جوانی کی داستان حوالہ قلم کروں۔ شاید کسی دن نا صبور کو اُس کے



دیکھنے سے عالم کی بے ثباتی اور شادی و غم دنیا کی ناپائیداری کا حق یقین ہو جائے اور وہ اس سخاوت  
 کشمکش میں اور اتر جائے جس میں ہم سب آئے دن مبتلا رہتے ہیں۔ کیونکہ  
 زورِ نوح و راحتِ گیتی مرغانِ نل شوخ و م  
 کہ آئینِ جہاں گاہے جہاں گاہے نہیں باشد

(۲) سلطنت کی ابتدا اور بنیاد

ماجرے فوجانی عہد سیری میں نوجوہ رنج ہوتا جواب اس قصے کو دوسرا ہے  
گزشتہ صدی کا ابتدائی زمانہ تھا۔ اسلئے گردش ایام گرفتار میں بجلی کی سرعت دکھا رہی تھی۔  
بالائی ہند میں قیمت آزما کی گرنیوالے جاننا زجواب آسا عالم فانی کی سطح پر سر اُٹھاتے اور تلامذہ مولاج  
سے ساحل فنا کی ٹکریں کھا رہے تھے۔ خدا جانے کتنوں نے سر اُٹھا رکھا اور رہ گئے۔ سیکڑوں غنچے  
کھلنے بھی بنائے کہ مر جھا گئے۔ چنڈا ایسے بھی نکلے جنھیں یاد رہی بخت و ساز گاری اقبال کی نسیم نے  
اپنے جھونکوں سے شگفتہ کیا۔ دنیا کی بہار دکھی دکھائی۔

انہیں بخت آ رہا جانا دینیں سید محمد امین نامے ایک مرد سیدان تھے جنہوں نے اودھ کے خاندان شاہی کی بنیاد ڈالی۔ یہ حضرت امام موسیٰ کاظم کی اولاد اور صحیح نسب سید تھے۔ ان کے باپ

۱۷۔ اس تاریخی مضمون کے کچھ دقت کتب مندرجہ ذیل میں نظر رہی تھیں۔ انہیں کو اسکا اخذ سمجھنا چاہیے۔

- ۱۔ فیہر التواریخ مصنف سید کمال حیدر۔
- ۲۔ حربہ خسروی مصنف جناب فیض غفلت علی صاحب کاکاوردی۔
- ۳۔ تاریخ اودھ المسمیۃ "مکملز اہندہ" مصنف مسٹر اردن صاحب بزبان انگریزی۔
- ۴۔ کلکتہ دیوی جلد سوم۔ مضمون تاریخی بابت اودھ۔ مرقومہ سرسہنی لائسنس صاحب۔
- ۵۔ تقیض الفائقین بزبان انگریزی۔ ترجمہ مسٹر ہادی صاحب۔
- ۶۔ تاریخ در العر مصنف جناب فشی لول کشو۔
- ۷۔ رہنمائے سیاحان کشو۔ مصنف مسٹر لٹن صاحب۔
- ۸۔ مسلمانان ہند سکھ رام دھرمات مصنف مسٹر میر حسن علی۔
- ۹۔ سیر و جات مسر سندی صاحب۔
- ۱۰۔ بعض رسائل متعلق معاملات اودھ جو دواؤنشا اٹھانان میں شائع ہوئے تھے۔

میر محمد نصیر عرصہ ہوا نیشاپور سے ترک وطن کر کے ہندوستان آچکے تھے اور بہادشاہ غلط فہمی اور ننگے پب عالمگیر کی ملازمت میں تھے۔ وہ زمانہ وہ تھا کہ ہندوستان میں غلیب سلطنت کی زور پزیری ہو گئی تھی اور داستانیں سن سن کے اسلامی دنیا کے ہر گوشے سے پریشان حال اور بد روزگار مسلمان اور عہری کا رخ کرتے اور "یا قنوت یا نصیب" کی صدا دیتے اسی ملک میں وارد ہوا اور جلا گرتے تھے میر محمد نصیر صاحب بھی عسرت اور فحاکت سے حیران پریشان ہوئے گھر سے چلے تو بڑے بیٹے میر محمد باقر کو لے کے ہندوستان میں داخل ہو گئے۔

چھوٹے صاحبزادے میر محمد امین خانہ دامادی کے عیش و تنم کو چھوڑ کے آنا مناسب نہ سمجھے لیکن بعد چند سے باپ کی برکت کی بخت کا در شب بیٹے کو بھی ملا۔ طمانیت خاطر کے پھول سونگتے سونگتے وطن و تہن کا کاٹا چھایا عیش منعم ہوا۔ سامان راحت موجب حد زحمت ہوا۔ لذات نفسانی پر الام روحانی فریادوں کا مارا۔ قلعہ محصور بھرے پر گھر کو چھوڑ کے غریب وطن پر پھر کا پناہ دیا۔ ہندوستان کی راہ تو کھلی ہوئی تھی۔ باپ کے نقش قدم پر چل کے یہ بھی اسی ملک میں وارد ہو گئے۔ لیکن ہنوز منزل تک نہ پہنچے تھے راستے ہی میں تھے کہ باپ کے مرنے کی خبر ملی۔ اتہم بالاسلم" سمجھ کے راضی برضا ہو گئے اور تقدیر الہی پرست کر ہو کے ہمت نہ ہائے۔ کچھ دن مختلف مقامات میں بسر کر کے آخر کار شاہجہاں آباد پہنچ گئے یہاں اگرچہ شہنشاہی کے کارخانے درہم دبرہم ہو چلے تھے پھر بھی ایسے ذی جوہر سپاہی ہنش شرفا کے واسطے معیشت کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ یہ بھی پہنچے تو بعض امراء و دربار کی قدر شناسی سے بیسرو سامان نہ رہے۔ چند ہی روز میں حیثیت آبرو سے درست ہو گئے۔ گرد و باغ ہفت ہزاری لائے تھے۔ زیادہ دونوں تک کسی سے صحبت برار نہ ہو سکی۔ بالآخر دربار میں رسائی ہو گئی۔ اب فرخ سیر کا بعد تھا جو ہر شناس بادشاہ نے "بالاے سرش ز ہوشمندی بہ قیافت ستارہ لبندی" پر نظر کر کے واضح و کرم سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ خلعت سر فرازی عطا فرمایا۔ اور پہلے باڈی گارڈ کا کمانڈر مقرر کر کے حلقہ گونشی کی دستاویز پر تقریب انحصار کی مہر کی۔ پھر بعد چند سے آگرے کا صوبہ دار کر دیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ سادہ آبا رہہ و دار کے ایک سلطنت و شہنشاہی کے مالک۔ بلکہ بادشاہ کے جسم و جان کے مالک ہو رہے تھے سید عبداللہ اور سید حسین علی دونوں بھائیوں کا طوطی بول رہا تھا۔ ان کی تربیتوں۔ سر بلند یوں پر عزم و اقبال بھی شک نہ تھے۔ لیکن انجام بینی کی آنکھیں اندھی ہو چکی تھیں۔ محسن کشی اور ناپاس عزرائی جلا دی پر ہر وقت کمر بستہ رفاقت میں تھیں۔ جنھیں یار و فدا اور بھلے تھے وہی ظالم و غدار بن گئے۔ ان کی سبکی بٹکے رکھا تھا وہی نور نگاہ کے دشمن بنے۔ جیہر جان جانی تھی انھوں نے سچ؟

وہ سیر کی جہان

لگی اور محو شہ سے سلطنت پائی۔ شاہانہ راحت طلبی کے رویہ پر پیش و عشرت کا سکہ چا۔ دن عبید  
رات شب برات کا سامان نظر آیا۔ راکھ بگ سرور انبساط کے تقارفا۔ ہمیں سادت یتابی  
اور فرزندوں کی مصلحت کی سٹائی دی۔ کہا انکی سلطنت۔ کہا انکی حکومت۔ کہا انکی  
واماغ نہ تھا خندہ ہا۔ بجا کا۔ بالآخر ”کردنی خویش زدن پیں“ کا ماجرا زیر نگاہ ہوا۔ سادات  
بارہہ کا اقبال ٹھٹھا۔ زوال بلکہ استیصال ہوا۔ پستینی نمک خواروں اور قدیمی جاں نثاروں نے  
سازش کر کے دونوں کو زیر کیا۔ ایک ایک کر کے موت کے گھاٹ اتارا۔ کہتے ہیں اس سازش  
میں میر محمد امین نے بہت جوہر دکھائے۔ خوب حق نمک ادا کیا۔ اور اسکا حکم یہ ملا کہ سعادتیخان  
برہان الملک کا خطاب پایا۔

اگرچہ سادات بادشاہ کے استیصال سے عیش پسند بادشاہ کو بہت کچھ آزادی و فانیغ اہالی  
نصیب ہو گئی لیکن ملک بھر میں جو طوائف اللہ کو برا بھلا سمجھتا تھا وہاں نہ ہوا۔ انھم و فانیغ کی باگیں  
وہیلی ہو چکی تھیں اور بد لگام مٹہ زور جانوروں کی روک تھام آسان نہ رہی تھی۔ آئے دن ایک  
نہ ایک طرف سے تردد انگیز خبریں اور وحشت خیز اظہاریں دربار میں پہنچتیں اور راحت میں خلل  
ڈالتیں۔ اتری بیے امنی کے چرچے عیش منقص کرتے۔ عین اسی زمانہ میں صوبہ اودھ کے تھانہ  
لکھنؤ کی شور و شبی و سرنگی کی خبریں پیالے پہنچنے لگیں۔ اور ان گرام گرم رپورٹوں کو سننے سننے  
آخر کار اُسکے تدارک پر توجہ ہوئی اور یہ تجویز ہونے لگی کہ کون مرد میدان وہاں بھیجا جائے۔ جو  
تسلط جھائے۔ اٹھڑی ہوئی حکومت جائے۔ امنی ہوئی بساط پھر بھجائے۔ اتفاق یہ کہ جو حریفان  
غبار اس جانباز سید کی ترقی جاہ و منصب سے ہر وقت خار ورجر گرجتے تھے اُنکے دلوں میں  
یہی سمائی کہ کسی طرح اُسے ”از دیدہ دور و زول دور“ کر کے اپنا کچھ ٹھکانہ آکریں۔ چنانچہ جیہ  
نگال کے سب نے اپنی ہمت اسی پر مصروف کر دی کہ کسی طرح بُر بان الملک ہی کو یہ خدمت  
تفویض ہو جائے۔ جو توڑ لگائے۔ سازشیں کیں اور آخر کار کانٹا سمجھ کے دربار سے نکلا۔  
لیکن خدا کی شیت کون جانتا تھا اور یہ کسے خبر تھی کہ یہی کانٹا کبھی گلدستہ رنگا رنگ کی نمک کشن  
بستی میں پھیلائے گا۔ خرابے میں چین زار اٹھلائے گا اور زمیں شور میں منبستان کی بشار  
دکھائے گا۔ ص ۶

عدو شود سبب خیر گردد خواه

داری ملی۔ اور اودھ کے سرکش و سرمنگ زبنداروں کی قلع

فتح کرنے اور شیخ زادگان لکھنؤ کے جمیع و متقا دنیا بینی ہم پر دلی گہری گراں اس بے سرو سامانی کے ساتھ  
 کہ نہ فوج دی گئی نہ نقد و نہن یا سامان حرب سے کوئی اعانت کی گئی۔ لیکن تقدیر آبی میں تو یہی لکھ جابجا تھا  
 کہ ہم دی سر کر گئے اور اسی ہم سے اُس کے اقبال کا آفتاب نصف النہار پر پونچھا۔ لاکھ مرتبہ میں کوئی پیش  
 کرے کیا ہوتا ہے۔ چنانچہ باوجود اس بے سرو سامانی کے اس مرد میدان نے ہمت نہ ہاری۔ اپنی بی بی ہم  
 منگیہ کے ساتھ اٹھال بیکار دینی ایک فوج بھرتی کی۔ اُمیدوں کا سبز باغ دکھایا۔ انعام و اکرام کے وعدوں  
 سے جی بڑھایا۔ یہ لوگ نہایت ہی کانتوں سے بہتنگ اور معیشت کی فکروں سے جاں بلب تو تھے ہی آتا  
 سما۔ پانے کے اٹھ کھٹے ہوئے۔ اچھی خاصی فوج بھرتی ہو گئی۔ اور فوج بھی کیسی کہ جبکا ایک ایک متفنن  
 بہر وقت مانے مرنے پر کاستہ۔ جان تیلی پر لگے ہوئے۔ پھر اس طرح ساز و سامان حربے ضرب کی  
 فراہمی کا عقدہ بھی ناخن تبر سے کھول دیا۔ اور کوچ بول دیا۔ میان راہ اکبر آباد۔ کینڈا اور فرخ آباد جتنے  
 ہوئے اور ہر مقام کے صوبہ دار سے دعوت و مدارات کے عوض سامان جنگ اور آئین اخلاق و  
 تمام نوازی رسی کے بدلے صلاح و مشورہ مناسب وقت لیتے ہوئے اودھ پہنچے۔ ایک مورخ کا  
 بیان ہے کہ ان سب میں صوبہ دار فرخ آباد نے زیادہ حق دوستی ادا کیا۔ دو بوجہ قربت و ہمسائیگی اودھ  
 کے حالات اور شیخ زادگان لکھنؤ کے تہذیب و جہاد و سلطنت سے واقف تھا اسنے صلاح دی کہوں تحت لفظ  
 بے یاق نہ پٹے جانا۔ پہلے نور افواج کے قصبات میں سکے جانا۔ وہاں کے رئیسوں۔ شریفوں سے زاہد رسم  
 پیدا کرنا۔ انکو اپنے سے ملانا اور ایسا برتاؤ کرنا کہ ضرورت کے وقت وہ تمھاری حمایت کر سکیں۔ کیونکہ یہ لوگ  
 ساتھ دینے پر جلد اٹھ کھڑے ہونگے۔ بات سنے کی تھی۔ دل میں بیٹھ گئی۔ نواب نے اسی پر عمل کیا  
 پہلے قصبہ کاکوری میں داخل ہوئے۔ یہاں کے شیوخ اہل لکھنؤ کے مراسم غلات اور انکی ضرورتوں سے  
 بہتنگ تھے۔ نواب کا آنا اپنا مزید اقبال سمجھے اور شریک صلاح دولت نواب ہوئے۔ سب طرح سے  
 نشیب فراز سے آگاہ کر دیا۔ گھاتیں بنائیں۔ نیک راہیں بچھائیں۔ قصہ مختصر۔ نواب لکھنؤ میں داخل  
 اور بڑی آن بان سے داخل ہوئے۔ نہ مقابلہ ہوا۔ نہ صفت آرائی کی نوبت آئی۔ بعد چندے کچھ  
 زور و شہر اور کچھ دشمن تبر سے تمام صوبے پر تسلط ہو گیا۔ کرشن زیر۔ سر منگ پال مال ہوئے استقامت  
 کی چول نہیں۔ مالی ملکی آئین بندھے۔ بد امنی دور بے امنی کا فور ہوئی۔ اسے نواب کا اقبال سمجھو  
 یا کہ گزراؤں کی سن کا گزراؤں کو کہ وہی صوبہ جسکی نادمند اور سرکش رعایا نے کبھی صوبے کی جمیع  
 سرکاری ستر لاکھ سے بڑھنے ندی پہلے ہی سال بلا جبر و اکراہ ایک کروڑ سات لاکھ وصول ہوا۔ اور آخر فر  
 تو معافیات جاگیرات ملا کے دو کروڑ کے قریب تحصیل ہو گئی۔ نیت بخیر تھی۔ تو کام بھی اچھے بن پڑے۔

اور انجام بھی نیک ہوا۔ اقبال بھی یاد تھا کہ جس معرکہ میں گئے تھے محمد کوٹے۔ جس ہم کو سرلیا سر کے چھوڑا  
 باجی راؤ مرہٹہ کا کاہلی کے مقام پر مقابلہ اسکا شاہ سپہ کہ اُدھر لاکھوں کا دل بادل اُدھر صرف چودہ ہزار  
 سوار اور پھر فتح کا سہرا فواب ہی کے سر رہا۔ مرہٹے پیسا اور ننگتہ دل ہو کے میدان سے نکل بھاگے  
 اسی طرح فواب کے فکر صاحب کا حال اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نادر شاہ کے حملے کو دو کروڑ روپے پر  
 طے کر لیا تھا۔ مگر در اندازوں اپنی بات بالار کھنے واہوں نے رخنہ ڈالا۔ معاملہ بگاڑ دیا۔ نتیجہ ہوا کہ بائیس  
 کروڑ زرخند فوسے لاکھ کے جواہرات اور عزیز برائے شاہجہاں کی جان تحت طاؤس اور اُس کے ساتھ  
 دریائے فور اور کوہ طور دونوں پیرے بھی گئے اور خزانہ ہند چیرا کر گئے۔ طرہ یہ کہ غازیوں نے اُٹنی لنگا  
 بہائی۔ بھولے بجائے بادشاہ کا دل فواب سے آزرہ کر دیا۔ دونوں طرف کدورت نے راہ پائی۔ اُٹنی فاضل  
 رنگ آلود ہو گئے۔ فواب کو اسکی تاب کہاں تھی۔ گھبرا گھبرا کے دعا مانگنے لگے کہ ”اُٹنی عزت و تہذیب کے  
 ساتھ جلد فاتحہ تحریر کیجیو“ آخر دعا سے کچھ گاہی اور نالہ ہائے نیم شبی نے رنگ دکھایا۔ داعی اجل کو لبیک کہی  
 شہید پوری کا چل چلا دینی ذی الحج کی آخری تاریخ میں بھد مسرت دنیا سے عاجز اور اہل دنیا کے  
 ہاتھوں پریشان ہو کے عالم جاودانی کی راہ لی۔

فواب بُرہان الملک کے محاسن اخلاق کے بیان میں سب مورخ رطب اللسان ہیں۔ انگریزی  
 مورخ بھی جانتے ہیں کہ بُرہان الملک نے اودھ میں بہت انتظامات قائم کیے۔ زیر دستوں کو زبردستوں  
 کے آزار سے پناہ دی اور غریب رعایا کو سنگدل زمینداروں کے جور و جہا سے محفوظ رکھا۔ اور وہی  
 پہلا شخص تھا جس نے منصوبہ باندھا کہ اودھ میں ایک مستقل حکومت کسی وسط کے مقام پر قائم کرنا چاہیے  
 اور غالباً ایسا ہی کوئی منصوبہ تھا جسکی وجہ سے اجداد عیا اور لکھنؤ میں انکا زیادہ قیام ہوا کرتا تھا۔ اگرچہ اودھ  
 کی صوبہ داری طے کے بعد بھی دیباہی سازشوں اور پوشیل پیچیدگیوں میں بہت کچھ حصہ لینا پڑتا تھا۔ مگر  
 حتی الامکان فواب نے اپنی تمام تر محنت اپنے صوبہ کی ترقی اور دہاں کی رعایا کی فلاح بہبود پر مصروف  
 رکھی۔ چنانچہ بقدر اس ملک کے لوگ فواب سے مانوس اور اُنکے گردیدہ ہو گئے تھے اتنا کسی سے  
 نہوے۔ فواب نے اپنے مرنے پر خزانہ مال مال چھوڑا۔ جسکے بابت ایک منصف مزاج مورخ کا  
 بیان ہے کہ ”مکن ہے کہ یہ خزانہ رعایا سے بے پروا ہدی کر کے بھرا گیا ہو۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ جو کچھ  
 وصول کیا گیا تھا امیروں و زمینداروں سے وصول کیا گیا تھا۔ غریبوں فاقہ کشوں کے منہ سے  
 تو اچھینا نہیں گیا“ خیر۔

خدا بخشنے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں

نواب برہان الملک نے کوئی اولاد نہ دینا چھوڑی۔ اس لیے اُنکے مرنے پر اودھ کی صوبہ داری کے دعویدار اودھ تو شیرجنگ (بیہتجے) اودھ صفدرجنگ (بھانجے) اور داناؤ (اٹھ کھڑے ہوئے۔ اپنے اسلام کا قانون وراثت اپنے حق کے مزعج ثابت کرنے کو پیش کیا۔ دوسرے نے برہان الملک کے برتاؤ اور اپنی سابقہ جہاں نشاریوں کو وسیلہ گردانا۔ دونوں طرف سے سازشیں ہونے لگیں۔ حتیٰ کہ شیرجنگ نے نادر شاہ کا دامن تھاما۔ لیکن صفدرجنگ کی پیشانی پر کاتب تقدیر نے اقبال ہی اقبال لکھ دیا تھا۔ اُن کی بات بالآخر بھی اور اُسکے دعوے کے سامنے کسی کی کچھ نہ چلی۔

نواب برہان الملک کے عہد حکومت میں اس صوبہ کے حدود یہ تھے۔ جنوباً نادر شاہ کے گنگ اور شمالاً دریائے راجپتی۔ شرقاً عظیم آباد و غرباً شاہ آباد۔ کل رقبہ ۲۳۹۲۳ میل۔

### (۳) عہد حکومت ابوالمنصور خاں صفدرجنگ

اصلی نام مرزا محمد مقیم تھا۔ برہان الملک کے بھانجے اور جعفر خاں بیگ کے بیٹے قومہ زونگ سے تھے۔ چھ مہینے کے تھے کہ ماں کا سایہ عاطفت سر سے اٹھ گیا۔ بے سر و سامانی یہ تھی کہ خالہ نے اپنا دودھ پلا کے پالا۔ بھلا اُس وقت نیشاپور میں کسی یہ تصور ہو سکتا تھا کہ یہ بچہ ایسے فرخندہ طالع یکو آیا ہی کہ کسی زمانہ میں امیر تیمور اور بابر کی اولاد کی دستگیری کر لگے۔ اور اُس کی نسل مملکت ہندوستان کی پولیٹیکل شطرنج میں اُس کے کی چابیں کھیلے گی لیکن جو وقت گلشن ہستی میں یہ شگوفہ کھلا تھا اُس وقت قضا و قدر کے ٹکٹے سے یہ حکم حکم جاری ہو چکا تھا کہ اس کے زائچے میں ماموں کے زائچے سے زیادہ سائے اکٹھا کر نیلے جائیں۔ وزارت اور بادشاہت سب کچھ لکھ دیا جائے۔

ابتدائی حصہ زندگی جیسی کچھ افسردگی اور پریشانی خاطر ہی سے گزرا ہوگا اُس کا پوچھنا کیا ہے۔ نانا اور ماموں فکر معیشت سے تنگ ہو کے آوارہ وطن ہوئے۔ خالہ کے دودھ نے جان بچائی۔ دانی تک میر نہ تھی۔ لیکن اودھ بچے کے دماغ میں باغ و جاتی کی بو پونچھ گئی۔ اودھ ہندوستان سے ماموں کی شیم اقبال کی ہلک گھر بھر کو خوش دماغ بنانے لگی۔ برہان الملک کے اقبال و دولت کی جوانی بھانجے کے شباب سے معاصر ہوئی۔ برہان الملک نے بہن اور بھائی کو ہندوستانی بلایہ بجا اور اپنی بیٹی۔ صدر جہاں بیگم سے شادی کر کے عروس سلطنت سے وابستہ کر دیا بلکہ یہ کہنا چاہیے خانہ داماد سلطنت بنا دیا۔ پھر دربار میں تقریب کر کے خطاب بھی دلوا دیا۔ اور کچھ قد میں بھی سپرد کردا دیں۔ جس طرح نواب برہان الملک کے وقت میں نادر شاہ کا واقعہ پیش آیا تھا اُسی طرح صفدرجنگ کے وقت میں

احمد شاہ ابدانی کا ہنگامہ درپیش ہوا۔ برہان الملک کا ستارہ اقبال اسوقت جھلکانے لگا تھا اسوجہ سے اُنکے ہاتھوں میں سر نہ ہو سکی۔ برغلاف اسکے صفدر جنگ کا دریا سے اقبال زوروں پر تھا جب یہ ہنگامہ اٹھا کر چہرہ حاسدوں بدھنیشوں نے بہتیز چاہا کہ یہ اس معاملے سے الگ تھلک رہیں مگر

چراغے را کہ ایزد بر سر و زرد کسے کو پت زندریشش بند ز و

غذا کی مشیت تو یہ تھی کہ اس موقع کے میں صفدر جنگ کی سرفروشی اور جان نثاری کے جوہر آنکارا ہوں اقبال منہ دکھائے۔ جاہ و شہم زیادہ ہو۔ چنانچہ شاہزادہ احمد شاہ کی رفاقت میں یہ بھی میدان جنگ میں تھے۔ اور اپنی دلیری و جانبازی سے شاہزادے کا دل اپنے ہاتھ میں لے لے رہے تھے۔ موزین کا بیان ہے کہ نواب نے فقط اپنی قوم منلیہ سے بڑی جو انردی سے معرکہ آرائی کی اور ابدانی کو شکست دی۔ اسی لڑائی میں نواب کی بائیں آنکھ میں تیر لگا۔ ۳ آنکھ جاتی رہی اور حدۃ چشم میں بلوری آنکھ بکھنے لگی۔ پھر۔ بدفتح و فیروزی شاداں و فرماں دہلی آ رہے تھے کہ پانی پت کے مقام پر رنگیلے بادشاہ کے مرے کی خبر سنی۔ اور صبح گجر دم شاہزادے کے حضور میں حاضر ہوئے تحت و تاج کی مبارکباد دی۔ کہتے ہیں اسوقت ہرج دلاؤ بائیں کی تیلیوں کا تاج بنا کے اُس میں جواہر لگائے۔ سوتیوں کی جھار لگائی۔ اور اپنے ہاتھ سے شاہزادے کے سر پر رکھا۔ مبارک سلامت کا غل بچایا۔ شاہزادے کے منہ سے مسرت کے جوش میں بے اختیار نکل گیا کہ ”ہمیں یہ سلطنت تھیں اسکی وزارت مبارک“ نواب نے نذر کھائی۔ آداب شکر یہ بجالائے اور جلد جلد سفر کر کے شاہجہاں آباد داخل ہو گئے۔ تقدیر کے کارخانے دیکھو تو شاہ کے معرکہ میں دربار کے بڑے مقرب اور سرکار کے بڑے جے جاں نثار خدا جل ہو چکے تھے۔ صفدر جنگ کے واسطے میدان غلی تھا۔ دہلی پہنچتے ہی پہلے میر آتش میرینہ افسر و پچان کا عہدہ اور بعد چنے کے عہدہ میں وزیر الملک کا انتخاب اور اس عظیم الشان شاہنشاہی کا قہر دان وزارت لگایا۔ ماموں نے جس بات کی تمناں جان دی۔ بہت کچھ پاڑ بیٹے۔ اور نہ ملی۔ بھانجے کو بے کشش و کوشش باتوں باتوں میں مل گئی۔ اب وہ صوبہ داوری کا لقب اڑ گیا اور اُسکی جگہ نواب وزیر اودھ لکھا جانے لگا۔

صفدر جنگ کا زمانہ اودھ کے واسطے سکون و اطمینان کا زمانہ نہ رہا۔ دربار کے کاروبار سے حملت بہت ہی کم ملی۔ کہ اس طرف توجہ کی جاتی۔ حتیٰ کہ ایک بار چند روز کے واسطے اودھ پر احمد خاں بخش نواب فرخ آباد اور اُنکے ساتھی پٹھانوں کا غلہ غلہ ہو گیا۔ اور جب صفدر جنگ کو اسکی اطلاع ہوئی تو وہ سوچ مل ہاٹ (سرور بھرت پور) کو ساتھ لے کے دہلی سے چلے۔ لیکن احمد خاں نے جیت تلیل ہی نہ ہوتی دی۔ صفدر جنگ کو ناشاد و نامراد بلٹا۔ اور صوبے کو پٹھانوں کے ہاتھ میں چھوڑ دینا پڑا۔ لیکن اودھ تو

پٹھانوں میں باخود ہا اتفاقات شروع ہو گئے۔ جوتوں میں دال بیٹے لگی۔ اور صفدر جنگ نے لہار واد کو  
بسر کر دی اسی ہزار مرہٹہ کے ایک کروڑ کا وعدہ دیکر ساتھ لیا اور اُس کے بل پر لینا کر دی۔ اس جمیت کشیک کے  
کی تاب طاقت پٹھانوں کو کہاں تھی۔ بھاگ نکلتے۔ اور صفدر جنگ کی حکومت کا نقشہ پھرا۔ دلی بساط پر  
جگیا۔ لیکن بعد چندے بعض واقعات ایسے پیش آئے جسے حریفانِ غما کو موقع مل گیا اور انہوں نے  
بادشاہ کو نواب سے برا بھینچ کر دیا۔ ایک نواب سرائے کے تل کی شرکت کا جرم قائم کر کے اسے مستانِ احمدیت  
رکن برکین سلطنت کو نظروں سے گزانا چاہا۔ اسوقت اگر اتلی ہی عتقیں درست ہوتیں کہ قائل و مقبول کی  
جانوں کی قدر شناسی کیجاتی تو سلطنت ہی کیوں جاتی۔ اندھا دھند کا رخا نہ تھا جسے جو چاہا لگائی بھگائی کر دی  
اور جس جانِ نثار "یار و وفادار" کو چاہا نظروں سے گرا دیا۔ جب صفدر جنگ نے دربار کا رنگ بدلا دیکھا۔  
بادشاہ کی آنکھ پھری پانی آشفٹہ و گریہ ہو کے لپٹے صوبے کی راہ لی۔ اور آخر عمر کے ۱۵۔ برس فیض آباد  
میں بسر کیے۔ اب وہ زمانہ آگیا تھا کہ ہر طرف صوبہ دار تروا اور سرکشی پر آمادہ ہو رہے تھے۔ ہر فرعون بے  
سامان انا ولا غیر کی کافرہ بلند کر رہا تھا۔ مرہٹے۔ جاٹ اور سکھ انا نیت سے مست ہو کے اسطرح قوروش  
کر رہے تھے جیسے جسمِ بیار میں پھوڑے پھنسی۔ امن و امان کے دشمنوں نے بیچارے بادشاہ کی زندگی  
تلخ کر دی۔ اور آخر کار جب کھرے کھوٹے کا حال کھل گیا۔ مرغانِ دست پر در کی بھیری و طوطا پشیمی کے جوہر  
آتشکار ہو گئے۔ تب بادشاہ نے صفدر جنگ کو یاد کیا کہ "جلد فوج قاہرہ دیکھ کے حاضر ہو"۔ کونک بجواہوں نے  
جاں لب کر رکھا ہے۔ لیکن صفدر جنگ کا پیمانہ عمر بزر ہو چکا تھا۔ جان نثاری نے کئی بار انگسٹیا کر چنا چنا ہے  
مگر مرض الموت نے ہر مرتبہ قدم پکڑ لیے کہ "ابھی کہاں چلے۔ چار کے کاڑھوں پر چلنا۔ چنانچہ ۱۷۵۷ء  
اکتوبر کا مہینہ تھا کہ اسی غار نے میں انتقال کیا جو ماہوں سے صوبہ داری کے ساتھ وراثت ملا تھا۔  
ادوم میں صفدر جنگ کی یادگار۔ فیض آباد ہے۔ اسکی بنیاد توبرہ ان الملک ہی ڈال گئے تھے۔  
لیکن اسکی ماری آبادی صفدر جنگ کے دم قدم سے ہوئی۔ لکھنؤ میں بھی موتی کا بڑا نابل صفدر جنگ ہی نے  
بنو انا شروع کر دیا تھا تا تمام رہا۔ آصف الدولہ کے ہاتھوں انجام کو پہنچا۔

### (۴) فتوح الدولہ بہادر

انکا اصلی نام جلال الدین محمد مرزا۔ اور پورا خطاب فتوح الدولہ بہادر ابو المنصور خاں اسر جنگ  
فدوی احمد شاہ بادشاہ تھا۔ صفدر جنگ کے بیٹے اور برہان الملک کے نواسے تھے۔ ۱۷۷۲ء میں  
پیدا ہوئے۔ تاریخ ولادت ہوئی ہے



دو وقتانہ نواب منصور برآمد آفتاب از مطلع نور  
ابتدائی عمر شہزادگی کی شان سے لبرکی۔ ۶۶۰ھ میں مطابق ۱۲۶۲ء بانیں برس کے سن  
شباب میں سندھین وزارت ہوئے۔ کچھ آئنگ جوائی کی کچھ حکومت کا نشہ۔ طبیعت میں مے دو آتش  
کا زور تھا۔ امپیر غلیہ سلطنت کے روز افزوں تنزل اور تباہی کو دیکھ کر یہ بھی سوچے کہ بتے دریاں ہاتھ دھو  
دینا چاہیے کسور کشائی کا جو صلہ پیدا ہوا۔ ہمت عالی اور غریمت بلند نے بخلا بیٹھنے نہ دیا۔ اتفاق یہ کہ  
اس زمانہ میں عالمگیر ثانی تخت دہلی پر جلوہ فرما تھے۔ اور غازی الدین وزیر کے ظلم و ستم سے ملک ہو کے  
شہزادہ علی گوہر ولید سلطنت اپنی جان چھپاتے پھرتے تھے۔ ۶۶۰ھ میں شجاع الدولہ سے ملاقات  
ہو گئی۔ انھوں نے شہزادے کی دلجوئی کی۔ تسلی دی۔ مجد قلی خان سے ساز کیا اور دولون نے اس کے  
شہزادے کی رفاقت میں بنگال پر حملہ کر دیا۔ لیکن یہاں انگریزوں کا سال بھر سے (یعنی فتح پور سے بعد) سے  
عملہ دخل تھا۔ ولید بہادر تو ان انکار میں مصروف و منہمک تھے ادھر بایہ تحت کا یہ حال تھا کہ بیس ہس لاکھ  
مہینے دہلی کو گھیرے ہوئے تھے۔ خلقت دھڑکوں سے جاں لب تھی اور بادشاہ سلامت کے ارکان دولت  
بالکل دست پاچہ ہو رہے تھے۔ آخر کار۔ رخ

مرنے از غیب بروں آید و کائے بکند

کا معاملہ ہوا۔ یعنی احمد شاہ و زانی نے یہ حال دیکھ کے بلیں اور بے بس بادشاہ کی ہمدردی کی اور اپنی فوج  
سے مرہٹوں کا مقابلہ کرنا چاہا۔ چنانچہ پانی پت کے میدان میں ہنگامہ کارزار گرم ہوا۔ شجاع الدولہ کی بھلی  
طبیعت۔ جوائی کے زور۔ رفاقت و ہوا خواہی کے جوش سے بھلا یہ کیونکر ممکن تھا کہ ایسے آسان وقت  
آکھ بچ جائیں۔ یہ بھی اپنے لاؤ لشکر سمیت میدان میں پہنچ گئے۔ اور شجاعت کے جوہر دکھانے لگے۔  
ہنوز یہ فیصلے طے نہیں ہوئے تھے کہ نومبر ۱۲۶۵ء میں عالمگیر ثانی کو وزیر الملک نے شہید کر ڈالا۔ باغیچہ دن  
تک بڑی گڑبڑ مچی رہی تحت سلطنت غالی رہا۔ بالآخر شہزادہ علی گوہر شاہ عالم بننے سریرارے سلطنت  
ہوئے۔ اور شجاع الدولہ کو وزارت کی کرسی ملی۔ شجاع الدولہ کی بلند جو سسلی کے واسطے اب بڑا میدان  
مل گیا۔ نئی بساط بھی۔ نئے نمبرے قائم ہوئے۔ نئی چائیں کھینچی جانے لگیں۔ اتفاق یہ کہ اب شہر فتح  
کھینے والوں میں ایک نیا فرق پیدا ہو گیا تھا۔ یہ انگریز تھے۔ جنھوں نے بنگال کی سرزمین میں اپیل ڈال  
رکھی تھی۔ پلاسی کی دھڑائی میں انگریزی اسلحہ کے جوہر نکلتے تو ایسے کھلے کہ بہیروں کی آنکھوں کو چکا چوندھ  
لگ گئی۔ اس ہنگامے نے ہر خفتہ و بیدار کو خبردار کر دیا اور اب امپیر رفاقت کی کڑی نگاہیں سب طرف  
سے پڑنے لگیں۔ شجاع الدولہ کی نئی نئی آئنگ کے دیکھتے یہ کچھ بعید نہ تھا کہ انھوں نے بھی ابتداء انگریزوں

کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھا۔ وہ خود دل میں ہزاروں منصوبے باندھ رہے تھے۔ انھیں سنگ راہ دیکھ کے ضبط نہ ہو سکا۔ سبھی لاپرواہ تھے انھیں کاوارا نیارا کر ڈالیں۔ اُدھر قواب قاسم علیخان انگریزوں سے چرکا کھانے جو چیلے تو شجاع الدولہ کو مریدان بچکے انھیں کیڑا مڑے۔ یہ تو ایسا موقع خدا سے چاہیے تھے۔ فوراً حمایت دسر پرستی پر رضامند ہو گئے۔ مستزاد یہ کہ شاہ عالم بھی انھیں سب کے شریک حال ہو کر اور شہر دینے لگے۔ القصد ایک مدت تک ہنگامہ جدال و قتال بمقام پٹنہ گرم رہا۔ دونوں طرف سے دہلیز جانا بڑا نئے داد شجاعت خوب دی لیکن فتح و شکست امور تقدیری ہیں۔ اور حکمہ قضا و قدر سے انگریزوں کے خورشید اقبال کا طلوع اسی مطلع سے مقرر ہو چکا تھا۔ اتحاد و ثلثہ نے لاکھ زور مارے۔ عید جد و کد کی۔ لیکن تثلیث کے ماننے والوں کی کینا کی اپنا کام کر گئی۔ کبسر کے مقام پر سارا بھرم ہاتا رہا۔ انگریز غائب فتحمد۔ میر قاسم اور شجاع الدولہ منسوب و ہزیمت خوردہ ہو گئے۔ قسمت کی زیر نگینی قتل کے کثرت پرستخ پائی۔ یکہ و تہانے دوہری تہری چوٹیں بچائیں۔ اور سب کو میدان سے بھگا دیا۔ خیر۔ جنگ کا جو انجام ہوا وہ ہوا۔ شجاع الدولہ پھر بھی گھاتے میں نہ رہے۔ انھیں تین سو اسی ہا تھی چنیر مرشد آباد کی صلہ برس کی کمانی با تھی۔ خزانہ۔ زرد جو اہر۔ اشرفیاں۔ اور خدا جانے کیا کیا نفائس تھے ہاتھ لگ گئے۔ سورنن کا بیان ہو کہ جب شجاع الدولہ شکستہ دل ہو کے کبسر سے لوٹے تو بیوی بچوں کو بخشی مالک کی حلقہ و حراست میں چھوڑ کے آپ جریدہ بریلی ہوتے ہوئے نواب احمد خاں بگلش پاس فرخ آباد پہنچ گئے۔ اگرچہ احمد خاں بگلش کے دل میں سفدر جنگ کے وقت کا کینہ دیرینہ باقی تھا۔ لیکن شجاع الدولہ کو اس طرح سرسیمہ اور طالب ہمدردی و اعانت دیکھکے انھوں نے شان ریاست دکھائی۔ دل کھول کے لے تو موضع ملکیم سے پیش آئے اور یہ صلح دی۔ کہ انگریزوں سے صلح و آشتی کرنا۔ اور یہ لطف و ہوشی پیش آنا چاہیو چنانچہ شجاع الدولہ نے اسے قبول کیا اور اسباب میں ریشہ دوانی شروع کی۔ آخر کار شہرہ میں بمقام بنارس ایک عہد نامہ انگریزوں سے ہو گیا۔ جس کی رو سے یہ طے پا گیا کہ نواب اور کینی دونوں ایک دوسرے کے معین و غوار و غلغار ہو جائیں۔ ایک کا دوست دوسرے کا دوست ہو اور ایک کا دشمن دوسرے کا بھی دشمن۔ نواب اپنی فوج کی تعداد صرف پچیس ہزار کو دیں پچیس دس ہزار سوار ہوں۔ دس ہزار پیادہ پانچ سو تو پھانے والے۔ اور سارے تو ہزار بقیاعدہ جمعیت۔ اور اس میں صرف پیدل فوج کی ترتیب اور ہتھیار رو پرین ہوں۔ اس عہد نامے سے شجاع الدولہ کے دوستانہ تعلقات انگریزی کینی سے قائم رہے اور اس کا خطاب مظفر الدولہ بخشی مالک ابو البرکات خاں تہور جنگ تھا۔ یہ قصہ کا کوری کے رہنے والے اور راقم کے اجداد میں تھے۔ مولف

ہو گئے۔ بڑا کھٹکنا۔ دل مطمئن ہو گیا۔

۱۷۵۷ء میں ایک نیا شکوہ نکلا۔ کسی رقیب امن و عافیت نے دارن ہیننگز (گورنر جنرل) کو شجاع الدولہ سے بظن اور شکوک کر دیا۔ وہ گھبرا کے بنارس چلے آئے اور شجاع الدولہ سے ملاقات کی اور زو ظاہر کرنے لگے۔ چنانچہ یہ بھی بنارس پہنچے۔ ملاقات ہوئی۔ ملاقات ہوتے ہی طرفین کے مابینہً خاطر صاف ہو گئے۔ کہ ورتیں بست گئیں۔ اور ایک جدید عہد نامہ ہو گیا۔ جسکی رو سے یہ طے پا گیا کہ الہ آباد اور کوٹڑا کے ضلع جو شاہ عالم کو اسلئے دیے رکھے گئے تھے کہ عزت و آبرو سے زندگی بسر کریں۔ اور بادشاہت کی بگرمی سنبھالے رہیں اب اُن سے لے لئے جائیں کیونکہ وہ بالکل کٹھ پتلی کی طرح مر رہے تھے ہاتھ میں ہو گئے ہیں۔ اور خلافت عہد نامہ ۱۷۵۷ء انھوں نے یہ ضلع بھی مرہٹوں کے ہاتھ میں دے رکھے ہیں۔ اور پھر یہ کہ اضلاع نواب وزیر کو تفویض کر دیے جائیں اور وہ اُنکے معاوضے میں پچاس لاکھ روپیہ کمپنی کی بند کر کریں۔ یہ بھی اس معاہدے میں طے ہو گیا کہ اخراجات فوجی کیواسلئے دو لاکھ دس ہزار روپیہ مہوار کمپنی کے خزانے میں داخل ہوا کرے۔ جس سے دو پورپن۔ اور چھ سپاہیوں کی پانچس اور ایک کمپنی جو بھوپور گولہ اندازوں کی اودھ کی اعانت اور ملک کے واسطے ہر وقت تیار رہے شجاع الدولہ نے یہ سب شرطیں منظور کر لیں۔ زیادہ تر اسوجہ سے کہ اب اس زمانے میں روہیلوں سے کسی قدر امن ہو چکی تھی اور شجاع الدولہ کا منصوبہ یہ تھا کہ انکو پالماں کرنا چاہیے۔ چنانچہ انھوں نے دارن ہیننگز سے اپنا کمون خاطر ظاہر بھی کر دیا۔ اور کہہ دیا کہ روہیلے اُنکے پر حملہ کر نیرالے ہیں۔ لہذا انکی روک تھام کرنا ضروری ہے۔ پھر مرہٹوں کے معاملے میں جو چاہیں لاکھ روپیہ اُنپر واجب الادا ہو وہ بھی ہینوز وصول نہیں ہوا ہو۔ لہذا اگر ایک بریگیڈ انگریزی فوج کی بجائے تو وہ دو لاکھ دس ہزار روپیہ مہوار بجوٹی دیا کریں گے۔ دارن ہیننگز نے بھی اسے مصلحت وقت جاننے قبول و منظور کر لیا۔ اسی عہد نامہ کی رو سے یہ بھی قرار پایا کہ ایک انگریزی رینڈنٹ دربار اودھ میں رہا کرے۔ اس عہد نامے کا نتیجہ یہ ہوا کہ روہیلوں سے لڑائی چھڑ گئی۔ اگرچہ اس جنگ و جدل کے نتیجے شجاع الدولہ کے حق میں زیادہ اہم نہیں ہوئے البتہ اتنا ضرور ہوا کہ روہیلے جو اپنی بھادری پر نازاں۔ مسر فرشی پر ہر وقت کمر بستہ اور جاہلانہ جوش و خروش سے ہمیشہ مست و دیخو رہتے تھے نچا دیکھ گئے۔ پست پڑ گئے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ تباہ و برباد ہو گئے۔ حافظ رحمت خاں مائے گئے اور اُن کے زن و فرزند بلا میں مبتلا ہو گئے۔

ہینوز روہیلے کمینڈ کے معاملات زیر بحث تھے۔ فتح کی مسرت کا آوازہ بلند تھا کہ مرض الموت نے منہ دکھایا۔ ایک جینے تک زندگی اور موت کی کشمکش رہی۔ ۲۶ جنوری ۱۷۵۷ء کو یہ چکر اُٹا بھی طے ہو گیا

موت نے زندگی کو شکست دی۔ اور ۲۶ برس کے سن میں شجاع الدولہ کو بھی وہی دن دیکھنا پڑا جو بھیرو نے دیکھا اور برہانن کو ایک نہ ایک دن دیکھنا ہے۔

شجاع الدولہ کے مرنے سے اودھ کی ترقی اور وسعت کا ایک دور تمام ہو گیا۔ کیونکہ ابھی تک حکمرانان اودھ کی بہت قویع مملکت ترقی جاہ و منصب۔ اور اضافہ اقتدار و سلطوت پر تواتر مصروف ہی تھے۔ لیکن شجاع الدولہ کے وقت میں انگریزوں کی پشت پناہی اور حفاظت کا سہارا پا کے جواطمیان و دلجوئی نصیب ہوئی اس نے آئندہ حکمرانوں کو اپنے مقبول نجات پر بغیر وفاقیت قابض و مقصرف رہنے اور کش و کاہ مرنے کے ساتھ بغراغت بسر کرنے ہی پر مائل رکھا۔ شجاع الدولہ کی مرنے کی صورت و سیرت کے باب میں انگریزی مؤرخین بہت ترزاں ہیں۔ چنانچہ سنسکرت (جو غالباً دل میں شجاع الدولہ سے عداوت بھی رکھتے تھے) مقرر ہیں کہ ”وہ بہت حسین اور خوشرو جوان تھے۔ قد بلند پانچ فٹ گیارہ انچ تھا۔ ہاتھ پاؤں چوڑے چمکے تھے۔ بدن پھرتیا کسایا تھا۔ تلوار کی ایک ضرب سے بھینے کا سر آڑا دیتے تھے۔ ساتھ ہی لے کے بڑی چلت پھرت کے آدمی تھے۔ محنت و مشقت کے عادی۔ تکلیف و مصیبت بھیلنے کے خوگیاں ہوا حرم اور عالی حوصلہ۔ چکلی آنکھوں اور خارا شکاف نظر سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ دل میں جوش اور سینے میں شعلیں بھری ہوئی ہیں۔ وہ صبح بخیر دم اٹھ بیٹھے اور گھوٹے پر سوار ہو کے سیر و شکار کو چنگل کی طرف نکالتے وہاں ہرن۔ بارہ شگھے یا چیتے کا شکار کھیلتے۔ دوپہر ہوتے گھومتے اور آتے ہی آتے ٹھنڈے پانی سے نہلاتے پھر حرم سرا میں داخل اور پیش و نشا طیں مصروف ہو جاتے۔ یہ حالت ابتدا کی تھی۔ لیکن کبھی کی لڑائی میں شکست کھا کے طبیعت کا رنگ بدل گیا تھا۔ اب فوج کی دستی۔ محاصل ملک کی افزونی پر زیادہ توجہ جو گئی تھی۔ حرم سرا کی دلچسپیاں کم ہو گئیں۔ مہات ملکی دہالی میں اٹھا کر بیٹھا گیا۔ جس سے ان کی دھاک ہر چار طرف بند ہو گئی۔ ملک کی آمدنی بڑھ گئی۔ فوج بھی اسی مرتب ہو گئی کہ شامیں آنے لگی۔“ اور لکھا ہے کہ ”شجاع الدولہ کے کارگر اور موٹیکے قابلیت سلم ہے۔ کبھی لڑائی کے بعد چار ہی برس کے اندر انھوں نے تمام پچھلے سلطانات کو پاک کر کے خزانہ الامال کر دیا۔ اور ملک کو ایسا مرتب و منظم بنا دیا کہ محاصل بخیر خشد وصول ہونے لگے۔ فوج بھی آراستہ اور باقاعدہ ہو گئی۔ فرنگین اور اسکاٹ جیسے مصنفین جیسے دل سڑ دیا کی طرح کلمہ نہیں کہتے ہیں کہ شجاع الدولہ ایک اچھے مجسٹریٹ۔ عدالت پسند اور دل و جان سے اپنی ملک کی فلاح و رفاه چاہنے والے نواب تھے۔ انداز اور ادب میں اپنے کو نہایت لیے دیے۔ عاقل و فزنا غریق و متواضع۔ رحوم اور کشادہ فراخ۔ رعابرایا کے محبوب۔ اور ہر طبقے میں ہر دوزخیز حتیٰ کہ ان کی موت پر حافظ رحمت خاں کے بیٹے ملک طول دیا سینے تھے“

فی الحقیقت شجاع الدولہ میں خدانے بہت سی خوبیاں اور فضیلتیں جمع کر دی تھیں اور اس پر آشوب  
وقت میں جبکہ غلوں کی شمع اقبال جھللا رہی تھی۔ بابر اعظم کی نسل سے سطوت و جبروت شاہی کیساتھ  
تامرغنا کی دھماکا بھی مدوم ہو چکے تھے۔ ہندوستان کی پولیٹیکل شطرنج میں بھی ایک نوازاں بڑبڑات  
تھا جو سب طرف معرکے کی چالیں ڈال رہا تھا۔ اگرچہ خود بادشاہ سلامت پر بھی اس کے ہاتھوں ایک آدھ  
بار شہ پڑ گئی لیکن آئین ملک داری اور حکمت عملی کے واقف کاروں کے نزدیک ایسی خطائیں قابل چشم  
پوشی ہیں۔ کیونکہ شجاع الدولہ کے وقت میں زمانے کا رنگ بہت بدل چکا تھا۔ وہ اپنے بزرگوں کے نقش قدم  
پر چل ہی نہ سکتے تھے۔ ان لوگوں کو کچھ مقابلہ کرنا پڑا ایرانیوں تو انہوں سے کرنا پڑا۔ اس کے مقابلے کی  
شان اور ہی تھی۔ شجاع الدولہ کے وقت میں انگریز۔ اور فرانسسی بھی میدان میں آچکے تھے۔ انکی کشتی اور  
ہی پہلوانوں سے بڑی گئی تھی۔ یہ اگر وہی دانوں چچ کھیتے کبھی سربر نہ ہوتے۔

ان وجوہ پر نظر کر کے یہ کہنا ہرگز بیجا نہیں ہے کہ شجاع الدولہ میں خدا نے کچھ غیر معمولی جوہر ذاتی ایسے  
دیئے تھے کہ اجنبی راہ اور بیگانہ منزل میں یہ مسلاست چلے اور مقصود کو تو پہنچائے۔ شجاع الدولہ نے ایک  
رو بہ لکھنؤ پر قبضہ کیا جس پر ان کے بزرگوں کا دانت ہمیشہ لگا رہا۔ دوسری طرف فرخ آباد تک دائرہ دولت  
بچایا۔ ادھر صوبہ الہ آباد میں اضلاع بنارس۔ غازیپور۔ اودھر۔ فخرپور۔ کانپور۔ اٹمواہ۔ مین پوری تک  
انہیں کے نام کی دو آبائی پھری۔ کل آمدنی صوبہ کی (جس وقت فرخ آباد بھی شامل تھا) دو کروڑ ستر لاکھ تھی  
جس میں تراسی لاکھ سرکار انگریزی کو دیا جاتا تھا۔

### (۵) نواب آصف الدولہ بہادر

شجاع الدولہ کے مرنے پر آصف الدولہ بڑے ہیٹے سند نشیں ہوئے۔ انکی سند نشینی کی ابتدا ہی  
سے انگریزوں کی مداخلت شروع ہو گئی۔ دو اپنے صفات ذاتی سے واقف تھے اور سمجھتے تھے کہ لائق  
فاتح بھائیوں کے سامنے وال گناہ نہیں ہے۔ ایسا جوہر سے ہر وقت ڈر لگا رہتا تھا۔ کہ کہیں کوئی دعویدار  
ایسا نہ اٹھ کھڑا ہو کہ جس کے سامنے سر جھکا تے ہی بن پڑے۔ اور یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اول ہی اول  
انگریزوں کی حمایت و سرپرستی کی جستجو کی خوش قسمتی یا بد قسمتی سے۔ انگریزوں کی حلیہ جو پاسی ایسے موقع  
کی منتظر تھی۔ ماؤ قبلت دیکھنے ہی تمام تر رجوع ہو گئے۔ غنائیں مہربانیاں شروع ہو گئیں۔ تعلقات دوستانہ  
کے پرستے۔ حمایت و حفاظت کی آڑ میں اپنی برتری اور فضیلت کا سکہ بٹھالیا۔ ہر بات میں محرم راز اول ہر  
صدا میں شیریں بنتے۔ نوبت پہنچائی کہ کوئی کام بلا استصواب بلکہ بلا منظوری کرنا جو رم و خطا ہو گیا۔ یہ زمانہ

یہ اُلگ تھا کہ دربار دہلی سے براہِ نام واسطہ رکھیا تھا۔ دنیا کا استخام ”ہیم دور جا“ پر منحصر ہے۔ دربار کی  
 بے اثری بلکہ ہیمپری روزِ دشمن کی طرح آشکارا ہو چکی تھی اور جو کچھ ہیم جانتا تھا اس کی نقلی نقل تھی۔ رعیتِ سلطنت  
 کا نام بھی باقی نہ رہا تھا۔ خالی وضع داری کا بنا ہوا تھا۔ کہ لوگ بظاہر گردن جھکاتے اور مراسمِ حلقہ بگوشی ادا کرتے  
 تھے۔ البتہ انگریزوں کے ہاں و جلال۔ عاقلاً نہ تباہ۔ حکیمانہ طرزِ عمل۔ اور فوجی شان و شکوہ کا سکہ ہر طرف  
 ہم گیا تھا۔ ان کی تلوار کا لوہا سب مان چکے تھے۔ اور ان کے دماغوں کی فراست سب کے دلوں پر نقش ہو چکی تھی  
 ہر عارضہ جزوِ دراندہ عرضِ حاجت کرنے انھیں پاس دوڑتا۔ ہر مظلوم و بیکس انھیں سے داد و بہاد و عبادت  
 آصف اللہ دہلی بھی مجبور تھے۔ طبیعت میں نہ وہ جوش اور زور تھا کہ کسی کو غصہ خیال میں نہ لاتے۔ بلکہ انگریز  
 اور بے جگری کہ دوسروں کا مال آسکتے۔ اور ہر ایک سے دست و گریبان ہو جاتے۔ انکو بی بنائی سلطنت  
 ملی تھی۔ دل میں جو کچھ اُٹھتا اور زہنی اسی کی تھی کہ اطمینان اور سکون کے ساتھ اپنے مقام پر بیٹھ کر  
 ادو عیش و کامرانی دیجیے۔ کھائے کھلائے۔ دنیا کی ہمار دیکھیے۔ اور ہنس بول کے زندگی گزار دیجیے۔ یہی  
 وجہ تھی کہ ان کے بائیں برس کے عہدِ حکومت میں اودھ کا یہ حال رہا کہ جیسے ایک کھلونا تھا جس سے کہنی ببار  
 کے نامان سلطنت اپنے اپنے وقتوں کیلئے اور جی بھلاتے رہے۔

آصف اللہ نے دربار دہلی سے بہت کم سرکار رکھا۔ وہ ہر معاملے میں انگریزوں سے داد خواہ  
 ہوتے اور انھیں کو اپنا حامی و مددگار بلکہ لجا وادھا جانتے۔ البتہ ایک بار جب شاہِ عالم کو منا بطخاں نے  
 بہت ستایا اور وہی ظلم و ستم شروع کر دیا جو غازی الدین نے ان کے باپ کے ساتھ کیا تھا۔ تو آصف اللہ نے  
 شاہِ عالم کو روپیہ اور فوج کی ملک بھیج کر منا بطخاں کے ظلم زیادتی سے فحاشی دلا دی۔ اور اسی خدمت کے  
 صلے بادشاہ نے ملک کے انکو بھی وزارت تفویض کر دی۔

آصف اللہ کی سند نشینی پر کہنی کی جانب سے یہ مسئلہ پیش ہوا کہ فوجی معاہدہ شجاع اللہ تھا۔ وہ مرگ  
 انکی بات ان کے ساتھ گئی۔ اب نیا کارخانہ ہوا ہے۔ نئی بساط بھی ہے۔ نئی چائیں چلی جائیں گی۔ معاہدہ  
 اور قرارداد بھی نہ ہونا چاہیے۔ چنانچہ جدید عہد نامہ ہوا جس کی رو سے یہ طے پایا کہ وہ کسی پوروس کو چلا  
 استرنا سے کہنی اپنی ملازمت میں نہ رکھیں۔ شاہِ عالم سے کہنی اور نواب کوئی بطور خود کسی قسم کی مسامت  
 ذکر سے۔ کوڑا اور الہ آباد نواب کے قبضہ و اختیار میں رہے۔ بنارس۔ جو پور۔ فاریپور (جس کی کہنی تیس  
 لاکھ تھی) کہنی کے پاس ہے۔ ماہواری خرچ فی بریگڈ چھ لاکھ دس ہزار کے دولا کہ ماہِ مہینہ پور  
 شجاع اللہ کے ذمے جو کہنی کا وادہ یا فتنی تھا اس کی ادائی آصف اللہ نے اپنے سرلی اور کہنی نے  
 ویدو گیا کہ نواب کے مقبوضات (جس میں کوٹہ۔ الہ آباد۔ دوہلہ۔ اور میان و نواب کا گھگ بھی تھا) کے ی فط

ملکبان رہیں گے اور بیرونی دشمنوں سے بچائے رکھیں گے۔ اسی کے ساتھ ہی کچھ فوج کا اضافہ بارہ لاکھ سالانہ خرچ پر ہو گیا اور جو ریزنٹ دربار میں رہتا تھا اُسکی تنخواہ کے علاوہ ایک اور اجنت لکھنؤ میں مقرر کیا گیا جسکی تنخواہ دو لاکھ بیس ہزار سالانہ نواب نے اپنے فتنے کر لی۔

انگریزوں کے فعل عافیت و حمایت کا سہارا پا کے آصف الدولہ بیرونی دشمنوں حملہ آوروں اور اندرونی و غریبوں اور رقیبوں سے بالکل نڈرا و مطمئن ہو گئے۔ اور نظم و نسق مملکت و آراستگی سلطنت تو کجا۔ داد و عیش و کامرانی دینے لگے۔ لیکن چونکہ فیض آباد میں ماں اور دادی کا رعب چھایا ہوا تھا۔ اُن کے سامنے مجالِ منتفیٰ کی جوابی کی انگلیں نکل سکیں اور کھلے بندوں جو چاہیں کریں۔ اس لیے یارانِ انجمن نے یہی صلاح ٹھہرائی کہ فیض آباد کو چھوڑ کے لکھنؤ کو آباد کرنا چاہیے۔ آصف الدولہ کی طبیعت تو راجا حتیٰ کہ خواہاں آرام کی جو یاں تھی ہی۔ یہ خدا سے چاہتے تھے کہ آزاد و مطلق انصاف رکھے دیکھے شوق پورے کریں جو جسے نکالیں۔ چنانچہ باختلافِ روایات مشعلہ اعیانہ سلطنت میں امارت کے سارے کارخانے لکھنؤ میں آ گئے۔ فیض آباد سونا ہو گیا۔ اور لکھنؤ کی آبادی کی بنیاد پڑ گئی۔ لیکن لکھنؤ کے آصف الدولہ کو یہ دقت پڑی کہ جو کچھ نقد و جس۔ زور و جہر۔ کئی پشتوں کی کمائی کا تھا وہ سب ماں اور دادی کے قبضے میں تھا اُس پر نواب کے دسترس نہ پہنچ سکتا تھا۔ ادھر کچھ تو خلقِ سیرِ حشمی اور فیاضی کے سبب مدنی پر خیرج بالا رہتا تھا۔ تو فیر کجا اور کچھ انگریزوں کے مطالبات کی وجہ سے روپیہ کی حاجت یوں مافیوفا بڑھنے لگی۔ بمبئی کے مطالبات کا یہ حال تھا کہ بڑی طرح بڑھتے ہی چلے جاتے تھے۔ اور اب بڑھتے بڑھتے ایک کروڑ سالانہ ٹیکس ہو چکے تھے جنہیں سے بڑی کشش و کوشش کرنے سے ستر لاکھ سالانہ ادا ہوتا اور بیس لاکھ سالانہ بقایا کی مد میں پڑتا۔

نوبت بائجا رسید کہ مشعلہ ۶ میں اس بقایا کی میزان بھی دو کروڑ و س لاکھ روپیہ ہوئی۔ اگرچہ ان مطالبات کی ادائی کے واسطے بہت کچھ فکر کی گئی لیکن کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔ بلکہ بعض صورتیں ایسی پیش آتی رہیں جسے خزانے کے سامان بڑھتے اور مدخل گھٹتے ہی رہے۔ آخر نواب نے مجبور ہو کر مشعلہ ۶ میں کمپنی سے رحم کی التجا کی۔ اتفاق یہ کہ تھوڑے دن بعد وارن ہیسٹنگز کو روپیہ کی شد بد ضرورتیں دلائی ہوئیں اور وہ مشعلہ میں چار گڑھ نواب سے ملنے اور کچھ معاملات طے کرنے کی طرغ سے تشریف لائے۔ نواب بھی وہیں پہنچے۔ دونوں نے اپنی اپنی حالت اور ضرورت کو بیان کیا۔ چنانچہ یہ طے ہو گیا کہ ہر ایک بر گئیہ اور ایک زائد رجمنٹ کے اور جب قدر انگریزی فوج اودھ میں ہو وہاں سے بلائی جائے اور نواب کو اپنے جاگیرداروں کی بابت یہ اتحقاق ہو کہ جسکی جاگیر میں منہبط کر لیں۔ البتہ وہ جاگیریں جسکی ضمانت انگریز کر چکے ہیں اُن کے ساتھ یہ معاملہ کیا جائے کہ بہ نفع اُن کی

آمدنی بذریعہ ریزرنٹ اُن کو پہنچتی رہے۔ اسی طرح کپنی کے مطابق بجائ کی ادائیگی واسطے یہ تدبیر لگائی گئی۔ کسی حیدر دوا سے ایک رقم کثیر بیگمات شاہی سے وصول کیا جائے۔ اگرچہ آصف الدولہ بدیہین چھینٹن مالہ کے قریب مختلف وقتوں میں ماں اور دواؤں سے وصول کر چکے تھے۔ لیکن اب کپنی کی شدید ضرورت اور تعلق سے مجبور ہو کے اُنکو پھر یہی چال چلیا پڑی چونکہ کپنی کے واسطے روپیہ وصول کرنا تھا۔ اس لیے اُنکو ہر طرے اطمینان تھا۔ کہ اس کارروائی میں جو کچھ تشدد یا ظلم و ستم بیگمات شاہی پر کیا جائیگا اُس میں انگریز مانع و مزاحم نہ ہونگے بلکہ ہر طرح چشم پوشی ہی کرینگے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور سربمہ مالہ روپیہ وصول ہو گیا۔ لیکن چونکہ یہ مقدار نا کافی تھی اس لیے دوسرے شکار کی تلاش کی گئی۔ فیض اللہ خاں نواب روہیلکھنڈ اس دام میں پھانسیے گئے۔ اور جب ملک انھوں نے چند رو لاکھ روپے پیشکش نہ کیے جان نہ چھوڑ سکے۔

ان تمام کارروائیوں کا اِزام چاہے آصف الدولہ کی کمزوری پر دکھا جائے چاہے جلاوت جنگ دارن میں سنگنہ کی دھینگا دھینگی یا کپنی کی موقت ضرورتوں اور اُسکی سلطنت سازی کے منصوبوں پر بہر تقدیر اودھ کے واسطے یہ زمانہ کچھ اچھا نہ تھا۔ ایک طرف سے روپے کی مانگ تھی کہ برابر جاری تھی۔ اور دوسری طرف دھینگا دھینگی اور سربمہ پوشی۔ دوسری طرف خزانے کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ اور کشادہ دلی و بلند نظری کا اظہار بیدریغ زرباشی پر آ رہا تھا۔ جہت عالی کے سامنے ملکی ضرورتیں۔ انتظامی اور سیاسی اصول سب بالائے طاق رکھ دیئے گئے تھے۔ چشم فروت باعث خانہ خرابی ہو رہی تھی۔ خیریت گزری کہ یہ حالت زیادہ دو دن قائم نہ رہی۔ اور بعد چند جسے لارڈ کارنوالس صاحب زبید دہ ایوان گورنری ہو گئے۔ اور اُس نے اُن میں نواب نے اپنی پریشانی حالت اپنے ظاہر کرنے کی واسطے امیر الدولہ حیدر بیگ خاں کو کھلی بھیجا۔ اُس وقت کی پریشانی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ امیر الدولہ کا ۱۸ لاکھ روپیہ سرکار سے سفر خرچ عنایت ہوا اور کروڑوں روپے تک صرف کی اجازت دی گئی۔ امیر الدولہ نے لارڈ صاحب سے یہ اسباب پریشانی بیان کیے۔ ایک وقت میں اعلیٰ کثرت فحارج۔ معارف میرانہ لابی تیسرے نقصان چھائی جسکا سالانہ قسط چھین لاکھ ستر ہزار ہوتا ہو۔ ملک بنارس وغیرہ محاصل ۱۲ لاکھ ہریہ دوستانہ سرکار کپنی کو دیا۔ چوتھے لکھ روپیہ صرف ضیافت و سامان روشنی و تماشا ہوئے۔ بسنت وغیرہ محض بنط صاحبان نو وارد ہوتا ہو۔ تھار انگریزی اسباب تہارت وغیرہ ولایت سے لاتے ہیں۔ اُنپر محصول نہیں۔ چھپتے تاجران ولایت جو رطب و یابس لاتے ہیں عرض کرتے ہیں ہم بڑی دوس سے اسباب تنقہ ولایت فتنہ حضور کے واسطے لاتے ہیں ہندوستان میں سولے حضور کے کون قدر دان ہیں



جو ایسے ایٹھائی تھوہ کیا اب کو مول لے۔ جناب عالی (یعنی آصف الدولہ) اپنی بلند نامی کیو اسطے  
 ملاحظہ فرما کے سب مال ترو شک لے لیتے ہیں اور جقدر وہ قیمت کچھ بھیجتے ہیں اسکی دلائی ہمیشہ ہوتی ہو  
 ہم ملک حاکم کچھ کے بجالاتے ہیں اور اس قرصے کا سود ہمیں دینا پڑتا ہو۔“

لارڈ کارنوالس نے ان معقول وجوہ پریشانی پر اپنی ہمدردی ظاہر کی۔ چھاتی میں دو آنے  
 موقوف کیے۔ ملک بنارس وغیرہ کا استرداد منظور کیا اور حکم دیا کہ کوئی تاجر بے صاحب رزڈٹ یا کوئی  
 تازہ ولایت نواب تک نہ پہنچا کرے اور تاجر پر حسب سرشتہ حکم محصول دیا۔ یعنی فیصد پانچ روپے  
 لیے جائیں۔ آرون صاحب سمجھتے ہیں کہ لارڈ صاحب نے کمپنی کا ایجنٹ بھی جسکی بابت دس لاکھ  
 سالانہ کے قریب خرچ کرنا پڑا تھا موقوف کر دیا۔ لیکن ان سب میں استرداد ملک بنارس کو  
 نواب نے بقضائے ہمت عالی“ منظور فرمایا۔“

ادوہ کے دن اچھے نہ تھے کہ لارڈ کارنوالس کے بعد سر جان شور صاحب گورنر جنرل ہو  
 آئے۔ انھوں نے جو کیا وہ یہ کیا کہ جب ۱۸۵۷ء میں کھنڈ تشریف لائے تو دوزخہ رنجیں ساڑھے  
 پانچ لاکھ سالانہ کو خرچ سے مل کر گئے۔ دوسرا تھ لارڈ صاحب یہ دیکھئے کہ علامہ تفضل حسین خان  
 کو ملا گیری سے وزارت پر فائز کر گئے۔ نواب کے منظور نظریاں الماس تھے اور وہ انھیں کو  
 اس منصب کے شایاں سمجھتے تھے۔ لیکن اب زمانہ یہ آگیا تھا کہ اندرونی معاملات اور فروری انتظامات  
 بھی بغیر صلاح و مشورہ لارڈ صاحب طے نہیں ہوئے تھے۔ اگرچہ میاں الماس کی انتظامی قابلیت  
 ہر دہائی اور نواداری و جاں نثاری کی بابت سلیم صاحب تک رطب اللساں ہیں۔ لیکن سر جان شور کو  
 انکی وزارت پر بیرونہ منظور کرنا پڑی کہ کسی وقت میں لارڈ کارنوالس صاحب انکے خلاف کچھ لکھ جا چکے تھے  
 بہر حال ملاکی سمیت میں ایک بار عروج پا کر لکھا تھا۔ کچھ دنوں کے لیے رتی جگ لگئی۔ وزارت چل گئی۔ اور چند ہی  
 روز میں مالا مال ہو گئے۔ لیکن آصف الدولہ کا ساوغیات برتر ہو چکا تھا۔ ملا بیچاے کی تقدیر نے بھی  
 کچھ زور نہ لگایا۔ نواب بیمار پڑے۔ استعفا ہو گیا۔ اور ستمبر ۱۸۵۷ء میں ۷۰ عدن مقام ہو گئے۔

آصف الدولہ کا زمانہ اگرچہ گردش کے حالات و اسباب کے تبدیل ہو جانے کے سبب سے  
 ایسا نہیں ہو جسے دور ترقی میں شمار کر سکیں۔ لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ ملک کی عام بے امنی اور  
 طوائف الملوکی کے ہنگامے میں انکا انگریزوں کی رضا جوئی کرنا بھی وقتی ضرورتوں کے لحاظ سے بہت مناسب  
 و در نتیجہ خیر ہوا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ آصف الدولہ کے وقت سے جسطرح کشمیری آبادی کی بنیاد پڑی  
 وہی طرح ایک جدید در بھی شروع ہو گیا۔ وہ اپنے جانشینوں کے واسطے ملک گیری اور سرکار آرائی کی شاہد

سے الگ ہو سکے ایک نئی سرگ قناعت کے ساتھ اپنی دستار سنبھالے ہوئے چلنے کی بنا گئے۔  
 داد و دہش ذریعہ بڑی اور گہر پاشی کے لحاظ سے آصف الدولہ اپنے وقت کے حاکم تھے نہیں  
 نہیں پارس پھر کتنا چاہیے کہ جو چھو گیا خاک سے پاک ہو گیا۔ انگریزوں کو جو کچھ ملا سکا تو کچھ حساب نہیں  
 کمپنی تو کمپنی اور ذاتی ملازم لاکھوں روپیہ کمائی گئے۔ دہلی کے شہزادے جو دار و مدار ہو جایا کرتے  
 تھے۔ جب تک رہتے تھے وہاں تواری کے وہ لطف اٹھاتے تھے کہ گھر بھر جاتے تھے۔ جب  
 جانے لگتے جیب و دامن پُر کر کے لیجاتے تھے۔ پھر ہندوستانی مقربان بارگاہ کے داخل و خارج  
 کا کیا پوچھا ہے۔ ایک ایک سرکار کے کرور فرجہ و شتم وہ تھے کہ اور ملکوں کے بادشاہوں سے دھوا  
 ہمسری رکھتے تھے۔

ایسے سیر شرم۔ دریا و دل حکمران کے عہد حکومت میں کسی نئے شہر کی بنیاد پڑنے سے پہلے ہی ہکتا  
 ہے کہ کیا یک کیونکر جنگل میں نکل ہو گیا۔ خود آصف الدولہ نے آتے ہی آتے تعمیرات کا جو حکم کھولا اور اسکے  
 ساتھ امرے دولت و اعیان ریاست نے مالیشان عمارتوں کا جو سلسلہ شروع کیا اسنے لاکھوں ہنگام  
 خدا کی کفالت کی۔ ہزاروں کو مال مال کر دیا۔ اور وہ لکھنؤ جو چند دیہات کے مجموعے سے زیادہ نہ تھا جس  
 خرابیے اور زمین شور کے سوا کسی طرف کچھ نظر نہ آتا تھا۔ بجز بہتر زمین۔ اونچے اونچے ٹیکرے۔ گہرے  
 گہرے نالے ہر طرف دکھائی دیتے تھے۔ کہیں جھاڑیوں جھنکار یوں سے جنگل کا سان تھا۔ کہیں پھوس  
 کے چھتروں اور کچے مکانون سے گاؤں کی کیفیت۔ چند ہی دن کی مدت میں ایک اچھا خاصہ شہر بن گیا۔  
 ہر طرف آبادی ہو گئی۔ بازار لگ گئے۔ محل بن گئے۔ سرکیں نکل گئیں۔ اور مٹی کو چوں میں کچن برستے  
 لگا بڑی بڑی کوشیاں اور محسراتیں بنیں۔ باغ باغ لگے۔ پھلواریاں آزاد ستہ ہوئیں۔ اماہٹے بنے بھویر  
 تعمیر ہو گئیں۔ اور ہر طرف چل پھل ہو گئی۔

اتفاق یہ کہ اب وہ پُر آشوب زمانہ آگیا تھا کہ خاندان تیموریہ کی روز افزوں تباہی اور اسلامی سلطنت  
 کے ضعف و انحطاط سے پای تخت دیران ہو رہا تھا۔ پُرانے پُرانے خاندان خٹنے لگے۔ اور وہ لوگ جو  
 بزرگوں کی ہفت ہزاری اور صوبہ داری کے جاہ و شتم میں ناز و تنم سے پہلے تھے شکستہ حال اور محتاج و  
 فاقہ کش ہو جو کے خانہاں خواب ہو رہے تھے۔ لیکن دہلی سے نکلیں تو جائیں کہاں۔ ہر طرف آگ لگی  
 ہوئی تھی۔ کہیں امن نہ تھا۔ ملک کی حالت یہ ہو رہی تھی کہ ایک طرف مرہٹے سر اٹھائے ہوئے ہیں۔ اُنکی  
 گھوڑوں کی ٹاپوں سے ادھر راجپوتانہ اُدھر مالوہ۔ ہندو گھنہ اور گجرات میں ٹپل جی ہونی ہے۔ رشتے بھڑے  
 لوٹے مالتے۔ گاؤں کو دیران اور شہروں کو تباہ کرتے ابھی ادھر سے نکل گئے۔ ابھی اُدھر سے۔

سارا ملک تہ وبالا ہو رہا ہو۔ کہیں چین نہیں۔ دوسری جانب پنجاب میں سکھ شاہی کے جوہر جفا سے خلقت  
 جاں لب ہو رہی ہے۔ تعصبات مذہبی کے شعلے آسائش مائے کئیے برق خرسن سوز کا کام کر رہے ہیں۔  
 چین سے پانچوں پھیلا کے سونا تو کجا۔ جان و مال۔ عزت و آبرو کی ہر شخص خیر سار ہا ہو۔ ایک طرف ٹیپو سلطان  
 کی بھلی طبیعت اور فرہادیوں کی سیف و قلم کی دھاک بندھی ہوئی ہے۔ جدال و قتال۔ صف آرائی اور  
 میدان داری کا میدان گرم ہو۔ دوسری طرف پنڈتھاریوں کی لوٹ مار سے بٹیاں اُجاڑ۔ اور رستے  
 مخدوش ہیں۔ ایسی مصیبت۔ تباہی۔ بے امنی۔ اور جاں لبی کے وقت جو کچھ سکون و قرار۔ راحت  
 و اطمینان کا سامان نظر آتا تھا تو اودھ کے چھوٹے سے ٹکڑے میں۔ پھر آصف الدولہ کی فیاضی و شیشی  
 کا غلغلہ بھی بلند ہو چکا تھا۔ ہندوستان کے ہر گوشے و زاویہ سے جو زمانہ کا ستا یا اور آفت کا مارا نکلتا۔  
 اودھ ہی کی طرف بھگتا۔ شریف اور خاندانی امیر زادے۔ سپاہی ہش اور تلوار کے دھنی سورا۔ ہر عظم  
 کے عالم اور ہر فن کے کامل سبھی رنگ اور سبھی مذاق کے لوگ آتے اور جو ہر شائستگی اور اُسکے  
 قد و ان حد بارہوں کی داد و دہش اور بڈل و اینار سے یہیں رہ جانے لگے۔ اور ان باتوں نے کھنڈ  
 کو کھنڈ بنا دیا۔ اعدا اُسکا آوازہ چار دہنگ عالم میں بلند کر دیا۔

خود آصف الدولہ نے جو عمارتیں بنائیں انکی صنعت تعمیر اور شوکت و عظمت آج تک بانیوں کے  
 کی نیت پر گواہی دے رہی ہیں۔ حسن باغ۔ عیش باغ۔ چار باغ۔ کانام ابھی تک مشہور ہے۔  
 دولت خانہ۔ بیابا پور کی کوٹھی۔ چنٹ کی کوٹھی کے اب صرف کھنڈر باقی ہیں لیکن بڑا ماساڑہ اور رومی  
 دروازہ جس میں اینٹ اور چونے کی وہ مناسی دکھائی گئی ہے کہ اہل یورپ بھی اُسکی تعمیر دیکھ کر دنگ  
 رہ جاتے ہیں ابھی تک اُس نمیکدل۔ غریب پرور۔ عاجز و اذ اور فیاض نواب کی نیک نیتی کو ظاہر کر رہا ہے اور  
 زمانے کے ظالم ہاتھ کی چوٹیں پچاتا اپنی حالت پر قائم ہو۔ یہی ابا ساڑہ ہر دگر نواب کی خواب گاہ ہو گیا اور اسوجہ  
 سے کتا عمر خطای خوشتری کی یہ تاریخ ”ہنساروٹ و ریحان و جنت النعم“ سربالین بہت لطف سے یہی ہو  
 آصف الدولہ کے بعد وزیر علیخان اُنکے بیٹے شکر تخت نشین ہوئے لیکن انگریزوں سے دل صاف  
 نہ رکھتے تھے اور انکو بھی انپر اطمینان نہ تھا۔ پانچ ہی چار مہینے بیٹھے تھے کہ اُسے ایسے حرکات ناروا و فاسد  
 بھی صادر ہوئے جس سے قدیمی خاندان و ادمت و خدمت اہل دربار۔ بھائی بند اور رعایا پر ایمان بڑھی پیدا ہوئی  
 اور اس شور و شکیں اطمینان کے سر جان شور کو کھلتے سے آنا اور کھنڈوں نواب کا قلع قمع کرنا پڑا۔ نواب  
 جو صحت مند کن کے بنا اس وجہ سے لگے۔ تین لاکھ سالانہ وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ لیکن اپنے ہتھکڑوں سے  
 باز نہ آئے اور کچھ روز سرشوری کے ساتھ ادھر ادھر دن گزارتے۔ مہنتے اٹھاتے۔ ہنگامے برپا کرتے اور

آخر عمر میں کلکتہ میں قیدیوں کی طرح زندگی کے دن پورے کر کے ناشادہ تامل و دنیا سے اٹھ گئے۔  
مقام عرت سب سے کہ وہ شخص جسکی شادی کھڑائی میں تیس لاکھ روپیہ صرف ہوا اُسکے کفن و دفن میں ستر روپیہ  
سے زیادہ نہ صرف ہوا۔ فاعتر و یا اولی الالبصار۔

## ۷) نواب سعادت علیخان

انکا پورا خطاب بین الدولہ و ناظم الملک (بعد چندے افتخار الملک) نواب سعادت علیخان بہادر  
سہارن جنگ تھا۔ شجاع الدولہ کے بیٹے اور آصف الدولہ کے بھائی تھے۔ کیاقت و کاروانی اور فرست و  
ہوشمندی کے جوہر تعداد دلائے تھے۔ باپ کے وقت میں بریلی کے صوبے کا سارا کام انھیں کے سپرد تھا  
وہیں اپنے جوہر ذاتی کے دکھانے میں معروف رہے۔ جب بڑے بھائی (آصف الدولہ) کو سند نشین اور پانچ  
سے بدظن پایا۔ بمقتضای حزم و احتیاط الگ تھلک ہے۔ نہ دعویدار ریاست جو سے نہ رقیب مملکت ہنر  
لیکن آصف الدولہ نے اسے گوارا نہ کیا۔ مصلحت اسی میں سمجھی کہ انھیں نگاہ کے رو برور رکھیں۔ بلایا اور بہت  
تیاک سے بلایا۔ یہ نہ آئے۔ انھوں نے انگریزوں کو بیچ میں ڈالا۔ اُدھر سے فوٹیش بھی ہوئی۔ دباؤ بھی پرایمجور  
ہوسکے آئے۔ لیکن صحبت برار نہوسکے۔ یہاں کا قوام گمراہ ہوا تھا۔ نائب الریاست کو سیاہ و سفید کا ٹاکا اور  
رئیس کو غافل و از خود رفتہ دیکھکے جی نہ لگا۔ آخر بنارس میں جا کے رہنے لگے تین لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ مقرر  
ہو گیا۔ بعد چندے جب آصف الدولہ کو ملک کی بد نظمی پرتوجہ ہوئی۔ اہلکاروں کی بد اعمالیوں پر کھ کھلی۔ قتل و لالہ  
کی نیابت اُنکے تقرر اور تجرکی وجہ سے قرار گزرنے لگی۔ یہ بھی آئے۔ اب زمانہ پر آگیا تھا کہ بعض ارکان ملت  
کے سرور نہیں بھی خیالات فاسد راہ پاؤں اپنے ہی مرغان دست پور آنکھیں دکھانے لگے تھے بہت علیخان  
سپہ سالار افواج کے دل میں نواب اور نائب دونوں کی طرف سے بدی آپکی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مختار الدولہ اور  
بہت علیخان موت کے گھاٹ اُترے اور سعادت علیخان جان بچا کے اکیر آباد کی طرف نکل بھاگے۔ ایکسپا  
دن میں نائب الریاست۔ سپہ سالار عساکر۔ اور فوت بازو بھائی نے نواب سے کنارہ کیا۔

آصف الدولہ کے مرنے پر جب وزیر علیخان کی سند نشینی کی خبر سنی سعادت علیخان کو اپنی فکر پڑی۔ یہ بیشتر  
سے سب بندوبست کر چکے تھے اور انگریزوں کے قول و قرار۔ عمد و بیان پر مطمئن بیٹھے تھے۔ یہ خبر سننے ہی فوراً  
کلکتہ چلے کہ وہیں جا کے کوئی صورت نکالیں۔ معاملہ طے کریں۔ اپنے حقوق اور انگریزوں کے سوا عید یاد و لہجہ  
و کم کی درخواست کریں۔ صلہ مکافات سلوک و مدارات کی پُرچک دیں۔ اقبال پہلے ہی سے یلوری پر کر  
بہت تھا۔ راستے ہی میں تھے کہ کھنوسے طلب پہنچی۔ اُدھر خان عمامہ نے ریشہ دوانی کی۔ اوپر ہو گیا۔

کا شہدہاں میں ہو چکا۔ اسے لطیفہ نقیبی مجھس کے پٹ پڑے۔ تقدیر کے کارخانے دیکھو کہ جس شام کو یہ  
کا پورہ پہنچے اسی کی صبح کو وزیر علیخان کھٹہ مین گرفتار ہو گئے۔ انکے واسطے میدان صاف ہو گیا۔ اہل  
انگریزوں نے غل حاکمیت میں بسنت کے دن ۲۱۔ جنوری ۱۹۱۷ء کو بڑے تزک و احتشام سے داخل شہر  
ہوئے۔ کسی نے تاریخ بھی ہے

تاریخ مقدس را حتم ز پر دانش گفتا بگو سعادت با صد سعادت آمد  
سند نشینی سے پہلے ہی انگریزوں سے یہ معاہدہ ہو گیا کہ کہیں کو چھین لاکھ کے عوض پندرہ لاکھ سالانہ  
بامداد قسطن مین ویا کریں۔ وزیر علیخان کو ڈیڑھ لاکھ سالانہ رزبٹ کی موافقت ہو چکا ہے۔ بارہ لاکھ روپیہ  
بامداد قسطن مین کو معاوضہ اس زہر باری کے دیا جائے جو اس سند نشینی کے بارے میں اُسکو ہوئی ہے۔ گولڈ  
انگریزی کی اطلاع و منظوری بغیر نہ کسی بیرونی سلطنت سے کوئی رسم و راہ پیدا کی جائے نہ کوئی یورپین ملازم  
رکھا جائے۔ ادا ہاد کا قلعہ کہیں بیٹے اور آٹھ لاکھ روپیہ اُسکی مرمت و درستی کے واسطے نواب دین۔ گپنی نے  
وعدہ کیا کہ اودھ کے واسطے دس ہزار فوج ہر وقت تیار رکھگی۔ اور اگر کبھی تیرہ ہزار سے زیادہ یا آٹھ  
ہزار سے کم رکھنے کی ذہت آئیگی تو اُسکے مصارف گھٹتے بڑھتے رہیں گے۔

سعادت علیخان کی زیر کی وفراست کی وجہ سے وہ لوگ جو آصف الدولہ کی نیاضی۔ چشم مرمت اور دیگر  
کی بروقت زور دین میں بھرے ہوئے۔ دولت و ثروت پاکے خودی سے باہر ہو رہے تھے۔ اب بہت  
ہراسان ہو گئے۔ کاغذی گھوٹے دوڑانے لگے۔ سعادت علیخان بھی ایک ایک کے کچے تھے سے واقف  
تھے اور بھائی کے عدم حکومت کی ابتری و بد نظمی۔ نا اہلو کی ترقی۔ پاکمانو کی کس پسری۔ غال سرکاری کی خیانت  
وید کرداری۔ حکام کی جور و تعدی۔ رعایا کی مظلومی و بیدنی اور زمینداروں قلعہ داروں کی شورہ پشی و نادارندگی  
سے سینے میں ہزاروں داغ رکھتے تھے۔ اور خوب سمجھے ہوئے تھے کہ پرانے پرزے نکالے اور نئے  
لگائے بغیر کام نہ چلیگا۔ جب تک انتظام سے گیند سے پرہیز گا۔ سیاست و ملکداری کے قانون سختی سے نہ  
برتے جائیں گے۔ یہیل منڈھے نہ پڑے گی۔ اودھر پولیس تعلقات میں سلطنت مغلیہ کے روز افزون  
ضعف و انحطاط اور انکوں کی ترقی و اقبال سے جو صورت پیدا ہو گئی تھی اُسکے لحاظ سے بھی یہ بے حد  
ضروری تھا کہ چھوٹے چھوٹے قدم رکھیں اور اپنی پڑوسی سنبھالے ہوئے چلیں۔ انھوں نے سب سے  
پہلے یہی انتظام کیا کہ کہیں کے مطالبات معینہ اوقات پر پورا نہ چلے۔ باقی ساتی کا جھگڑا ہی نہ رکھا  
پھر سال بھر تک اندرونی انتظامات میں ہاتھ نہ لگایا۔ تغیر تبدیل۔ غزل و نصب سب ملتوی رکھا رفتہ رفتہ  
میرزاں دولت اور بدخواہان ریاست کو لیک ایک کر کو روڈ فوجی کیا۔ کسی کو موقع سے اور ہر اہل ہر حال۔ دور

پہنکا۔ کیکوکان پکڑ کے نکالا۔ محاصل ملک پر توجہ کی بہت سی جاگیریں معافیاں جو غیر ستمی اور نااہل لوگوں کو  
 آصف نادور نے محض علوے بہت سے ملے رکھی تھیں ضبط کیں۔ تعلقداروں کی ناخواریاں شاملیں۔ اہل  
 اور ٹھیکے نوٹسے۔ امانی کا بندوبست شروع کیا۔ عمال سرکاری کی کروتوں سے واقف اور مطلع پہنچنے کے  
 واسطے اخبار نویسی کا محکمہ قائم کر کے منتخب درستی لوگوں کو اس کام پر متعین کیا۔ اتفاق یہ کہ اسی زمانہ  
 میں لاہور لڑی صاحب ہندوستان کے گورنر جنرل ہو کے آئے۔ ہندوستان کی پولیس تاریخ میں یکایک  
 نیا دورہ شروع ہوا۔ یہ وہ وقت تھا کہ مرہٹوں اور فرانسسوں کی اولوالعزمیوں اور دھوکے آرائیوں سے  
 انگریزی مقبوضات بھی خدشے اور خطرے کی حالت میں پڑ گئے تھے۔ آدھڑ ماں شاہ کے حملے کی خبریں  
 گڑا گرم آ رہی تھیں۔ ہر خفہ و بیدار خبردار ہو رہا تھا۔ لاہور لڑی صاحب نے نہایت پامردی و استقلال  
 سے اس تمام بلاؤں کا مقابلہ کرنا چاہا اور اپنی قوت کے بڑھانے اور انگریزی اقتدار کے قائم رکھنے بلکہ  
 ایک مستقل اعلیٰ حکومت قائم کرنے پر تمام تر بہت مصروف کر دی۔ انھوں نے نواب پر زور ڈالا کہ تمہارا  
 کے وقت کی جو شترانہ ہزار فوج اودھ میں ہوا اسے گھٹا کے اُسکے بجائے انگریزی فوج کچھ اور بڑھا لیں  
 نواب کو یہ گوارا نہ ہوا۔ قیل و قال شروع ہوئی۔ اس میں بات بڑھ گئی۔ معاملے نے طول کھینچا۔ بے لطفی  
 کی ذبت پہنچی۔ نواب نے آشتیہ ہو کے خلع حکومت کی دھمکی دی۔ مگر وہاں ایسی دھمکیوں سے کیا اثر  
 ہو سکتا تھا۔ مصالح ملکی اور مال اندیشی نے دل فولاد کے بنائے تھے۔ جو تجویز تھی تھیں لکیر تھی کہ دنیا  
 اودھ سے اُدھر ہو جائے وہ نہ منے۔ ذبت باہنجا رسید کہ انگریزی فوجیں اودھ کی طرف بڑھیں بنا  
 و مشاجرات کا دروازہ کھلا ہی چاہتا تھا۔ کہ نواب کی آنکھ ٹھٹھکی۔ مال کا پر نظر لگئی۔ سوچے کہ کھانے سے  
 کام نہ لکھے گا اور شامت آجائیگی۔ اُسی آئینے گلے پڑ گئی۔ آخر کار فوج جیسے سر اسند آخر کی بھرتی  
 تھی بہت کچھ تخفیف میں آئی اور چون لاکھ سالانہ کے صرف سے انگریزی بارہ پانچ سو اودھ میں متعین  
 ہو گئیں۔ اب کہیں کے مطالبات کی میزان ایک کروڑ پینتیس لاکھ سالانہ پر پہنچ گئی۔ لیکن فوج کی تخفیف سے  
 صرف ایک لاکھ پینتیس ہزار کی بچت تھی۔ جب نواب نے اس پر شکوہ و شکایت کا دفتر کھولا۔ اپنی محذوری و مجبوری  
 ظاہر کی تو لاہور لڑی صاحب نے یہ بحث پیش کر دی کہ اگر بطور خود ادائی مطالبات سرکاری کا انعام نہیں  
 ہو سکتا تو نصف حصہ ملک بطور ضمانت تفویض سرکار کہیں کر دیا جائے۔ اور اس میں اس قدر انہماک ظاہر کیا کہ  
 کہ محمد ناس کا سودہ اپنے بھائی ہنری و لڑی کو دیکے گھنڈ بھجوا کہ جائیں اور تکمیل کر لائیں۔ چنانچہ خود کھلی  
 و رشید کے بعد۔ انومبر سالہ کے عہد نامے پر دستخط ہو گئے جسکی رو سے اصلاح رو و سلیکھنہ۔ فرخ آباد  
 میں پوری اٹاوا۔ کانپور۔ فگلا۔ اور آباد۔ اعظم گڑھ۔ بستی۔ اور گودکپور کہیں کے تفویض ہو گئے

اس زمانے میں اس حصہ ملک کی آمدنی ایک کروڑ پینتیس لاکھ تھی۔ لیکن ۱۸۴۶ء تا ۱۸۶۱ء میں اسٹامپ اور آجاری ملائ کے دو کروڑ گیارہ لاکھ ہو گئی تھی۔ اور اب تو تین کروڑ سے زائد ہے۔ اس کارروائی کا ایک اثر یہ ہوا کہ اودھ میں طرف سے انگریزی مقبوضات کے علاقے میں محفوظ ہو گیا۔ اور جو قسطنطنیہ کے تو نیپال کا کوہستانی سلسلہ سدسکن رہی تھا۔ اسی معاہدہ میں یہ بھی طے ہو گیا کہ انگریزی فوج ہیمتھ کے واسطے اودھ سے اٹھ جائے گی اور اسکی بابت فواب کو کچھ نہ دینا پڑے گا۔ البتہ فواب کو اجازت ہے کہ اندرونی انتظام کے واسطے چارلیٹن پیدل فوج کی۔ ایک رجمنٹ پنجپوتھی دو ہزار سوار اور تین سو توپچی گولہ ادازا اپنے ہاں رکھیں۔

فواب سعادت علیاں کو اتنے بڑے حصہ ملک کے نکل جانے سے رنج تو کیوں نہیں ہوا لیکن آنکھ پھٹی پیر گئی سمجھ کے دل کو تسکین نہ ملی۔ کہ بلا سے ملک گیا تو گیا آئے دن کی خبر کیوں نکلیں۔ داتا گھل سے تو نجات ملے گی۔ روز روز کے تقاضے تو نہو گئے۔ اب جس قدر ملک باقی رہا ہے اسی پر قناعت کرنا اسی کے بندوبست میں مصروف رہنا چاہیے۔ چنانچہ اسکے بعد نہایت بیدار مغزی اور معدلت پسندی سے کاروبار ملکی پر متوجہ ہوئے۔ شب و روز کا اکثر حصہ کاغذات کے دیکھنے سنتے۔ اراکین سے مشورہ و استصواب کرنے اور حکم احکام جاری کرانے میں صرف کرتے گئے۔ پرچہ فوہو کی رتی خوب بھلی۔ اخبار نگاروں کی بن آئی۔ میں کیا محال کوئی جھوٹی خبر تو کھلے سعادت علیاں کی فکر مٹا رہا تھا۔ میرنا قلات کی روایتیں حکایتیں بہت مشہور ہیں۔ چنانچہ ایک مورخ کا بیان ہے کہ جب آدھا ملک انگریزوں کے سپرد کر چکے تو رات دن اسی فکر میں ڈوبے پھنسے گئے کہ کسی طرح اسی تملی کرنا چاہیے۔ تلوار کے دھنی۔ تھے کہ کچھ سدا اٹھاتے اور مردان کے جو ہر دکھانے میدان میں آتے۔ سوچتے سوچتے ہی بات نکلی کہ ایک وکیل لندن بھیجا۔ اور کورٹ آف ڈائریکٹرس کے سامنے تمام مقبوضات کمپنی کی ستا جری کا معاملہ پیش کیا۔ وہاں دیکھتے چدیرا ہوئی لیکن یہ شدہ پیش کی گئی کہ اتھارہ کروڑ روپیہ پیشگی داخل ہو جائے۔ چنانچہ نہیں معلوم کس طرح جفا دکھائے، بھر کے سترہ کروڑ روپیہ فواب نے جمع کر لیا۔ ایک کروڑ کی فکر باقی تھی وہ بھی ہو جاتی لیکن۔ رع منت کی کم نصیبی کو نیا دیا کرے۔ موت نے فرصت زدہ کیا۔ سارا منصوبہ خاک میں مل گیا۔ ایک روایت یہ بھی تاریخوں میں لکھی ہے کہ تو اسلی صاحب جو فواب کے بڑے دوست اور مصاحب خاص تھے۔ رخصت لے کے ولایت گئے۔ اُنکو فواب کی ہمدردی و اعانت اور فائدہ رسانی کا بڑا افسانہ تھا۔ اُنھوں نے

ولایت جاکے یہ تجویز ٹھہرائی کہ لاہور ہسٹنگ جو جارج چارم شاہ انگلستان کے بڑے رفیق  
ہیں بسبب افلاس و بے زری تنگدست و پریشان حال ہیں۔ اُنکے ساتھ اگر کچھ سلوک کیا  
جائے تو ضرور کوئی راہ نکل آئے۔ اُنھوں نے نواب کو اُنکے حال پر اختلاف پر متوجہ کیا چنانچہ  
نواب کی دولت سے اُنکا پاپ کٹا۔ و لڈرٹنا۔ وہ اس عا سبب نہ عنایت و مدارات کے بہت  
مشکور اور احساندہ ہوئے۔ اتفاق یہ کہ بعد چند سے وہ ہندوستان کے گورنر جنرل ہوئے اُنکے  
آتے ہی آتے اُنھوں نے نواب کے یہ گوشگزار کر ریا کو میں تو صرف آپ کے معاملات کی درستی  
کے لیے ہندوستان آیا ہوں۔ یہ خوشی سے جاسے میں پھولے نہ سائے۔ اکثر یہی بات زبان  
پر دلائے۔ دوستوں و دشمنوں میں چرچے ہونے لگے۔ آخر۔ کسی بہ خواہ نے موقع پا کے زہر ویلیا  
شب بھر کر بیچھینی رہی۔ دوسرے دن ۲۴۔ رجب روز دو شنبہ ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۲ جولائی  
۱۸۷۳ء کو روح نے قالب خاک کی سے پرواز کیا۔ آہ شدہ گنج سعادت در زمین۔ تاریخ وفات  
ہوئی اور جنت آرام گاہ لقب ملا۔

سعادت علیاں کو ملکی مصلحت سے اگرچہ بہت دنوں تک سید کفایت شعاری سے بہر  
کرنا پڑی پھر بھی لکھنؤ کی زیب و زینت میں اُنھوں نے کوئی کمی نہیں کی۔ اُنکے نام کا گنج اہنگ۔  
آباد ہے۔ اُنکی بنائی اور بنوائی ہوئی کونٹیوں میں سے بھی بعض اب تک موجود ہیں۔ تعمیرات کی میں  
اُنھوں نے بہت کچھ صرف کیا بہت کچھ شہزادوں کو دے کے اُنسے صرف کرایا۔ اُنکے وقت کی  
عمار تین اک سلسلے سے شہر کے شمالی حصے میں دو بنگ چلی گئی تھیں۔ اگرچہ اب اُن میں بہت کم بھی  
حالت ہیں۔ مگر اب بھی اُنکی یاد تازہ کرنے کے واسطے کافی ہیں۔ دلکشا۔ حیات بخش۔ دار الشف  
کنڈ والی کوٹھی۔ نور بخش۔ بادشاہ منزل۔ چینی بازار۔ میز صحن کوٹھی۔ موتی محل۔ دلا رام  
خیر شہید منزل۔ فرح بخش۔ قعر السلطان اور بیلی گار وکی اینٹوں سے اب بھی سعادت علیاں  
کا نام و نشان چلا جاتا ہے۔ محمد باغ کو زمین وسیع سے گھیر کے رمنہ اُنھیں نے بنوایا تھا۔ حضرت عباس  
کی مصنوعی درگاہ کی تعمیر اور ترمیم میں لاکھوں روپیہ اُنھیں نے صرف کیا تھا۔ تال کٹورے کی  
کربلا بھی اُنھیں کے عہد میں بنی اور شہر میں اربعین تک عزاداری کی رسم بھی اُنھیں کے زمانے کی  
مکملی ہوئی ہے۔



## ۴) شاہ زمَن غازی الدین حیدر

یہ نواب سعادت علیاں کے بڑے بیٹے تھے۔ باپ کی عہد حکومت میں کچھ تو فطرتی نقص و ماعنی سے وارفتہ کچھ کثرت منشیات سے مست الست رہتے تھے۔ مدت تک باپ اپنے اور یہ باپ سے آشفۃ و آذردہ رہے۔ دربار کا آنا جانا چھوڑ دیا۔ ایک گوشہ عافیت میں خاموشی اور اطمینان سے بسر کرنے لگے۔ جب باپ کے ”جنت آرمگاہ“ ہونے کی خبر سنی فوراً درویشی پر پھونچے۔ وہاں شمس الدولہ دو سکر بھائی و عیدار ریاست کا نقشہ جانظر آیا۔ لیکن اس کے پونچے ہی ہوا کا رخ بد لگیا۔ بیلی صاحب رزیدنٹ نے انھیں کوسند نشین کر کے پہلے شمس الدولہ سے نذر دلوائی۔ شک بھلی۔ سلامی اُترنے لگی۔ شہر میں مادی ہو گئی۔ سارے قبیضہ طر ہو گئے بہتروں کی اسیدوں تنناؤں پر پانی پھر گیا۔ لیکن اب لوگوں نے نیابت کے واسطے خاک اڑانا شروع کی۔ ہر شخص اپنی اپنی فکر میں پڑ گیا۔ کیسکو یہ خیر نہ تھی یہ ”ہمارے اوج سعادت“ کیسے ”دام“ میں گرفتار کس کے سر پر سیاہ ٹکڑ ہو گا۔ لیکن یہ معاملات تقدیری ہیں۔ اس میں کشش و کوشش بے سود ہوتی ہے۔ اگرچہ بہتیرے قدیم اخدمت جاں نثار موجود تھے اور سب اپنے اپنے حقوق و خدمات پیش کر رہے تھے لیکن غائب کی نظر ایک پر نہ جمی۔ آغا میر سے دل ملا ہوا تھا انھیں پر نگاہ پڑی۔ قلعہ دار نیابت اور اُسی کے ساتھ معتمد الدولہ تمنا رالملک سید محمد خاں ضعیف جنگ خطاب عطا ہوا۔ دو گھڑی میں یہ عروج پایا کہ خاک۔ سے پاک ہو گئے۔ ہر طرف طوطی بولنے لگا۔ غازی الدین حیدر کے عہد حکومت میں بھرتی میاں بھٹی۔ آصف الدولہ کے عہد کا نقشہ چمکیا۔ انکو باپ کے وقت کا پھر اُپر انخرا نہ لکھنے کوئل گیا تھا۔ خوب کھل کھیلے۔ ایک تو خود بہت عالی رکھتے تھے۔ اُسپر نائب ریاست ملے وہ بھی اول درجے کے سیر خیم۔ دونوں نے ملکر عید زپاشی کی۔ لاکھوں کے گھربن گئے۔ مالامال ہو گئے۔ سعادت علیاں کی گار مٹی کمانی کا روپیہ ارباب نشاط پر وقف ہو گیا۔ دولت و ثروت کی اس فراوانی اور ایثار سے لکھنؤ میں لگی کوچو مینا بازار لگ گیا۔ حسینان عالم جمع ہونے لگے۔ حسن پرست بفکروں کے دم قدم سے ہر طرف تازہ چل پھل شروع ہو گئی۔ غازی الدین حیدر کو زمانہ بھی اچھا ملا تھا۔ حکومت پائی تو ہر ایک طرح کے ختمے سے پاک صاف پائی۔ ملک گیری کی بلند صلیکی تو عرصہ ہوا ختم ہو چکی تھی۔ سعادت علیاں کے عہد میں جو افکار جدید و سبب امتداد یا امانۃ قوت کے شروع ہوئے تھے اب وہ بھی

باقی نہ رہے۔ اور ہزار ڈیہنگ کی گورنر جنرل کا لانا آگیا تھا۔ وہ ہر طرح سے اعانت و ہمدردی پر آمادہ تھے۔ سب سامان فارغ البالی کے جمع ہو گئے ان سب پر مستزاد یہ کہ سعادت علیاں کے جمع کیے ہوئے سترہ اٹھارہ کروڑ روپیہ نے نہیں معلوم کتنی بوتلوں کا نشہ پلا دیا کہ نواب نائب بلکہ سارا اور بار ستوالی کو دوں کھا گیا۔ اور متوالا ہو گیا۔ عیش و نشاط کی لئے بڑھی۔ خود فراموشی اور سیہستی کا راج ہو گیا۔ اب نہ کوئی سرکش اور نہ ہندو تعلقداروں زمینداروں کی خبر لینے والا رہا۔ نہ امانی بندوبست کا نگرانی کرنے والا۔ ناظم اور چکے دار پھر لوٹ مار کرنے لگے۔ پرچہ نویس اور اخبار نگار دھمکا دھمکا کے جیب و دامن بھرنے لگے۔ بیگمات شاہی اور اُنکے ادنیٰ ادنیٰ متوسل کو وہ عروج نصیب ہوا کہ جہاں نشان ان سلطنت منہ دیکھ کر رہ رہ گئے۔ جسے کسی محل سے کچھ سلسلہ ملایا۔ بازار حسن کی دلائی کی اُسی کا مرتبہ بند ہو گیا۔ ان باتوں سے دلسوزی اور دیانت سے کام کر نیا لوں کی ہمتیں پست ہو گئیں۔ ساری ترقی کا دار مدار جوڑ توڑ اور سار مش پر آ رہا۔ نہ صلہ خدمت پر کسی کو نظر تھی۔ نہ قدر شناسی اہل کمال کا کسی کو خیال۔ اک عجب عالم بیکری و شادمانی تھا۔ کہ ہر شخص اُسکے مزے لے رہا تھا۔ بننے بگڑنے کیسیک دیر ہی نہ نہ لگتی تھی۔ اُسید و آرزو کا سبز باغ ہر وقت ہر شخص کو شاداں و فرحاں رکھتا تھا۔ جو آج گردش زمانہ سے بگڑ گیا ہو اُسے بھی اُسید لگی ہوئی ہو کہ دو گھڑی میں پھر وہی کارخانے ہو جائیگی القصدہ حاکم و محکوم سب ایک ہی رنگ میں شرابور۔ توئی اور فارغ البالی کی شراب سے مدہوش تھے۔ خیریت اتنی تھی کہ اس اتہری اور بے خبری کے حال میں بھی کچھ منجیدہ اور فہیدہ اشخاص بھی دربار میں پہنچے ہوئے تھے اور وہ بہت کچھ پولیسک معاملات کو سنبھالے اور لیس پوت سے ظاہر و دست کیے رہتے تھے۔ درحقیقت انھیں لوگوں کی بدولت بقا و قیام ریاست تھا۔ ورنہ رئیس کی غفلت اور اہلکاروں کی بدکرداریوں سے جو نہوتا تعجب تھا۔ انہیں سے مفتی فیصل الدین خاں (کا کوری) اور سچان علیاں تاج الدین حسین خاں (دین) سے ہر ایک اپنے زمانے کا افلاطون و جالینوس تھا) زیادہ مزبور و ممتاز تھے۔ انھیں کو معتمد الدولہ کے مزاج میں درخور بھی بہت تھا۔ اور وہ انکی عقلندی و فراست پر اعتماد بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ بہت کچھ دار و مدار اہم معاملات ملکی کا بھی انھیں لوگوں پر تھا۔ انہیں سے مفتی فیصل الدین خاں صاحب کو سرکار انگلشیہ میں بھی بہت رُسخ حاصل تھا۔ اکثر میران کونسل اُنکے باپ قاضی القضاۃ نجم الدین علیاں کے دوست بلکہ احساندہ تھے۔ انھوں نے معتمد الدولہ کو یہ سوچھائی کہ

محکمہ سفارت جعفر خان علامہ کے بعد سے شکست ہو گیا ہے اور سر فو قاع ہونا چاہیے چنانچہ  
 معتمد الدولہ نے انہیں کو یہ کوشش سپرد کی۔ جب انکی سامعی مشکور ہوئیں تو معتمد سرکاری  
 ہونچکی وجہ سے وہی کلکتہ میں سفیر شاہ اودھ مقرر ہوئے۔ یہ ازغیبی سامان ایسے جمع ہو گئے  
 جنسے انگریزی گورنمنٹ سے رابطہ اتحاد و داد اور بھی مضبوط ہو گیا۔ اتفاق یہ کہ اسی زمانے  
 میں لارڈ ہیسٹنگ دہلی گئے وہاں محمد اکبر شاہ کی بعض بے عنوانیوں سے کچھ ایسا رنج ہو چکا کہ  
 آزدہ ہو کے پٹنہ تو یہ دل میں طے کر کے بیٹے کہ اب کوئی جوڑ پھر کانا اور شاہ عالم پناہ کو جھانا  
 چاہیئے۔ چنانچہ مستقل ارادہ کر لیا کہ کہیں کو اب اس ملک میں تاج بخش بننا چاہیئے۔ اب  
 انتخاب ہوئے لگا کہ کون اس منصب کے شایاں ہے۔ سب سے پہلے اودھ پر نظر  
 پڑی۔ لیکن یہ مسئلہ نازک تھا۔ طرح طرح کی وقتیں۔ شکلیں ایسی حاصل تھیں کہ بے محابا یہ سخن  
 نہ زبان پر آ سکتا تھا۔ نہ تحریر میں لا سکتے تھے۔ مفتی خلیل الدین صاحب کو اسکی گن گن مل گئی۔ انکو  
 تو اپنے آقا کی عزت افزائی و سرمدی کے ایسے موقع کے ہاتھ لگنے کی تلاش ہی تھی فوراً معتمد الدولہ  
 کو خبر کی۔ چنانچہ یہاں سے گورنر جنرل پاس تحریر پہونچی۔ استعدوا با پوچھا گیا کہ اگر ہم برس  
 خود بادشاہی کا خطاب لیں۔ تاج و تخت کے مالک بنیں۔ اپنا سکہ جاری کریں تو کبھی کیس طرح خطر ہلکا  
 تو نہ ہوگی۔ گورنر جنرل نے کورٹ آف ڈائریکٹرس سے پوچھا۔ وہاں سے جواب ملا کہ انہیں اختیار  
 ہے جو چاہیں کریں۔ کرسکیور خضہ انداز ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ چنانچہ ۱۸۶۳ء ذی الحجہ ۱۲۸۲ھ روز  
 شنبہ مطابق ۱۲ جمادی الثانی کو اب غازی الدین حیدر تخت نشین ہوئے۔ ابوالمظفر محمد الدین شاہ زمیں  
 غازی الدین حیدر بادشاہ غازی خطاب ٹھہرا۔ ایک کرد روپیہ میں تخت و تاج۔ سامان شاہی و  
 اسباب جلوس مرتب ہو گیا۔ جشن ہونے لگے۔ شادیاں بچنے لگے۔ معتمد الدولہ کو بھی وزیر اعظم کا خطاب مل گیا  
 شیخ امام بخش تارخ نے تاریخ لکھی "شہ اسکندر وزیر اسطاطلیس" اگرچہ واقع کار جانے پہنچنے کس  
 حد تک شاہ اسکندر گیتی ستان تھے اور وزیر اسطاطلے دوران۔ لیکن شاعرانہ نظر سے یہ بھی "ضرورت  
 بود و بادشاہ" البتہ دونوںکی فیاضی وسیع بخشی۔ جو دو سخا کی جسد تعریف کیجائے بجا ہے۔ بادشاہ تو خیر  
 بادشاہ ہی تھے۔ معتمد الدولہ کی ہمت عالی اور فقار پروری سے جو زیارے کرم خوش میں آیا تھا  
 اُس سے ہزاروں ششہ کام سیراب ہو گئے۔ ایک سیر مندہ علیصاحب نے سٹوکی میں گیارہ  
 برس رفاقت کی۔ چودہ لاکھ لکایا اُترایا۔ محمد خاں خدنگار نے نو مہینے کی خدمت کے صلے میں چالیس ہزار  
 روپیہ کمشت پایا۔ اسی طرح لاکھوں روپیہ رفیق نفا کو ضرورت کے وقت دیا۔ ہزار ہا روپیہ کے شالی

دو شاہے معمولی خدمتگزاروں کو بٹے۔ بیٹے کی شادی اس دھوم دھام تزئین و آرائش سے کی کہ لاکھوں روپیہ صرفت کر ڈالا۔ اوتنے یہ ہے کہ اس شادی میں مدارِ حقہ (جو ایک بیٹے کو ملتا ہے) پندرہ ہزار روپیہ کا صرف ہوا۔ روشن الدولہ سمجھی نے شربت پلائی کے وقت ذاب کی ہمت عالی کو آزمانا چاہا۔ انھوں نے فرمایا کہ ”ہم نے سولہ لاکھ روپیہ جو تمھاری نظامت میں باقی ہیں اس شربت پلائی میں دیے“ طرہ یہ کہ جب بادشاہ کو پرچہ گزارا انھوں نے وزیر سے پوچھا۔ عرض کی ”محضور۔ روشن الدولہ نے اسی پر تفرقت کی۔ اگر کچھ تامل کرتے میں زر تحصیل دوسرے سال کا بھی دیدیتا“ شاہ و وزیر کی اسی سیر چٹھی سے انگریزوں کے بھی بہت کام نکلے۔ چنانچہ جب برہما کی لڑائی چھڑی۔ کپینی کو روپیہ کی ضرورت ہوئی۔ مفتی فلیل الدین خاں نے بادشاہ سے تحریک کی۔ اور ایک کروڑ روپیہ بطور قرض موئے کپینی کو دلا دیا۔ جسکا منافع پانچ لاکھ سالانہ ٹھہرا۔ ورنہ طے ہو گیا کہ ہمیشہ ان اشخاص کو ملا کر لگا۔ جنکے نام دستاویز وثیقہ میں لکھے گئے ہیں۔ اسی طرح جب نیپال سے لڑائی چھڑی تب بھی بادشاہ نے ایک کروڑ روپیہ قرض دیا۔ لیکن اُسے معاوضے میں بھری گڑہ اور ترائی کا ملک کپینی نے بادشاہ کے سپرد کر دیا۔

مفتی فلیل الدین خاں کے شبہ از فکر کے بلند پروازی نے گورنر جنرل اور ممبران کو نسل ہی تک قناعت نہ کی۔ ولایت تک کی خبری۔ انھوں نے بادشاہ کو باخفا لکھا کہ ”اگر آپ سے بادشاہ جم جاہ انگلستان سے راہ و رسم ارسال ہدایا و تحریک محبت نامہ ہو جائے غالب ہے کہ بہت سے مطلب برآی بے منت و لہو دولت ہو سکے گی“ چنانچہ یہاں سے ”ایک سہری طلائی بہت بکھٹ اور لکھنؤ کی مغز کرگھا بنی اور ایک تلوار دلائی جسے ذاب آصف الدولہ نے پچاس ہزار روپیہ کو خریدا تھا اُسکا قبضہ مرہٹوں کا و ذاب کمر بہت بھاری اور بعض اسباب تھمہ اور پٹیلی تلوار جیسے ہزار ہا کا ہوا نصب کیا تھا جس محبت نامہ شاہی باخفا مکتلے بھیجا۔ وہاں سے باخفا مفت تاجران نامی مکتلہ دروہ ولایت ہوا۔ بلا منت بادشاہ تک گزرا۔ اُسے بے منت مکتلہ و بے منت مجھ کے قبول کیا اور جواب محبت نامہ بکمال تہذیب از ذاب و القاب و عبارات شوقیہ عنایت ہوا اور آخر مضمون یہ تھا کہ تم سب طرح سے اپنے ممالک محروسہ میں مالک و مختار ہو۔ اور ایک گھوڑا ولایتی خانہ زادان شاہی سے جسکی قیمت ولایت میں کئی ہزار تھی نہ زین طلائی۔ دامن مغز کرگھا۔ جوڑی تیغ۔ قور کار طلا اور کئی ہندوق ساز طلا۔ اور کئی گھڑیاں مع زنجیر جو اہر نگار مجموعہ مالیت سب لاکھ روپے کی معرفت ذاب گورنر جنرل بسا دے بھیجا گیا“

لیکن افسوس یہ ہے کہ غازی الدین حیدر کی قسمت میں اس جواب باصواب آنے کی سرت سے لطف اٹھانا نہیں لکھا تھا۔ جو وقت یہ ہدیہ ہندوستان میں پہنچا ہے۔ اُس وقت بادشاہ خلد مکان ہو چکے تھے۔ وہ لوگ ہی باقی نہیں رہے تھے۔ جو اسکی قدر شناسی کرتے۔

غازی الدین حیدر کا زمانہ او وہ میں ایک طرح سے سکوں و اطمینان کا زمانہ تھا کہ بیرونی ترخشوں اور چھیڑ چھاڑ سے پاک صاف رہے۔ انگریزوں سے کبھی اس بن نہیں ہوئی۔ بلکہ محبت کے پیگ انگلستان تک بڑھے۔ اسے چاہے نیکدل بادشاہ کی خوش اقبال کی کوہ چاہے فیاض طبیعت و ذریعہ کی حیثیتی دریا دی کا بدلہ سمجھو اور چاہے عاقل و زہین شیروں صلاحکاروں کی حسن تدبیر و فراست پر محمول رکھو۔ بہر صورت رعایا پر ایسا کی خوشحالی و دشارمانی کا دورہ تھا بشر کے باشندے چین سے گھر نہیں پاؤں پھیلا کے سوتے تھے۔ عیش و نشاط۔ سُرد و انبساط کے سوا کسی کو کچھ فکر نہ تھی۔ سونے چاندی۔ مونگے موتی۔ لعل و زمرد کی یہ ریل میں تھی کہ سبکی آکھوں کے پرے پھٹ گئے تھے۔ دولت دنیا کی کچھ حقیقت کیسی نظر نہیں تری تھی۔ بے محنت بے مشقت چھیڑ چھاڑ کے دولت برس رہی تھی قدر کیا ہوتی۔

اس دور حکومت و بادشاہت میں شہر کی تزئین یہاں خود بادشاہ نے بہت کچھ صرف کیا۔ اور معدودہ نے تو آصف الدولہ کا نام روشن کرویا۔ پچاس لاکھ روپیہ لگا کے انھوں نے ایک اماں بارہ بنوایا تھا۔ انھوں نے بھی پچاس لاکھ صرف کر کے کوٹھیں مجلس راؤں کا ایک جنگل بنا کے کھڑا کر دیا۔

غازی الدین حیدر کے وقت کے موتی محل اور شاہ خجف سعادت صلیخاں اور انکی بیوی کا مقبرہ اب تک اچھی حالت میں ہیں۔ باقی شاہ منزل۔ مبارک منزل۔ قدم رسولوں کی عمارتوں کا تو نام و نشان بھی باقی نہیں۔

اسی طرح فرح بخش اور لال بارہ درہی کے درمیان بادشاہ نے ایک نہر بھی نکالی تھی۔ اُسکے واسطے سو لکھ روپے کی قوت کا ایک انجن بنکا یا تھا۔ جسکے ذریعے سے دریا سے پانی نہر میں آتا تھا۔ اب نہر باقی ہے نہر سے پیاس بجھا بیوا لے۔

غازی الدین حیدر پنیٹالیس چھیالیس برس کی عمر میں سنہ ۷۵۰ھ میں فوت ہوئے تھے۔ قوے اچھے تھے۔ آرائش مکان میں خاص سلیقہ رکھتے تھے۔ اور اس باب میں ایجادیں کرتے تھے۔ لیکن بد پرہیز مبت تھے۔ یہی بد پرہیز سی زنگ لانی اسماعیل میں مبتلا ہوئے

اور ایسے مبتلا ہوئے کہ یہی روگ مرض الموت ہو گیا۔ آخر - ۲۶ - ربیع الاول ۱۲۳۳ھ مطابق  
۱۸ - اکتوبر ۱۸۱۵ء کو روح ریاض جنت کو سدھاری قالب فانی کو چھوڑ گئی۔ دوسرے دن اماں با  
نجب اشرف میں دفن کیے گئے۔ کسی نے تاریخ کبھی سے  
گشت تاریخ مصرعہ استادہ لے لیا اور زکوہ خاک شدہ

## (۸) شاہ زماں نصیر الدین حیدر

انکا خطاب بلیاں جاہ تھا۔ غازی الدین حیدر کے بیٹے تھے۔ ۲۲ جمادی الاول  
۱۲۳۵ھ مطابق ۱۸۱۵ء کو سماء بیچ دولت مخاطب بختاب ممتاز محل کے بطن سے پیدا ہوئے  
مغز سنی ہی میں ماں کے آغوش شفقت سے اجل نے محروم کر دیا۔ بادشاہ بیگم صاحبہ نے اپنی  
اولاد بنا کے پالا۔ اُنکے سائے عاطفت میں زمانہ شاہزادی بہ عیش و کامرائی بسر کیا۔ لیکن کچھ  
موجودہ سامان عیش و راحت کچھ آئندہ کی امیدوں نے اتنا سرشار کیا کہ کھل گئیے۔ ایک تو قلعی  
کون۔ تنگ مزاجی۔ ضد۔ زود بخبی۔ دوسرے شان و تعلیم و تربیت۔ ہر بات پر الشد امین ہر  
جوانی کے جوش۔ شباب کی اُمٹگیں۔ ہر وقت کا سرور۔ عاداتیں بگڑنے لگیں۔ بیہودہ شغل شروع  
ہو گئے۔ اُٹھان اچھان اٹھا۔ یہ رنگ دیکھنے بادشاہ بہت کڑھنے اور آرزو رہنے لگے لیکن  
اسیں شاہزادے کی خطا نہ تھی۔ اُنھوں نے آنکھوں کے دیکھا تو یہ دیکھا کہ سارا شہر رنگ  
ریاں منار ہا ہے۔ حاکم اور محکوم۔ راجا اور پر جاسب عیش و عشرت میں پئے ہوئے  
ہیں۔ اُنھیں بھی انداجی سے دید وادید کا لپکا پڑا۔ آنکھ اچھی صورت دیکھنے کی آرزو نہ ہوئی  
تو کان سربہ انداکے سننے کے مشتاق۔ دل چاند سے گھڑے کی روٹائی کے لیے وقف ہوا۔  
تو جان کسی کے اوپر جانے کے واسطے ہر وقت ہتیلی پر رہنے لگی۔ باپ کو قری و فقی سلطنت  
میں دماغ سوزی کرتے ایک دن نہ دیکھا۔ پھر اُنھیں از خود یہ درد سہ خیر نے کا حوصلہ  
کیونکر ہوتا۔ پھر بھی باپ باپ ہی تھے۔ بیٹے کے یہ اطوار کیونکر پسند کرتے۔ اُسپر طرہ یہ ہوا کہ  
غازوں نے موقع پانچے خوب فون مچ لگایا۔ اور باپ کے دل میں بیٹے کی طرف سے دھواڑ اٹھا دی  
بیگم صاحبہ شاہزادے کی سلامتی نہیں وہ بھی متوب ہوئیں۔ اسی کشاکش میں ایک بار صف آرائی  
کی نوبت ہو گئی۔ انگریزی رزیمینٹ نے بیچ بچاؤ کیا۔ آخر۔ شاہزادے کو لے کے  
بسکرم صاحبہ شہر کے باہر ایک باغ میں رہنے لگیں۔ اب میدان خالی پا کے حریفان غار

نے بڑے بڑے جوڑاے۔ شاہزادے کو تاج و تخت کیا معنی۔ سارے زندگانی سے محروم  
کر دینے کی کوشش کی۔ لیکن

چرلے راکہ ایزد بر بندہ وزدہ کے کوہت زندریشش بسوزد  
سب نے منہ کی کھائی۔ ایک کی مراد نہ بر آئی۔ وہ شیخ کا شانہ اقبال عین شباب و اس  
جوانی میں جبکہ دیوانی کے چراناہ سے سارا شہر منور تھا۔ بزم افروز اوان سلطنت ہو گیا  
یعنی بادشاہ کے خلد مکان ہوتے ہی بیگم صاحبہ در دولت پر پہنچ گئیں۔ شاہزادے  
کے سوا اور کوئی دعوے دار سلطنت نہ تھا۔ لہذا انگریزی ریڈنٹ نے فوراً تاج شاہی سر پہ  
رکھ دیا۔ نذرین گزرنے لگیں۔ سلامی کی توپ بجی۔ شادی مبارک کی دھوم مچی۔ ابو الفیہ قطب  
الدین سلیمان جاہ سلطان عادل نو شہیر و ان زمان حضرت شاہ زمان نصیر الدین حیدر  
بادشاہ غازی خطاب ہو گیا۔

نصیر الدین حیدر بادشاہ کے وقت کے کارنامے و رفانہ تحقیق و تفتیہ کے شاہان نہیں  
ان کا دل میں لکھے جائیں تو انظرین کی دیکھو کا بہت اچھا سامان جمع ہو جائے۔ اس لیے ہم چند  
خاص واقعات تاریخی کو قلمبند کر کے اپنے ناظرین کو اس وقت کی ایک سرگزشت سناتے ہیں۔ یہ  
سرگزشت بادشاہ کے ایک یار و یارین مصاحب نے لکھی۔ ہم جتنے کئی برس کے قیام کھنڈ میں یہاں  
ظاہری و باطنی حالات سے اچھی واقفیت حاصل کی تھی۔ اس کے عداقت بیان کا اندازہ ناظرین  
کی آنکھ پر چھوڑ کے اتنا کہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جزیکی اختلافات یا ناموں کے تغیر کے سوا  
اور جہاں تک تحقیق کی گئی اکثر واقعات کی تصدیق تاریخ و روایت سے بخوبی ہوتی ہے۔

نصیر الدین حیدر بادشاہ کی تخت نشینی کا چلاکار نمایاں ہی تھا کہ سامان عیش و راحت کے  
جمع کرنے پر عرق بان بارگاہ معروف و منہک ہو گئے۔ ایک سو کئی عاقلہ ارباب نشاط کے (جو سر آمد  
چکے تھے) ملازم ہو گئے۔ دولاری فیلبانہ (جس کا خطاب ملکہ زمانہ ہوا) کا وفاق عمد و میناق بعدی  
دور دورہ ہوا۔ چھ لاکھ کی جاگیر مقرر ہوئی۔ پھر والٹر کی بیٹی مخا طیب بختاب محضرہ علیا کی باری آئی  
چھ لاکھ کی جاگیر انکو بھی ہو گئی۔ اس کے بعد خورشید محل (جس کا خطاب بعد حیدر تاج محل ہو گا) کا نمبر  
چھ لاکھ کی جاگیر انکی بھی ملی۔ اسی کے ساتھ ہی بادشاہ بیگم صاحبہ کی جاگیر سنوں نو لاکھ کی جو معتدل دور  
نے ضبط کر لیا تھا بحال ہو گئی۔ پھر حبیب بادشاہ نے انگریزوں کو بائیس لاکھ قرض دیا تو اس کے سوا  
سے ملکہ زمانہ کا جوہر ہزار محضرہ علیا اور تاج محل کا جوہر ہزار ماہوار وقفہ ہوا۔ ان سب پر شاہزاد

قدسیہ بیگم کا دور دورہ ہوا۔ جنگی جو دو ستھلاکھوں کیا منے کر دروں پر بندہ تھی۔ کچھ کم چار برس کے عرصہ میں چار کروڑ روپیہ خرچ کیا۔ موت نے جلد خبری در نہ سلطنت نہاگ لگ جاتی۔ ان جاگیرا ت و ثائق کے علاوہ ہر ایک مصاحبات محل کے متولین۔ اعزاء اقربا کے بیش قرار مشاہیر کے سحر و جادو کے چنانچہ شہینہ کو محتاج تھے۔ جنہیں "سفید کپڑے چڑے کی جوتی میسر نہ تھی" بلبل نشیں ہو جو کے نکلنے لگے۔ اللہ اللہ

خانہ تھا گھنٹے کا ہر ایک تھر شہر عشق پڑ گھر گھر تھیں بادشاہیان گھر و دارا تین

ان نو دولتوں کی وجہ سے شہر میں اک طوفان بے تیزی برپا ہو گیا۔ اطہار۔ دولت و ثروت و جہاد و شہرت سے ہو کر و برز میں اک بہار آ گئی۔ امرائے دولت و اعیان سلطنت کے بیٹوس سواروں کے کروڑوں ہر طر ف رونق تازہ پیدا ہو گئی۔ کہیں راہ لگی میں نوبت و تقار و کی سنگ ماہی مراتب کی شوکت و شان سے چشم گوش لذت اٹھاتے۔ کہیں یار و ان بے تکلف کی صحبت میں ناؤ نوش کی آوازوں اور پری پیکروں کی جلوہ نمائی سے دل و دماغ بر عالم سرور و سر خوشی ڈالی ہوتا۔ اقلقہ بے فکری و بے اندازہ و تمدنی سے جو سامان جمع ہو سکتے ہیں سب جمع ہو گئے تھے۔ ہر شخص بجال غمہ شاداں و فرحاں تھا۔ اسکی کسے پروا تھی کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے۔ اور خلقت پر کیا گزر رہی ہے۔ خود بادشاہ سلامت کو تخت پر بیٹھتے ہی بیٹھتے جو خیال ہوا بھی تو اسی قدر کہ کیسے طرح مستعد الدولہ کو معزول بلکہ ذلیل و خوار کر کے کینہ ویرنیہ کا انتقام لینا اور دل کے پھوپھو سے پھوڑنا چاہیے چنانچہ جب دسمبر ۱۸۵۷ء میں لارڈ کوئمبر میر کلاڈرا ٹرچفٹ افواج انخشیہ تشریف فرماے لکھنؤ ہوئے تو انکا واسطہ دے کے صاحب رزیدنٹ کو آمادہ کرایا۔ بالآخر رزیدنٹ صاحب کے ہاتھوں یہ ہم سدا انجام ہو گئی۔ لینے نواب زیر حراست ہو گئے۔ بادشاہ سلامت اب خود مہمات سلطنت پر موجود ہوئے۔ چند روز میں یہ لہر جاتی رہی۔ بد چندے جب اعتماد الدولہ میر فضل علیخان کو منصب وزارت پر سرفراز کیا پھر وہی خود دی وہی رندی سیہ سستی شروع ہو گئی۔ اعتماد الدولہ نے چند روزہ وزارت میں ایک کروڑ روپیہ پایا۔ لیکن دربار کا رنگ بدلا دیکھ کے سب خود داری کنارہ کشی اختیار کی۔ زیادہ تر وجہ یہ ہوئی کہ اسی زمانہ میں بادشاہ کی صحبت میں کچھ یوں لوگ زیادہ داخل ہو گئے تھے۔ جنکے نام مشر بلٹن نے یہ لکھے ہیں۔ ڈی ریسٹ حجام۔ شہر رانٹ معلم۔ شہر مانڈر معصوم و مطرب۔ شہر کر وپی مہتمم کتب خانہ۔ اور کپتان میگیسن۔ انہیں ہڈی ریسٹ بہت زیادہ سنہ لگا تھا۔ ایک روز بھالت مخوری بادشاہ کے سامنے اپنی خودی اپنے حرکات



منخری کر رہا تھا۔ اعمتہ الدولہ بھی موجود تھے۔ بادشاہ نے اُسے کہا کہ تم اس سے ہنسو۔ اُنھوں نے کچھ چھیڑا۔ اُسے جواب سخت دیا۔ بلکہ بگڑی پردہست و رازی کی۔ اُنھوں نے بادشاہ سے شکوہ کیا اور بہت آشفستگی ظاہر کی۔ بادشاہ ٹال گئے اُنھیں کلمات ناملائم کہنے چلے آئے۔ پھر دربار نہ گئے۔ بہت بلائے گئے لیکن اُنھوں نے قدم گھر سے نہ نکالا۔ آخر خود بادشاہ سلامت آشریف لے گئے۔ ورواڑے پر گھر رہے۔ جب وہ گھر سے نکلے تو اپنے ہمراہ خواہی میں جھا کے لائے۔ خلعت کو حکم ہوا لیکن اُنھوں نے بہت سماجت اپنی گلوں میں کراچی۔ وزاٹ چھوڑ کے گوشہ نشینی اختیار کی بعد چند مہر گئے۔

اب نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی کا ستارہ اقبال طلوع ہوا۔ یہ از حد منتظم۔ جزمیں۔ کفایت شعار۔ فریسیں دہو شیار تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ اُنھیں زمانہ اچھا نہ ملا۔ اُنھوں نے انتظامات تو بہت کرنا چاہے۔ لیکن ایک نہ چلا تخفیف اور سخت گیری نے اتنی نفرت بددلی اور برہمی عوام کے قلوب میں پیدا کر دی کہ جس سے ایک دن بھی انتظام کی چول نہ بیٹھی۔ البتہ اُنھوں نے لکھنؤ میں چند کام انگریزوں کے خوش کرنے یا دنیا کو اپنی روشنی خیالی دکھانے کے لیے کیے اور وہ ہو بھی گئے۔ یعنی اول تو ایک دارالشفاء انگریزی اور یونانی علاج کی قائم کی اور اُس کے واسطے چھ لاکھ روپیہ گورنمنٹ کے خزانے میں تفویض کر دیا۔ جسکے منافع سے یہ دونوں اب تک چل رہے ہیں۔ دوسرے لیتھوگراف کا ایک چھاپہ خانہ اشاعت کتب کے واسطے قائم کیا۔ تیسرے لوہے کے پیل کی طبابت شروع کر دی۔ جو تھے لنگہ سے نہر لنگہ نے پر بہت کچھ روپیہ صرف کیا۔ پانچویں ایک محتاج خانہ قائم کیا۔ اُسکے اخراجات کے واسطے بھی کچھ روپیہ کے نوٹ خریدے گئے۔ چھٹے ایک رصد خانہ سلطانی بنوایا۔ نواب منتظم الدولہ ہی کے عہد وزارت میں نواب معتمد الدولہ کے خارج البلد کرنیکا سٹند گورنمنٹ سے یوں طے پا گیا کہ نواب مع اہل و عیال و مال و اسباب رزیدنٹ کی حفاظت میں شہر سے باہر کسی مقام پر علداری سرکار میں جا کے رہیں۔ اُنکی دعاوی کا بھی فیصلہ ہو گیا۔ یعنی بائیس لاکھ روپیہ جو بات ضمانت تنخواہ وغیرہ خزانہ رزیدنٹی میں جمع تھا اور مجموعہ اٹاک جسکی تعمیر میں ایک کروڑ سے زیادہ صرف ہوا تھا اس لاکھ کی محسوب کر کے مجموعہ بیس لاکھ

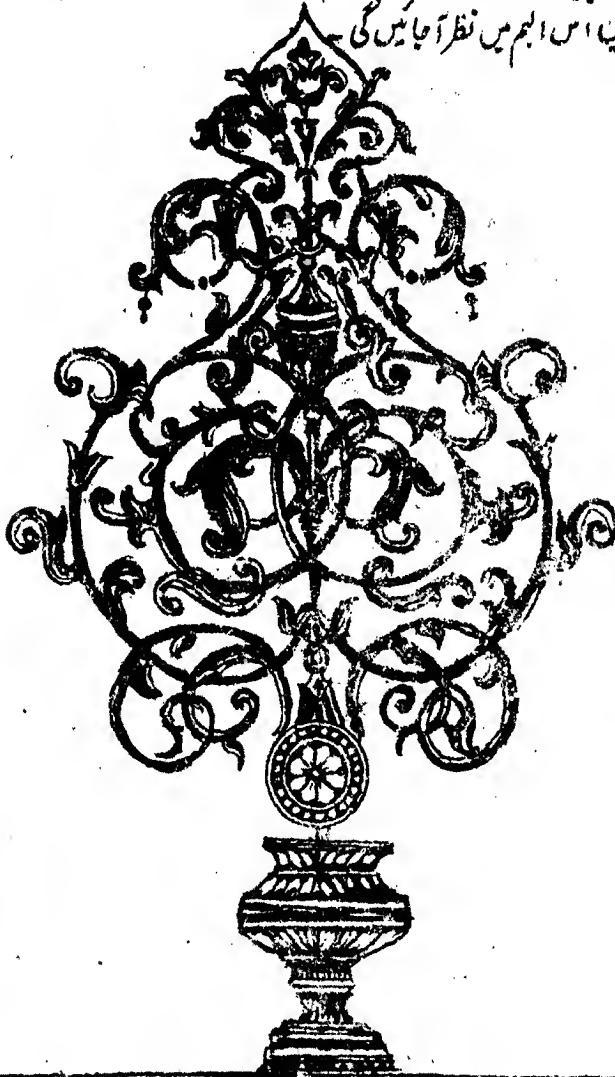
روپیہ دیدیا گیا اور اکتوبر ۱۸۵۷ء میں وہ روانہ کا پور ہو گئے۔ فیصلہ تواریخ کے مصنف نے  
سے تو نواب کی نقد و جنس کا تخمینہ صرف دو کروڑ روپیہ کیا ہے لیکن ہٹن صاحب اپنی کتاب  
میں لکھتے ہیں کہ نواب کا اسباب آٹھ سو چھترہ سو اور بے شمار اونٹوں ہاتھیوں پر بارہو کے  
کانپور گیا۔ جسکی قیمت تخمینہ چھپس لاکھ روپیہ تھی۔ اصل حال خدا جانے۔ اتنا ضرور ہے کہ  
معتدالہ ولہ کے وقت میں سلطنت کی ساری آمدنی انھیں کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ بادشاہ کو ملانے  
کیواسطے سعادت علیخان کی جمع کی ہوئی دولت کیا کم تھی کہ وہ حساب لیتے۔

نواب منتظم الدولہ کی غیر ہر دلفریبی عوام کے احاطے سے نکل کے خواص تک پہنچی۔  
حتیٰ کہ صاحب ریڈنٹ سے بھی بے لطفی ہو گئی۔ اور محلات شاہی بھی انکے غور و تمکنت  
سے زچ رہنے لگیں۔ اور وہ بھی بلند پروازی دکھانے لگے۔ یعنی ولیعہد و ولیعہد  
خود بادشاہ سلامت پر آڑی آنے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے معنوب تہ سلطانی ہوئے۔ پھر  
موقوف کر دیے گئے۔ لیکن انھوں نے بھی مدت قلیل میں دولت فراوان جمع کر لی تھی۔  
انکی آمدنی کا حال اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ارون صاحب لکھتے ہیں کہ انکو وزارت  
کی تنخواہ تین لاکھ سالانہ ملتی تھی اور اس کے علاوہ ماہیہ الا حفاظ کی یہ صورت تھی کہ تمام اسطے  
عہدہ داران سلطنت کی تنخواہوں میں سے ایک اربع وضع ہو کے انھیں ملت تھا جس کی  
میزان تخمیناً سترہ لاکھ سالانہ ہوتی تھی۔ یعنی کل بیس لاکھ سالانہ آمدنی تھی اور پھر اس کے  
علاوہ جو متفرق رقوم ملتے تھے اور وقتاً فوقتاً جو عطایاے شاہی ہوتے تھے انکا کوئی حصہ  
نہ تھا۔

نواب منتظم الدولہ کے بعد نواب روشن الدولہ وزارت پر سرفراز ہوئے۔ یہ  
معتدالہ ولہ کی رفاقت کے جرم میں پیشتر معنوب تھے۔ اور اب ان کی معزوفی کے سبب  
انکی بد اوقات بھی شکیں ہوتی تھی۔ لیکن منتظم الدولہ کے بعد انھیں کا ستارہ چمک گیا۔  
اور اس منصب جلیلہ پر سرفراز ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ یہ صاحب ریڈنٹ کی نذر کو گئے  
تو انھوں نے کمال درود دل سے کہہ دیا کہ ”ہیں تعجب ہے۔ کہ تیرے وزیر اے ماضیہ کا  
حال بخوبی دیکھا ہو۔ پھر بھی دیدہ و دانستہ اس عہدہ مستعار کو اختیار کیا؟“ نواب  
نے عرض کی کہ ”مرتا کیا نہ کرتا۔ اب یہ حال فائدہ نشینی میں مد سے گزر چکا تھا۔ نہ سرکار سے  
کچھ مقرر تھا۔ نہ مال دنیا میرے پاس رہا تھا۔ اور نہ کسی سے قرض مل سکتا تھا۔ بہر صورت

سامنا موت کا تھا۔ میں نے اس خیال سے اختیار کیا کہ اب فواب وزیر اعظم مشہور ہو کے  
مرے تو بہتر ہے۔“

معزز ناظرین۔ میں اب اس داستان کو ہیں پختہ کرتا ہوں اور آپ کو اس  
عہد حکومت کے بقیہ حالات بادشاہ کے ایک یورپین معاصی کی زبان سے سنواؤں گا  
امید تو ہے کہ وہ رام کھانی سننے آپ کے دل میں اس وقت کی لکھنؤ کی حالت کا  
صحیح تصور پیدا ہو جائے گا۔ اور آپ کو نصیر الدین حیدر اور اُن کے درباریوں کی تباہی و آدم  
تصویریں اس اہم میں نظر آجائیں گی۔



# بسم اللہ الرحمن الرحیم

## دیباچہ طبع اول

از

(یکے از ملازمان خانگی)

مندرجہ ذیل ایک روئے ادبی صلی واقعات کی اور کسی حالت میں قرخی و خیالی نہیں تین سائے تین برس جب میں لکھنؤ کے دربار شاہی میں رہا تھا تو میں واقعات روزمرہ کو بطور یادداشت یاد کیا رہا تھا۔ اور انہیں یادداشتوں سے یہ کتاب ترتیب دی گئی ہے۔

عارضہ ہو کہ نصیر الدین حیدر اپنے ابا و اجداد کے شریک قسمت ہو کر پیوند خاک ہو گئے ہیں۔ اور اُنکے دربار میں جو باشندگان یورپ بطور ملازمان خاص تھے انہیں سے خاص لوگ ابھی زندہ و سلا ہیں اور انگلستان میں موجود ہیں۔ میں نے نہ اُنکے نام ظاہر کیے ہیں نہ اپنا نام ظاہر کرتا ہوں۔ کیونکہ اگر میں ظاہر بھی کر دیتا تو پبلک کو زیادہ فائدہ نہوتا۔ لیکن اگر میرے بیانات کی صداقت میں کچھ چوں و چرگائی یا اگر نام کا اظہار روئے مادہ کے مکمل کرنے کے واسطے ضروری سمجھا گیا تو مجھے اُنکے ظاہر کر دینے کچھ تامل نہوگا۔

میرے واسطے یہ آسان تھا کہ اپنے قیام لکھنؤ کی سرگزشت میں اپنے دلیرانہ کارناموں کا تذکرہ کھانا لیکن میں نے صرف اظہار حقیقت پر قناعت کی جو اور میری تا ستر کوشش یہ رہی ہے کہ دربار لکھنؤ کی اندرونی کیفیت جو چشم خود دیکھی ہو اُسی کو تحریر کروں۔ وہاں بہت سے نادروں و وزگاران تھے۔ وہاں کے طرز معاشرت میں بہت سے خوفناک امور تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے بہتر سے منظر منظر پیش ہوئے جنکو بعض اشخاص کی پاس خاطر سے میں نے قلم انداز ہی کرنا مناسب سمجھا۔ لیکن ناظرین جو کچھ اس کتاب میں ملاحظہ فرمائیں گے وہ سب مبالغے سے پاک ہے۔

یہ کوئی راز مہربتہ نہیں ہے کہ آسمان کے نیچے اودھ سے زیادہ کسی ملک کا نظم و نسق اتنے نہیں اور اس بات کو شخص سیر کرے گا کہ اگر ہندوستان کی گورنمنٹ اُسکے ساتھ وہی برتاؤ کرے گی جو اپنے نہایت خوبی کے ساتھ پنجاب سے کیا ہے تو یہ اُسکے متعدد باشندگان کے حق میں ایک رحمت و برکت ہوگی۔ میں نے کوئی پیشگی یادداشت نہیں لکھی ہے۔ صرف ایک سیدی سادی سرگزشت ہے اور اسیدو جو وہاں کی اندرونی اور ملکی حالت کا جو کہیں کہیں اتفاقاً ذکر آ گیا ہے وہ محض سبیل تذکرہ ہے۔





# شباب لکھنؤ

## باب اول

دربار شاہی میں رسائی

میں برس سے زائد عرصہ گزرا کہ میں ایک نئی کام سے اول مرتبہ دار و لکھنؤ ہوا تھا۔ اس وقت نصیر الدین حیدر خان و جانشین غازی الدین حیدر بادشاہ فرمانرواے سلطنت اودھ تھے۔ میں نے زمانہ قیام کلکتہ میں لکھنؤ کی زالی ادا کی اور بادشاہ اودھ کی عیالستانیں سنی تھیں یعنی وہاں ایک عظیم الشان قوش خانہ بادشاہ نے فراہم کیا ہے یہ کہ بادشاہ اُن باشندگان یورپ کی جو کمپنی کے ملازم نہیں ہیں زیادہ قدر کرتے ہیں۔ یہ کہ باشندگان اودھ کو خاص قدرتی مذاق مبارزت ہو اور یہ کہ لکھنؤ کے گلی کوچوں میں بہت سے عیب صورت لوگ ڈھال، تلوار، بندوق اور سیٹول سے مسلح نظر آتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اگرچہ میں نے اس قسم کے حالات تو اتر سے سنے تھے۔ تاہم چونکہ کئی موقعوں پر مجھے ناکامی ہو چکی تھی اس لیے اب بھی مجھے ناکامی ہی کا خیال پیش نظر تھا۔ لیکن اس مرتبہ مجھے تمام امور کا یقین کامل ہو گیا۔ کیونکہ یہاں میں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ میرے وہم و خیال سے بھی زیادہ تھا۔ اول بول تو مجھے ایران شاہی دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کیونکہ یہ عمارت فی الحقیقت ایک محل نہ تھا بلکہ گنجینہ عمارت و قلعہ تھا جس کا سلسلہ دریاے گومتی کے کنارے کنارے (میں لکھنؤ آباد ہے) دور تک

چلا گیا۔ محل شاہی اور محل کا بیٹہ وہی نقشہ تھا جیسا کہ محلات شاہی قسطنطنیہ یا ایوان شاہ ایران اقدہ ایلان یا عمارات شاہی پکین کاٹنا جاتا ہے۔ کیونکہ کل مشرقی سلطنتوں میں محلات شاہی جو دار السلطنت میں آگے تھے ہیں محض بادشاہ کے قیام گاہ نہیں ہوتے بلکہ حکومت کے تمام کارخانے وہیں ہوتے ہیں۔ ایک چوٹا سا شہر ہوتا ہے۔ اور ان میں ایک سلسلہ محلات ہوتا ہے جن میں حرم شاہی اور ان کے ختم و ختم اور متعلقین و لواحقین ہوتے ہیں۔ پھر باغ و باغچہ تالاب ضیعیں فواریں اور آبشار چوک اور چوڑے بازار۔ خاص خاص وزرائے سلطنت اور اعلیٰ حکام ملکی کے مکانات بھی ان میں ہوتے ہیں۔ یہی حالت بجنہ لکھنؤ میں تھی ایک ماہ نامہ دریائے گومتی کے (جسکا عرض لندن کی ایک متوسط درجے کی سڑک سے زیادہ ہوگا) سلسلہ عمارات شاہی چلا گیا تھا اور دوسری جانب سیاح رہتے تھے جس میں شاہی خوش خانہ تھا اور ان میں اس قدر تعداد کتبہ اور مختلف اقسام کے جانور تھے جسکا اندازہ کرنا ممکن تھا۔ بعد ازاں تھی اور گنبد تیتھے۔ پتیل۔ پارسی۔ ہرن۔ ایرانی بلایاں۔ چینی کتے کچھ کھلے بندوں کچھ کتہ و نہیں بنا۔ اس رسمہ سبز و زرد کی اس طرح ہوا کھار ہے تھے جیسے انگلستان کے کسی مرغزار میں گائے بھیروں کے گھٹے اگرچہ قدر شاہی جو فرج بخش کے نام سے موسوم ہے اسکا بیرونی حصہ زیادہ دہشتان و تنگہ نہیں۔ لیکن اسکی وسعت و طوالت کی درباری نے اسکی صنعت تعمیر اور شوکت سے زیادہ مجھے حیرت کر دیا۔ کیونکہ مجھے زیادہ تر یہی خیال تھا کہ ان میں بہت کچھ کاریگری صرف کی گئی ہوگی اور بہت کچھ غنیمت و شان ہوگا۔ لکھنؤ کی گلیوں نے بھی مجھے ناامید نہیں کیا۔ محلات کے گرد کی گلیوں پر شبیمیر صاحب نے درمیان کی چھٹی بنی ہوئی اور دوسرے ساجوں نے لکھنؤ کو ماسکو سے شاہ بلا یا ہوگو میں نے ان دونوں مقامات کو نہیں دیکھا جو گریس کے خیال میں یہ تعلقات ٹھیک نہیں ہوگی۔ صرف ایک عظیم شان شہر ہے جس سے دیکھا ہے البتہ میرے نزدیک لکھنؤ کے نشیبی حصہ سے تنگ و تاریکیوں۔ نہ سے پھندے اور تنگ و تاریکیوں۔ گنجان بازاروں سے مشابہ ہیں۔ اور وہ شہر قاہرہ دار السلطنت مصر اور ڈریسڈن ماسکو۔ تاتار۔ جس سے چاہیے آپ لکھنؤ کو شاہ قراویہ بھیجے۔ گریس کے نزدیک لکھنؤ کی ایسی عجائب روزگار ہیں ان مقامات میں سے کہیں نظریہ آئیں گی۔ اولاً لکھنؤ کے ایسے ہتھیار بند آدمی ان شہروں میں کہیں نہ دکھائی دینگے ماسکو کے باشندے صرف چھری باندھتے ہیں۔ اور قاہرہ کے لوگوں کے ہاتھ میں کچھ ہتھیار کبھی کبھی دکھائی

۱۔ دار السلطنت چین۔

۲۔ دار السلطنت سیکنی شفا دار سلطنت جرمنی۔

۳۔ دار السلطنت قدیم روس۔

دیتے ہیں برہمنان اسکے لکھنڈ کے باشندے بالعموم اوچی بنے نظر آئیں گے انکے پاس دھمال۔ تلوار اور بندوق یا پستول ضرور ہونگی۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جو کاروبار روزمرہ کرتے ہیں وہ بھی تلوار تو ضرور باندھتے ہیں اور کچھ گروہ حضرات جب شہر گشت کو نکلتے ہیں تو چاہے کسی ہی ذیل پوشاک کیوں نہ پہننے ہوں مگر پیچھے کی جوزی اور دھمال دونوں لگائے ہوتے۔ جھینے کی کھال سے منڈھی ہوئی دھال جیسے پیل کے پھول لگے ہوتے ہیں اکثر بائیں جانب کا منڈھے پر پڑی ہوتی ہے۔ بڑی بڑی موچھوں والے سپر صورت راجپوت اور چھان اور سیاہ داڑھی والے مسلمان دھمال تلوار سے لیس تھے برہمن نظر آتے ہیں اور اہل لکھنؤ کی پندار خودی و خود پسندی اور جوش نبرد آزمانی کو بخوبی عیاں کرتے ہیں۔ یہ امر کہ کیوں اہل لکھنؤ بالعموم سپاہیانہ وضع رکھتے ہیں تعجب خیز نہیں ہو سکتا اسلئے کہ کہنی کے فوجی سیغے میں اودھ ہی کے پرورش یافتہ بکثرت ہوتے ہیں اور احاطہ بنگالہ کی فوج تا سترہیں کے باشندوں سے ملو ہے انہیں لکھنؤ میں اچھا مذاق چھینے ہی سے پیدا کیا جاتا ہے۔ تیر اور برہمنے یہاں کے لوگوں کے جموں کھلوئے ہیں اور سطر جہانگیر بنی دانیال بالعموم بچے کے ہاتھوں میں جھنڈے ویدی ہیں اسی طرح وہاں چھوٹے چھوٹے پیچھے اور کاٹھ کی تلواریں کھیلنے کو پکڑا دی جاتی ہیں۔ اس شہر کے گلی کوچے سیری نظر نہیں بالکل انوکھے معلوم ہوئے۔ گویا کہ عالم رویا میں میرا گزر دھنڈ کسی ایسے عجیب ملک میں ہوا ہے جہاں کے خاص عام ہیلوان ہی پیدا ہوتے ہیں۔ جنکے بشرے سے جنگلی ٹیکتی ہے۔ اور جسکا تذکرہ میں نے رکھن میں قصوں اور کہانیوں کی کتابوں میں پڑھا تھا۔ اسکو یا قاہرہ میں باقی بطور جانوران باربرداری کام دیتے نظر نہیں آئیں گے۔ یہ سب کہ پتلی پتلی گلیوں میں ایسے بھاری بھر کم جانوروں کے چلنے سے زیادہ کوئی چیز بے شکل اور بے بوڑ اور ٹھنک نہیں معلوم ہوتی جس طرح ہر قباہرہ میں اونٹ اسباب سے لدے ہوئے دونوں جانب شیطیلے ڈالے تمام گلی کو روک دیتے ہیں اسی طرح وہاں باقی راہ بند کر دیتے ہیں۔ لکھنؤ میں باقی اور اونٹ سادی طور سے عام ہیں شہر کے نشیبی اور کثیف حصے میں جہاں بازار واقع ہیں وہاں گھوٹے بہت شاذ و نادر دکھائی دیتے ہیں۔ البتہ باقی اور اونٹ بہت نظر آتے ہیں۔ ایک تملک میرا یہ حال رہا کہ جب کبھی ان تنگ گلیوں میں ہاتھ دوں اور اونٹوں کو اس طرح لدا پھندا اور راستہ روک دیکھتا تھا تو بے اختیار میرا جی تھمتھ مارنے کو چاہتا تھا اگرچہ وہاں دیر تک کھڑے رہنے کی وجہ سے میری اپنی حفاظت میں دھڑکا پیدا ہو جاتا تھا۔ یہاں ہندو مسلمان باشتناؤ اسکے کہ ایک ہی قسم کے ہتھیار باندھتے ہیں اور طور پر ایک دوسرے سے بہت متاثر ہیں۔ لکھنؤ کی آبادی تین لاکھ ہے جیسے دہشت ہندو ہیں مگر اکثر پنج قوم کے بقیہ باشندے مسلمان ہیں اور انھیں کا شمار طبقہ امر و اعلا میں ہے



کیونکہ یہاں حکومت انھیں کے ہاتھ نہیں ہے۔ چونکہ اکثر لوگ اس ملک سے ناواقف ہو گئے جسکا دار الحکومت  
کھنڈ ہے۔ اسلئے چند طاہرین انکو حقیقت ملک سے مطلع کرونا قرین مصلحت معلوم ہوتا ہے۔ یہ کہ ایک قسم کی چٹنی  
ہو جو شاہ اودھ کی بٹنی کھلاتی ہو، اور یہ کہ شاہ اودھ بہت گراں ڈیل ہو اور اسکا انداز بھرتا ہو، یہ دونوں  
باتیں لندن کے بازار وینس بہت زبان زد ہیں اور انھیں باتوں کو چارلس آڈنی (واقعہ نگار شاعر) نے خوب  
رنگا ہے۔ جب صدی گزشتہ کے خاتمہ پر لارڈ ولزلی صاحب گورنر جنرل ہو کر ہندوستان میں وارد ہوئے  
اس زمانہ میں ملک اودھ وسعت میں انگلستان سے زیادہ تھا۔ اور ایک صوبہ سلطنت علیہ ظلیہ کا تھا۔  
اور اسکا فرمانروا نواب وزیر کے لقب سے لقب تھا۔ وارن ہیسنگ نواب نے نواب وزیر اودھ کو خاندان  
کی دو بیگموں کو تباہ کر کے اور انکے دور فق خواجہ سراؤں سے تبرا خزانہ چھین کر نواب اودھ کو بانشہگان  
انگلستان سے چند سال اُدھر متعارف کرا دیا تھا۔ کیونکہ برک صاحب نے اپنے محرکۃ الآرا تقریر میں  
وارن ہیسنگ نواب کے اس طرز عمل پر خوب گرج برس کے چھٹا لگی تھی اور یورپ اُلے نواب اودھ  
کو ایک تم رسیدہ شخص تصور کرنے لگے تھے حالانکہ اصل حقیقت یہ تھی کہ نواب اودھ کو اپنے سابق نواب کی  
بیوہ یعنی ہونیکو صاحبہ وغیرہ کی تدبیل سے ستر ہوئی تھی اور خود انکو بچہ گزند نہیں ہو چکا تھا کیونکہ

جب لارڈ ولزلی صاحب ہندوستان میں داخل ہوئے اسوقت (جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں)  
ملک اودھ وسعت میں انگلستان سے زیادہ تھا اور انگریزوں کا سب سے زیادہ وفادار دوست رہا تھا  
لارڈ موصوف نے اس دوستی کے جلد میں ملک اودھ کا نصف حصہ نکال کر احاطہ بنگال میں ملحق کر لیا  
کیونکہ انکے ذہن میں اس سے بہتر کوئی صلہ مکافات نہ معلوم ہوا۔ کہ جس ملک کے بادشاہ نے ان کے  
ساتھ وفا پرستی کا اظہار کیا اسکی رعایا کو اپنی گورنمنٹ کے ماتحت کر لیں۔

مارکوس آف ہیسنگ نے غازی الدین حیدر سے دو کروڑ روپیہ قرض لیا اور اس قرضے کے  
محض میں نواب موصوف کو ایک غیر آباد قطع ملک جو ترائی کا ملک کہلاتا ہے اور بہالیہ کے دامن میں واقع ہے  
اور جسے کہنی نے نیپال سے فتح کر کے پایا تھا دیہا۔ اور اسی کے ساتھ باو شاہی کا لقب بھی عطا ہو گیا  
یعنی بجا سے ہنر پائیس نواب اودھ کے و ہر مجبئی شاہ اودھ سے مخاطب کیے جانے لگے۔ غازی الدین  
راضی برضا ہو گئے یا بظاہر شگنے یہ

ہیں نے یہ واقعات جو بیان کئے ہیں بالکل تاریخی ہیں۔ ایک مضمون خارج پورب ملک اودھ کے استخراج پر  
زور دے رہا ہے لکھتا ہے ”بیشاک وشبہ وارن ہیسنگ لارڈ میناؤتسہ۔ لارڈ ولزلی۔ لارڈ ہیسنگ اور لارڈ

یہ روغن قاز کپینی نے ۱۹۱۸ء میں غازی الدین حیدر کے ملاتھا اور ۱۸۷۲ء میں نصیر الدین حیدر  
 بجائے اپنے باپ کے تخت نشین ہوئے۔ یہ ایک نو عمر آدمی ہیں کیونکہ جب میں نے اُن کو دیکھا تھا اسوقت  
 ان کا سن تیس برس کا تھا۔ اس اندر منہ حالت پر نکلتا دودھ شکل مثلث نیپال سے لیکر دریائے گنگا تک  
 واقع ہو۔ اس ملک کا وسیع شمالی حصہ ملک نیپال سے ہم سرحد ہے۔ باقی جنوب کی جانب بوزاویہ بنا ہو وہ  
 اُس مقام پر ختم ہوا ہے جہاں مقدس گنگا بہہ رہی ہے۔ اور اُس ملک کا نشیبی حصہ دریائے گنگا کے شمال مغرب  
 گوشہ جنوب شرق تک واقع ہو صرف وہی قطع ملک بلند ہے جسے مارکوٹس آف ہینڈنگ صاحب نے براہ عنایت  
 بعد جنگ نیپال بواب کو عطا فرمایا تھا۔ لیکن اس خزانے کے ملک میں اگر آبادی ہو تو وحشی و دندوں کی اور  
 دولت ہے تو گھنے گھیسے جنگل کی۔

باد و دیو کیہ گورنر جنرلوں نے سیکے بعد دیگرے ملک اودھ کو شاہ اب قطاع چین کر اور روپیہ کی فوج  
 کھڑی کر کے بالکل حکومت کر دیا ہوتا ہم اقدیم ملک اودھ کسی حصہ سلطنت جرمنی سے بچر پروشا ویا سٹریا  
 کے آبادی میں بڑے کم نہیں ہے جو وسعت کے لحاظ سے وہ ڈنمارک سے اور اگر بالینڈا اور بلجیئم لائے جائیں  
 یا سٹریٹ لینڈ سکنس اور ورتھم برگ ملے جائیں تو اُن سے بڑا ہے اگر یورپ میں یہ ملک ہوتا تو گنڈر جہ صدر  
 ملک میں ہر ایک سے وہ قائل ہوتا اور نیپس یا یورپ سے بلحاظ وسعت بڑھا چڑھا نکلتا البتہ ایٹا میں  
 یہ کسی شاعر یا شاعر میں نہیں ہے اگرچہ اس کی بابت شور و غلبہ بہت بلند ہے جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں۔ بچے  
 ذاتی شوریات کی وجہ سے لکھنؤ جانا پڑا تھا۔ میں وہاں ایک تجرت آزما سیاح کی طرح نہیں گیا تھا بلکہ ایوان  
 میرا گزروا ہاں ہوا تھا۔ کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب آریہل کپینی (ایٹ انڈیا کپینی) سیاحوں کو نفرت  
 کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ میں نے محض اسی خیال سے کہ دیکھوں ویسی بادشاہوں کی کیا قطع ہوئی ہے  
 (اور کسی خیال سے نہیں) ایک دوست کے درجے سے شاہ اودھ کی حضوری میں بار بار ہونے کی پیش  
 کی۔ جب سے وہی کا خروج و اقبال شاہی اور وہی میں اگلے جاہ و جلال کا صرف ایک خاکہ رہ گیا ہے  
 اسوقت سے ہندوستان میں کوئی ریاست ایسی نہیں ہے جو لکھنؤ سے متول۔ اور شان و شکوہ کے لحاظ  
 سے دوسرے ہمسری کر سکے۔ یہ حکمیری تقریب ملاقات صاحب رزیدنٹ نے نہیں کی اس وجہ سے بادشاہ  
 مجھے بہت اخلاق و مہربانی سے پیش آئے۔ رزیدنٹ ایک انگریزی افسر جناب گورنمنٹ ہند ملک و  
 میں برٹش اغراض کی نگہ رانی اور شاہ اودھ کو باوجود اعتدال پر قائم رکھنے کیلئے متعین رہتا ہے۔ مجھے معلوم

ہندوستان میں صفحہ ۴۴۔ کلکتہ راجی پرائیوٹ پریس میں کیمو پریٹا و پال خزان اودھ سے منظر انجمنوں نے  
 بحیثیت گورنر جنرل کیا۔ (کلکتہ ریویو۔ جلد ۳۰۔ صفحہ ۷۶۔ ۳)

ہوا تھا کہ بادشاہ کے خانگی ملازموں میں ایک جگر خانی ہوا اور اگر میں بادشاہ کی حضور میں باریاب ہوں اور نذر پیش کروں تو نذر قبول ہو جانے پر میں اُس جگہ پر مقرر ہو سکتا ہوں۔

چونکہ کوئی باشندہ یورپ بادشاہ کے سلسلہ ملازمت میں بلا منظوری بلکہ بلا اجازت صاحبِ نڈینٹ مقرر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اسلئے میری دوسری کوشش یہ تھی کہ میں اُنکی منظوری حاصل کروں۔ میری تقرب ملاقات بڑے صاحب سے کی گئی۔ بڑے صاحب جو لندن میں ایک معمولی حیثیت کے آدمی سمجھے جاتے یہاں اُنکے اختیارات ایک بادشاہ اور اُسکی پچاس لاکھ روپایا ایسے نامحدود تھے جو یورپ میں کسی بادشاہ کو بھی حاصل نہیں ہو سکتے۔ غرض کہ بڑے صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ میرے اُنکے درمیان کچھ سلسلہ خط و کتابت کا جاری ہوا۔ اور اس شرط سے اُنھوں نے مجھے اپنی منظوری دی کہ میں اودھ کے ملکی معاملات میں جیتا یا سراجا مطلق دخل نہ دوں نہ کسی طرح کا دخل فہل کروں۔ اور یہ کسی ایسی سازش میں کسی فریق کا شریک یا طرف کش ہوں جو وزیر کے سلطنت کے بارے میں بابت کسی اقتدار کے یا دوزمینداروں کے باہمی منافقات کے بابت ہو۔ پس اسطور پر مجھے بادشاہ کے سلسلہ ملازمت میں داخل ہونے کی اجازت مل گئی۔

جب اس ملازمت کی ابتدائی مراتب طے ہو گئے تب پھر مجھے بادشاہ کی حضور میں بطور رنج کے باریاب ہونے کی نوبت آئی۔ مشرقی بادشاہوں کے سامنے کوئی شخص خالی ہاتھ نہیں جاسکتا۔ ایسی صورت میں نذر و کھانی لازمی ہر حق کہ معمولی درباروں میں بھی نذر و کھانا پڑتی ہے۔ اگرچہ بعد اُسکے بادشاہ کی جانب سے دوسرے پیرایہ میں اُس سے بہت زیادہ خلعت و انعام ہوا ہوتا ہے۔ جب میں پہلی مرتبہ حضور میں باریاب ہوا تھا اُس وقت میں نے اُنکو دربار عام کے بڑے کمرے کے ایک سرے پر تخت نشین کھانا کھانا میں سمجھتا تھا کہ وہ مست پر پلجھی مارے (زانون توڑے) بیٹھے ہونگے۔ لیکن وہ ایک نہری جگہ کافی گہری پر بہت بھاری ہندوستانی پوشاک پہنے اور ایک جواہر نگار تاج جیسے ہمارے پر کا طرحہ لگا تھا سر پر دیے ہوئے جلوہ افروز تھے۔ میری امید کے برخلاف اُنکا اور اُس مکان کی چھاؤں کا اتنا اثر نہ تھا۔ اُس وقت تو میں نے اس تمام ساز و سامان کو صرف سرسری طور سے دیکھا تھا۔ بلکہ بادشاہ سلامت کے چہرے اور خط و خال کو دیکھ بھی نہ سکا تھا۔ لیکن اس دوسری مرتبہ جب میں رنج میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ بادشاہ مع اپنے چند یوروپین ملازمان خانگی کے قصر شاہی کے ایک باغ میں گلگشت فرما رہے ہیں۔ میں ہلکے روش کے کناستے بادشاہ کی تشریف آوری کا منتظر کھڑا ہوا۔ لیکن بادشاہ پریشی رومال رکھتے اُس پر پانچ اشرفیاں دکھائی تھیں اور اُنکے ہاتھ

سے دہانے ہاتھ کو (جسپر دواں اور اشرفیاں تھیں) سنبھالے ہوئے تھا۔ اسی حالت میں بادشاہ کی آمد کا منتظر کھڑا ہو گیا۔ اور یہ میرا پہلا سبق ادب و ادب دربار شاہی کے سیکھنے کا تھا۔ جب اپنے کھڑے ہونے کی اس ادب پر خیال کرتا تھا تو اپنی نگاہ میں آپ بیوقوف معلوم ہوتا تھا۔ یہ میری پی عقدہ دوسری کرسی پر رکھی تھی اور میں ننگے سر تھا۔ مگر تازت آفتاب سے گرمی جو بہت تھی تو میرا یہ حال تھا کہ جب تک بادشاہ سلامت تشریف لائیں لائیں میں سر سے پاؤں تک پسین میں نہا گیا تھا۔ خدا خدا کر کے بادشاہ سلامت مع رفیق رفقا کے تشریف لائے سوقت وہ ایک انگریزی جھٹیلن کا ایسا سا دھبہ ہلکے زریب تن کیے ہوئے تھے اور سر پر لندن کی بنی ہوئی ٹوپی مزید تھی۔ اُنکا چہرہ بشارت تھا۔ جسکی رنگت سچی سیپی کی ایسی تھی۔ اور اُسکے ساتھ ہی سر کے بالوں۔ ٹھیکوں۔ اور موچھوکی کالی کالی رنگت اُنکے رخسار و زہر بہت کھل رہی تھی۔ اُنکھیں چھوٹی۔ چمکیلی۔ اور سیاہ تھیں۔ بدن چھریا۔ اور قد میاں تھا۔ جب وہ نزدیک پہنچے تو اپنے مصاحبوں سے انگریزی بولنے لگے۔ مجھے وہ بات بہت یاد نہیں میں اپنے حال احوال میں مبتلا تھا۔ باؤں پر کیا کان دھرتا۔

بادشاہ قریب پہنچے۔ سکرائے۔ اپنے بائیں ہاتھ کو میرے ہاتھوں کے نیچے رکھکے دہانے ہاتھ کی اٹھکیوں سے میری نذر کی اشرفیوں کو اٹھکوں نے چھوا اور فرمایا۔  
”تئے میری ملازمت منظور کر لی تا“

میں نے عرض کیا ”جی! خداوند“

اسپہ سالار شاہ نے فرمایا کہ ”ہم میں اب خوب گاڑھی چھنی گی۔ کیونکہ میں انگریزوں کو بہت پسند کرتا ہوں“ یہ ارشاد فرما کے بادشاہ نے اپنے مصاحبوں سے پھر گفتگو کا سلسلہ شروع کر دیا۔ اور آگے بڑھتے تب میں بھی ملازمین کے زمرے میں ہو کر اُنکے ہمراہ ہو گیا۔ میرے ایک دوست نے مجھ سے کہا کہ اپنی نذر کی اشرفیاں جیب میں ڈال لو ورنہ کوئی ہندوستانی ملازم لے لیکھا میں نے فوراً اسکی تعمیل کی اور اپنی ٹوپی اُٹھا کر سب کے ہمراہ ایوان شاهی میں داخل ہوا۔ اسراجمی کے کمرے عام طور سے بہت وسیع اور اعلیٰ درجے کے بھارٹو فائوس سے آراستہ تھے۔ بیش قیمت انورس چو کھنوں بہت سی عمدہ عمدہ تصویریں اور مرقعے آویزاں تھے۔ قصہ کوتاہ عجائب صنعت نوادر روزگار کا ایک ذخیرہ تھا۔ جسے دیکھکے بجائے محظوظ ہونیکے آدمی حیران و شذر ہوجاتا تھا۔ جگہ گہنے بھارٹو فائوس۔ صندل اور آبنوس وغیرہ نادر الوجود لکڑیوں اور ہاتھی دانت کی میزیں۔ الماریاں شیش نفیس زرہ بکتر۔ خود۔ اور چار آئینہ کے چوڑ۔ اور جواہرات سے مزین اسلحہ۔ جواہر جوی ہوئی دھاریاں

ہر طرف انھیں چیزوں کی بہتات تھی۔ جنگے دیکھنے سے نظر خیرہ ہوتی تھی۔ اس محل میں صرف کھانے کا کمرہ نہیں بادشاہ اپنے مصاحبین خاص کے ساتھ خاصہ خوش فرماتے تھے بہت سادہ سادہ سجا تھا۔ اور سجاوٹ کی سادگی میں انگریزی کھانا کھانے کے کمروں سے کچھ فرق نہ رکھتا تھا۔

مہینہ بھر میں بادشاہ ایک مرتبہ عام دعوت صبح کے کھانے کی کرتے تھے۔ جس میں فوج کے انگریز افسر چھائی سے (جو شہر سے پانچ میل فاصلے پر دیا گومتی کے دوسرے کنارے واقع تھی) اگر شریک ہوتے تھے۔ اور کبھی کبھی صاحب زرینٹ اور اسکے ہرادی بھی خود ہوا کرتے تھے لیکن ایسے موقع غیر اچھو بڑی رحمت اٹھانا پڑتی تھی چنانچہ اکثر ایسی دعوت کے ختم نام پر میں نے بادشاہ کو یہ کہتے سنا ہے ”الحمد للہ۔ یہ مرحلہ بخیر و خوبی طے ہوا۔ یہ لوگ دور دھات ہوئے۔ اب لاؤ۔ اطمینان سے ایک جام شراب پیئیں۔ اسے معاذ اللہ۔ یہ سب کستہ زخراقات و لغویات ہیں“ یہ کہہ کے بادشاہ یا تو انگریز لیتے تھے یا کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور اپنی مشکل بھاری ہونے پر انا کر کمرے کے دوسرے سرے پر پھینک دیتے تھے۔ پہلے پہل جس شب کو میں ایوان شاہی میں داخل ہوا تھا تو بادشاہ نے اسی رات کو ایک بچ کی دعوت دی تھی جس میں معمولاً پانچ یورپین ملازمان فائلی شریک ہوا کرتے تھے۔ ان میں سے بادشاہ کا برائے نام معلم بھی ہوتا تھا۔ جو انھیں انگریزی پڑھاتا تھا۔ بادشاہ نے بارہا اپنا خیال اس بات پر رجوع کیا کہ دن میں ایک گھنٹہ ضرور انگریزی پڑھنے میں صرف کرتے ہیں کو نہ کہ انگریزی کے ساتھ انگریزی بولنے کا جوشوق تھا۔ لیکن مجبوراً انکو انگریزی تھوڑے دیر میں انگریزوں سے نفیس ملا کر کام کانا پڑتا تھا میں نے کئی مرتبہ بادشاہ کو معلم صاحب کے روبرو اور سامنے بیٹھ کر کتابیں رکھے ہوئے بیٹھے دیکھا ہے۔ اُس وقت وہ فرماتے تھے۔ کہ ”ہاں۔ ماسٹر صاحب اب ہلکوسن ہی پڑھنا چاہیے“

پہلے ماسٹر صاحب ایکسٹریور یا کسی ناول کی تھوڑی عبارت پڑھتے تھے اسکے بعد بادشاہ اسی عبارت کو دوبہراتے تھے۔ پھر ماسٹر صاحب پڑھنے لگتے۔ اور بادشاہ صاحب فرماتے کہ اسے معاذ اللہ! کچھ مشکل ہے! تک مضمون ہے۔ اور پھر جب انکی باری آتی تو انگریزی میں فرماتے کہ ماسٹر صاحب۔ لاؤ جام شراب کا ایک دور ہو جائے۔ شراب پیکر بادشاہ سلامت باتوں میں مصروف ہو جاتے۔ کتابیں پھینک دیتے اور سہی ختم ہو جاتا۔ اس پڑھائی میں کبھی دس منٹ سے زیادہ صرف نہیں ہوتے تھے۔ لیکن اس تعلیم کی تنخواہ ماسٹر صاحب کو پندرہ سو پاؤنڈ (یعنی پندرہ ہزار روپیہ) سالانہ ملتی تھی۔

اُس زمانے میں انگریزی ماسٹر ایک مصاحب شاہ تھا۔ دوسرا مصاحب اٹکالا بھیریں (محافظ لکھنؤ)

نہیں انگریزی ماسٹر ایک صاحب شاہ تھا۔ دوسرا صاحب لگا لکھنوی (محافظ کتب خانہ) جس نے مصوٰر اور موسیقی داں۔ چوتھا کپتان باڈی کارڈ۔ پانچواں انکا انگریزی خاصہ تراش (جام) پنجوں میں ایک راقم الحروف بھی تھا۔ لیکن انہیں سب سے زیادہ سنہ لگا اور سرخڑ صاحب صاحب محلہ شاہ شاہ کے مزاج میں اسکا رسوخ ہندوستانی وزیر اعظم یعنی نواب سے بھی بڑھکے تھا۔ وہ فخر کروا کر حاضر ہو کر گیا جاتا تھا۔ اس لیے سب لوگ اُسکی دربار داری کیا کرتے تھے۔ اگر اُسکی سوا انھری حکم و کاست اور نیک نیتی سے کھی جائے تو کتاب فطرت میں انسانی زندگی کا ایک عجیب باب صاف نہ ہو۔ جگہ جگہ ظلم ہے اُسے ذیل میں لکھتا ہوں۔

یہ شخص ملک میں ایک جہاز کا سیٹ مقرر ہو کے وارد ہوا تھا۔ کلکتہ پہونچا بہتر ملک ملازمت جہاز اپنے اپنا قدی پیشہ جمائی جسکی تعلیم اسکو بچپن سے لندن میں دی گئی تھی شروع کیا۔ انہیں اسکو بڑی کامیابی ملی اور بہت کچھ وہ نو ویدیا کر گیا۔ آخر کار یورپین سودا گروں کے ساتھ اُسے نشستیں پر مال اسباب بچنے کی غرض سے سفر کرنا اختیار کر لیا اور تاجر بحری مشہور ہو گیا۔ لکھنؤ پہونچا اُسے صاحب رزڈنٹ سے ملاقات ملی (یہ وہ صاحب رزڈنٹ نہ تھے جو میرے عہد میں تھے) صاحب رزڈنٹ کو بتا دیا کہ وہ اپنے بال دوست کرائس اور نوک پلک سے بھل گرو جو ان بچائیں۔ جام کو اُنکی اس فرمائش کی بجا آوری میں کب تامل ہو سکتا تھا۔ اُسے اس کینڈے سے رزڈنٹ صاحب کے بال بنائے سنوائے کہ گویا کاپالٹ کر دی بڑے صاحب نے خوشی میں اکر اُسکی تقریب بادشاہ سے کر دی۔ یہ رزڈنٹ صاحب اب لاٹ میں ہیں اور اپنے نام کے ساتھ ایم۔ پی۔ ایمبریارلمنٹ) تحریر کرتے ہیں۔ بادشاہ کے سر کے بال بھی سید سے پاٹ تھے اور گھونگر کیا معنی کبھی ذرا اسی لہر بھی نہیں پیدا ہوتی تھی۔ جام صاحب نے اس میں حیرت انگیز نتیجہ و خم پیدا کر دیے جس سے بادشاہ بہت محفوظ ہوئے۔ اور اعزاز و انعام کی پوچھا شروع ہو گئی۔ سرسرا خاں کا خطاب بادشاہ نے مرحمت فرمایا۔ باشندگان اودھ کے سرسرا کے آگے بچھکنے لگے۔ اب وہ شخص جو ایک زمانے میں جہاز کا سیٹ تھا بڑا آدمی ہو گیا اور چاروں طرف سے دولت کا سینا سپر رہنے لگا۔ دینی سلفوں میں مقربان شاہی کو اس پر فحاشے کچھ در نہیں لگتی۔ علاوہ رشوت ستانی کے اس خاصہ تراش کو لے انگریزی میں صفت نے "باربر" کا لفظ لکھا ہے۔ جسکے معنی ہیں جام۔ مگر اُسکے خدمات کے لحاظ سے بچنے خاصہ تراش کا لقب دیا ہے۔

سے ہی نہیں اسب بچہ بھی مالی ہے۔

بہت سے اور بھی ہوتے فائدہ اٹھانیکے اٹھ آگئے تھے۔ مثلاً بادشاہ کی میز پر بمقدار شراب غیر ملکہ  
وہ اُسی کی عورت خرید ہوتی تھی۔ اس ذریعہ سے اُسے ہزار ہا روپیہ پد لگتا۔ سچ کہتے رہا  
ہی چاہے ہمارے یہ دیں

نصیر الدین حیدر نے اس خاصہ تراش کو سید بے انداز اعزاز و اکرام سے گرا نیاں کیا  
اُس پر بہت اعتبار کرنے لگے تھے۔ نوبت بایں تجارت رسید کہ شاہی میز پر وہ روزمرہ کھانا کھانے لگا۔ ہوا  
کی میز پر بادشاہ کے پہلو میں استحقاق بیٹھنے لگا۔ حتیٰ کہ بادشاہ بجز اُسکے کسی کے ہاتھ کی کھول ہر روز  
سے شراب نوش نہیں کرتے تھے۔ بادشاہ پر اپنے اہل خاندان کی نایاب سے زہر ویسے کا، یہ خوف  
طاری تھا کہ ہر شراب کی بوتل پر پہلے خاصہ تراش کے مکان میں ٹھہر لگا دیا جاتی تھی تب صرف کیوں اسے  
شاہی میز پر آتی تھی۔ قبل بوتل کھولنے کے وہ ہمیشہ ہر اور دیگر علامات کا استحسان بخوبی کر لیتا تھا۔ پھر  
تھوڑی آپ چمک لیتا تھا۔ اُسکے بعد گلاس بھر کے بادشاہ کو دیتا تھا۔ یہی بندھاں کا انتظام شاہی میز پر  
اُس وقت بھی جاری تھا جبکہ پہلی مرتبہ مجھے اعزاز شرکت خاصہ نوشی حاصل ہوا تھا۔

اس جام پر شاہی الطاف و عنایات اور اظہار اعتماد کی روایتیں۔ کل ہندوستان اور بالخصوص  
صوبہ بنگال میں زبانزد عام ہو گئی تھیں۔ چنانچہ اس کینہ مرتبت ملازم کی نسبت رسالہ کلکتہ ریویو  
میں برابر مضمون آمیز حیلے۔ ظریفانہ مضامین اور بہت سے جوہر اشعار غرض کہ ہر قسم کے غمے ہوا کرتے تھے  
لیکن اُسکو اپنے روپیہ کمانے کی فکر کے آگے اس بات کی مطلق پروا نہ تھی کہ لوگ اُسے کس طرح یاد  
کرتے ہیں۔ وہ اُسی میں خوش تھا کہ بلا سے مذاق اور تھنھول کی بازی اور لوگ جیت رہے ہیں۔  
وہ تو دولت فراواں جمع کر رہا جو۔ اُس پر سب سے زیادہ مسلسل حملہ کر نوالا۔ ”اگر اخبار“، ”تھارڈ اخبار“  
بعد کو بند ہو گیا، میرے لکھنؤ سے جدا ہونیکے بعد اس خاصہ تراش نے ایک یورپین مٹھی کو کلکتہ کے کسی  
اخبار میں اگر اخبار کے تردیدی مضامین شائع کر نیکیے سو روپیہ ہوا۔ ہر روز کر لیتا تھا۔ اگر اس  
خاصہ تراش کے پاس لندن کے درلوں کی طرح خود اپنے بیچ کا شاعر نہیں تھا تو لندن ٹائمس کی طرح  
اُسکی ملازمت میں ”ہمارا نامہ نگار“ ضرور تھا جب میں شاہی کھانے کی میز پر پہلی مرتبہ پیش کیا گیا اُس وقت  
میری سب سے بڑی دلی تمنا بادشاہ اور اُسکے معاحب خاصہ تراش کے دیکھنے کی تھی۔

میں نے دیگر اسور کے طلبند کرنے میں بہت وقت صرف کیا اب باب آئندہ میں شاہی کھانے  
کی کیفیت تحریر کروں گا۔

## باب دوم

ایک بادشاہ کے مشاغل تفریح

ہم لوگ پشت کے ایک کمرے میں بادشاہ سلامت کے منتظر بیٹھے تھے کہ قبل از بچے کے جو معمولی وقت خاصہ کا ہی بادشاہ سلامت اپنے مصاحب مقرب یعنی خاصہ تراش کے شانے پر سر رکھ کر سوئے ہوئے نمودار ہوئے۔ ان دونوں میں بادشاہ کشیدہ قامت تھے اور ان کا رفیق پشت قد لیکن بہت ہی توانا و متذلل بہن خوب گھٹا ہوا تھا۔ اور وہ اُس کمرے والوں میں معلوم ہوتا تھا جو قد کی کمی کو عوضاً پورا کر لیا کرتے ہیں۔ بادشاہ سلامت سادہ سیاہ انگریزی لباس اُسی قسم کا پہنتے تھے جیسا کہ میں نے اُنکو پہلی بار بلع میں پہنے دیکھا تھا۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ جیسے اُس مرتبہ فراک کوٹ وہ پہنتے تھے۔ اب کی بار بجائے اُس کے ڈریس کوٹ زیب تن تھا۔ وہ معمولی سیاہ و گوند بازو سے اور سیاہ وادشس کا بوٹ پہنتے تھے۔ اُنکے چہرے سے سطوت شاہی نمایاں تھی۔ برعکس اُسکے مصاحب خاص کے چہرے پر کمینہ پن کی قدرتی پٹھکا رہی تھی۔ اگرچہ وہ تو کی پوشاک یکساں تھی۔ لیکن اس ظاہری یکسانیت پر بھی خصائل طبعی کا تفاوت عالم آشکارا تھا کھانے کے کمرے میں جب ہم لوگ جا کے بیٹھے تو عجب سماں نظر آیا۔ مغربی ہالاک کا سامان عیش و عشرت دیسی نمائش کے ساتھ ملا ہوا دکھائی دیا۔ بادشاہ ایک زرمکار کرسی پر جو زمین سے کچھ اونچے پر بھی تھی میز کے بیچ میں ٹھکن تھے۔ اور ہلوگ اُنکے دونوں پہلوؤں پر بٹھائے گئے تھے۔ میز کا دوسرا رخ بالکل خالی تھا کچھ تو اس غرض سے کہ ملازمین کو رکابیاں بنائیں رکھنے اُٹھائیں وقت نہ ہوا اور زیادہ تر اس غرض سے کہ جو کچھ کہیں تماشے اُس شب کیواسطے مخصوص دیا رکھے گئے تھے اُنھیں بادشاہ سلامت باسانی ملاحظہ فرما سکیں۔ ہلوگ اُسکے پیچھے ہی تھے کہ قریب نصف درجن کے اعلیٰ درجے کی حسینہ و جمیلہ خواہیں لبوس زرب تن سیکے ہوئے اُس کمرے کے ایک گوشے سے جہاں گاج کا ایک پردہ پڑا ہوا تھا پار آمد ہوئیں۔ چونکہ میں آگاہ کر دیا گیا تھا کہ ہرگز ہرگز اچھیے یا حیرت کی وجہ سے بھی اُن کی طرف نگاہ نہ جاؤں کیونکہ یہ خواہیں شل مستورات حرم شامی لوگوں کی نظروں سے پوشیدہ خیال کی جاتی ہیں۔ لہذا میں نظر بچاؤ کے کن انکھیں سے اُنکا نظارہ کرتا۔ اور اپنے انداز سے یہی ثابت کرتا رہا کہ مجھے بے مطلق التفات نہیں۔



یہ پریمال عورتیں بہت ہی صورت دار تھیں۔ ہلکا کھل ہوا گلالی رنگ تھا۔ بہت سُرخی نہ تھی۔ کالے کالے گونگہروالے بالوں کی نہیں جنکی چوٹی گندھی ہوئی پشت پر پڑی تھی اور جنین زنا مو بات کی بندش تھی۔ اور مرصع بیس پھول چمک رہے تھے۔ گوشتے گسے چھروں پر یہ سجاوٹ قہر ڈھا رہی تھی۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان رخساروں سے خون چھلک رہا ہے اور شوخی و شکی جھک رہی ہے۔ باریک آب رواں کا دوپٹہ میاں تنگی کے ساتھ سرو پیر ہوا اور شانوں کے نیچے لٹکنا تھا۔ دوپٹہ زری کا کام بنا ہوا تھا۔ اور کپڑے کی بادی کی کے سبب شانوں اور بازوؤں کی سجاوٹ جھلک دکھلا رہی تھی۔ ان عورتوں کے ہاتھوں میں مور کے پرندگی مورچیل تھی۔ اور جب وہ بادشاہ کی پشت پر گس رانی کرتی تھیں تو ان کے آگے بٹھنے اور پیچھے ہٹنے کی ادا غضب تھی۔ پھر مینوں کا آبیار اور ہر جنبش پر کمر کا جھونک اور بھی قیامت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہ پوشیدہ تھا۔ یہ یا جائے۔ سُرخی۔ زرد۔ چمکدار رومی اطلس کے بنے ہوئے تھے۔ اور انہی قطع یہ تھی کہ کمر کو لوں میں پھنسے پھنسے اور آگے بڑھنے کے بد رنج ڈھیلے ہو گئے تھے۔ اور نمٹوں کے پاس سے (جہاں جاکے ایک انبار ہو گیا تھا) اٹھائے کمر میں کھوس لیے گئے تھے۔ اور ان پر ایک زردوزی کام کی ندی پڑی پڑی کسی ہوئی تھی۔ پٹی ہی کے برابر کوئی کی گولٹ بھی باریک وہ پٹے سے اپنا جھکوا دکھا رہی تھی۔ بادشاہ کی پشت پر یہ عورتیں چپ چاپ۔ مٹوب کھڑی ہو گئیں۔ نہ بادشاہ نے اُن سے لہجہ کہا۔ نہ اور لوگوں میں بظاہر کوئی انہی طرف مخاطب ہوا۔ یہی معمولی دستور روزمرہ کے کھانیکے وقت تھا۔ ان عورتوں کے ہاتھ بازو تک برہنہ تھے۔ اور انکا لطیف اسوقت نظر آتا تھا جبکہ دودو باری باری سے بادشاہ کے پس پشت مورچل کرنے میں اپنی نازک کلائیوں کو آہستہ آہستہ حبش دیتی تھیں مگر ہندوستانی عورتوں کو دنیا میں پسینہ پھنسون پر جھانی من میں کچھ ترین جم حاصل ہے تو ان کے اعضا کے تناسب اور سڈول پہنے کی وجہ سے۔ اور ونیش کی تصویر تراشتے وقت اگر کسی نقاش نے کوئی نمونہ پیش نظر رکھا ہو گا تو غالباً انھیں کے شانے اور بازوؤں کا۔ یہ عورتیں نہایت غوشی اور سلیقہ کے ساتھ انیس رانی یا جتہ بردار شاہی کی خدمات اپنی باری باری باضابطہ انجام دیتی تھیں۔ حتیٰ کہ بادشاہ سلاٹ کھانے کی میز پر سے اٹھتے اور خود چلتے یا یہی عورتیں سہارا دیکر انکو محل میں لجاتیں۔

سلطہ واہ حضرت! اتنے میں کلمہ پڑھنے لگے۔ ابھی تپنے دیکھا کیا ہو؟  
 سلطہ یونان کے علم الامنام (ماٹھا بوی) میں حسن کی دیوی کی تھی۔ جسکی تصویر قائم کرنے میں مصوروں نے بڑے کمال دکھائے ہیں۔

کھانے کا سامان ہر طرح پرانگیزی طرز کا تھا۔ اور اس تمام دعوت میں بہت ہی کم فرق کلکتہ کے کسی بڑے گھر کی دعوت سے تھا۔ ہندوستانی خدمتکار ادب۔ قاعدے سے بہت ہی خاموش آتے جاتے اور کام کرتے تھے۔ اور ہلوگ بادشاہ سے بے تحلف بات چیت کر رہے تھے۔ معمولی طریقے سے سوپ (یعنی) پھل یعنی ہوئی رائیں۔ وال۔ چاول۔ سیوہ جات اور تفلیات باری باری ہنر پر پئے جلتے تھے۔ کھانا نہایت نفیس و لذیذ تھا۔ کیونکہ ایک اعلیٰ درجے کا فرانسیسی رکاب دار مبلغ شاہی کا منتم تھا۔ یہ شخص سابق میں بنگال کلب (کلکتہ) کا منتظم رہا تھا۔ برخلاف اسکے انگریزی حجام کی مصاحبت کا دیکھا جاتا ہوا تھا۔ یہ سب نیرنگیاں تقدیر اور اقبال کی ہیں۔

باوجود مسلمان ہونیکے نصیر الدین حیدر کو ذرا بھی شراب سے پرہیز نہ تھا۔ بلکہ اکثر اسرا سے اودھ بھی محتاط نہ تھے۔ اکثر اوقات میں نے خود بادشاہ کو یہ فرمائے تاکہ عام لوگوں کے خیال کے موافق قرآن شریف میں شراب نوشی کی ممانعت نہیں ہے۔ البتہ قرآن شریف میں اسکا بڑا اعتدالی سے پناہ منع آیا ہے۔ میری رائے میں اس معاملے میں بادشاہ کا عمل سہر تھا کہ جب عام لوگوں کو مقدار مناسب تک پیو کی اجازت ہے تو بادشاہ کو بے اعتدالی بھی روا ہے۔ چنانچہ کبھی ایسا دیکھنے میں نہیں آیا کہ بادشاہ میز پر سے دست بلکہ پیچہ مست نہ اٹھے ہوں۔ ہم لوگوں کے سامنے جو شراب آتی تھی وہ معمولاً اعلیٰ درجے کی کارٹ۔ ڈیرا۔ شامپین ہوتی تھی اور جب گرمی تیز پڑنے لگتی تھی تو برف میں لگا کے آتی تھی۔ کہ جس سے اسکا سرور اور بھی بڑھ جاتا تھا۔ کھانیکے بعد دے ناب کا دور پیا پئے چلتا تھا اور بادشاہ مع صحابین خوب بے تحلف اور ہوش ہو جاتے تھے۔ اور اکثر ہلوگوں سے مخاطب ہو کے فرماتے تھے کہ میں ہمیشہ یورپ میں لوگوں کو پسند کرتا ہوں۔ ایسوجہ سے ہندوستانی لوگ مجھے ناراض کرتے ہیں۔ اگر میرے اہالی خاندان کا بس چلے تو مجھے زہرینے میں کوئی دقیقہ اٹھانہ رکھیں۔ لیکن میرا رعب سب پر غالب ہے۔ واللہ۔ وہ لوگ کقدر مجھے تھر تھراتے ہیں۔ خاصہ تراش کتنا۔ کہ بادشاہ سلاست نے اپنا رعب انکے دل پر بٹھا دیا ہے۔ بادشاہ فرماتے کہ ”ہاں واقع میں نے انھیں خوف زدہ کر رکھا ہے۔“ بعد اسکے وہ بائیں جانب ہم لوگوں سے مخاطب ہو کے دریافت فرماتے۔ کیوں جی۔ تم لوگوں نے کھنڈ والوں کو آپس میں لڑتے بھرتے بھی کبھی دیکھا ہے؟ ہلوگ جواب دیتے۔ کہ حضور۔ بارہا۔ تب وہ فرماتے کہ ایک دوسرے کو قتل کرتے بھی دیکھا ہے۔ نہ۔ ہلوگ عرض کرتے کہ اکثر۔ تب بادشاہ بول اٹھتے کہ دیکھو یہ لوگ آپس میں

رشتے بھڑتے سر پہ نکل کرتے ہیں۔ مگر تم لوگوں کو کبھی چھوٹے تک نہیں۔ پہلوگ کہتے کہ حضورؐ کبھی نہیں۔ تب وہ فرماتے ہاں۔ کبھی نہ چھوٹے ہوں گے یہ بدعاش خوب جانتے ہیں کہ اگر وہ تم لوگوں کو بڑی نگاہ سے دیکھیں گے تو میں اُن کو نیست و نابود کر دوں گا۔

بعد اس گفتگو کے عہدہ عہدہ اقسام کے تروتازہ سیوہ جات جو منفقہ عازہ ہی کی فیاضی سے مہیا ہو سکتے ہیں آئے گلے اُس کے بعد شب کے کھیل تماشے شروع ہو جاتے۔ یہ تماشے مختلف قسم کے ہوتے تھے۔ کبھی بازی کرانے کرب دکھلاتے۔ یہ لوگ اپنے بدن کو ہر پہلو سے اس طرح قورٹے مردارتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا اُنکے بدن میں کہیں ہڈی کا وجود نہیں۔ اور سیوہ حرکات میں بندروں پر بھی ہلکتے لیجاتے تھے۔ اور اپنے جسموں کو سخت سخت گراہوں سے بست کچھ جگہ بند کرتے اور آسانی اُن بندشوں سے اس طور پر صاف نکل جاتے تھے کہ دیکھنے والے حیران رہ جاتے تھے اور اگر کوئی شخص اُنکے تماشے پر قہقہہ لگاتا تھا تو وہ بہت خوش ہوتے تھے۔ کبھی کبھی دربار کے سحرے آپس میں لطیف بازی کرتے اور ہلکتے رشتے تھے۔ لیکن اُن کی نقالی اور سحرہ پن میں بدھنڈی اور بچپن زیادہ ہوتا تھا۔ کبھی سپیرے اور جادوگر اپنے کرب اور سانپ بچھووں پر اپنے تفرقہ کے تماشے دکھلاتے تھے۔ کبھی مرغ بازی۔ شیر بازی۔ تیر بازی ہوتی تھی۔ لیکن یہ بازیاں بادشاہ کے سامنے والی میر تھی ہوتی تھیں۔ اور کبھی کھٹ پتی کا تماشہ ہوتا تھا۔ جہیں پتلیاں آدمیوں کی طرح نازکی جنبش پر اُسی طرح خوب ناجتی۔ تھرکتی تھیں۔ جیسے زمانہ حال کے تماشہ گاہوں میں انسان ناچتے تھرتے ہیں۔ اکثر انھیں تماشوں کے ساتھ کمرے کے ایک گوشہ میں عورتوں کا ناچ ہوتا۔ اور انکی سلت میں ہر طرح کا ساز چھڑا رہتا تھا۔

پچھلے دن جب میں شاہی سیر پر کھلے کے واسطے حاضر ہوا تھا تو کھانیلے جدک پتلیوں کا تماشہ اور معمولی ناچ گانا ہوا تھا۔ بادشاہ ان پتلیوں کے ناچ پر خوب قہقہے مار رہے اور محفوظ ہو رہے تھے۔ خاصہ تراش جب دیکھا کہ اسوقت بادشاہ سلامت خوش ہو رہے ہیں تو وہ بھی دھکھلنے کے واسطے خوب تعریفیں کرتا۔ رنڈیاں اپنی نازک آنکھوں۔ اور خیم و ابرو کے اشاروں سے خوب جھابتا تیں۔ سر پہ کبھی ایک ہاتھ اور کبھی دو سر ہاتھ رکھ کر کبھی خوش خرامی سے کنگے بڑھتیں اور کبھی اُس خرام ناز سے اُنکے پاؤں پلٹ جاتیں۔ ان رنڈیوں کی صورتیں ویسی دلکش و نفیس نہ تھیں جیسی اُن خواہوں کی جو بادشاہ کے پس پشت تھرتی تھیں۔ لیکن انکا ذیل ذول بہت موزوں تھا۔ چھب تھمتی غضب تھی۔ اور شوخی و شنگی چستی و چالاکی بھی کم نہ تھی۔ اُنکے سارے

اکمال پر پہنچا جاسکتا ہے کہ وہ انسان کے جذبات عیش پسندی کو پرچوش کر نوا لے گا۔ ان رنڈوں کے سختی ملبد اور سارنگی پر اپنے جوہر دکھاتی تھے۔ اور ان کے ساتھ ساتھ بھی آگے بڑھے ہیں چھپوڑ لیکن ہر حالت میں برابر آواز سے ساز ملاتے رہتے تھے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ساز اصل ہے اور آواز ساز کا ساتھ دیتی ہے۔

ان رنڈوں کے تاج گانے۔ اور بھاؤ ٹانگوں میں یخ میرے اس مجلس میں کسی اور کو زیادہ دیکھی نہ تھی۔ کیونکہ بادشاہ کو کٹھ پتلیوں کے تماشے میں زیادہ مڑاٹھا تھا۔ اس لیے بنفس نفیس وہ خود اور ان کے رفیق رفقا رنڈوں کی طرف زیادہ متوجہ نہیں ہوتے تھے۔ ایک بار بادشاہ نے خاصہ تراش کے کان میں کچھ سکم دیا جسے سنتے ہی وہ اٹھکے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد آیا اور کوئی چیز ہاتھ میں چھپا کے لایا اور بادشاہ کو دیدی۔ بادشاہ نے کرسی چھپکے کائی۔ اٹھے اور میز کے گرد گھوم کر آگے ہوئے۔ قریب سے تماشہ دیکھنے لگے۔ تماشے والے سمجھ کر اب سارہ چمکا اور انعام و اکرام کا وقت پہنچا خوب جی لگا کے کرب دکھانے لگے۔ بادشاہ نے ذرا تامل کر کے اپنا ہاتھ بڑھایا اور تماشہ سے پٹا پٹا چھبٹا لیا کہ دفعہ ایک کٹھ پتلی بے حس و حرکت زمین پر دم سے آگری۔ یہ ظاہر ہے کہ بادشاہ کے ہاتھ میں تپتی تھی جس سے انھوں نے تار کاٹ دیا تھا۔ اور باوجودیکہ ہم لوگوں کی طرح تماشہ گرد بادشاہ کی اس حرکت سے واقف تھے تاہم بہت حقیرت بکروہ اس واقعے کے وقت منہ کھیل کر رہ گئے۔ ہندوستان کو حیرت زدہ بننے اور بنا دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بادشاہ ہم لوگوں کی جانب بڑے مزے سے اس طرح دیکھنے لگے گویا داد طلب کر رہے ہیں کہ ”کیوں کہی خوبصورتی اور صفائی سے یہ چاکہ ستی دکھائی ہے“ اسپر خاصہ تراش اور دیگر معاجین تماشہ لگا کر خوب ہنسے۔ بادشاہ نے اتنی ہی شہدہ بازی پر اکتفا نہ کی بار بار اپنا ہاتھ بڑھاتے اور ہٹاتے تھے۔ رفتہ رفتہ سب پتلیاں تار سے کٹ کر زمین پر پھان ہو کر آدیں اور ہر پتلی کے گرد پر قفقہ کا شور بلند ہوتا۔ اور تماشہ کا شہر بار عالم سکوت میں حیرت کی تصویر بن جاتا۔ جب سب پتلیاں گر چکیں تو بادشاہ نے اپنے ہاتھ میں شمع لے کر تماشہ گاہ میں آگ لگا دی۔ اور اس کے شعلے پر شواہی فرو ہوئے۔

بعد ازاں اس رات کو دیر تک ناچنے والوں کی نسبت بڑی آزادی سے بلا لحاظ تہذیب و شانٹ اسے لڑی ہوتی رہی۔ اور شراب بکثرت لٹھٹھائی۔ اور برابر در جام چلتا رہا۔ خود بادشاہ اس قدر سرشار ہوئے کہ جسے عقل سلیم گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ اس مابین میں جسے اپنی نظر بالکل اُسر نہ ڈالی ہو وہ ہر ایک کی گتھ

میں گاج کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ باوجود اسکے کہ مجھ سے سختی کے ساتھ ماحضت کو دیکھنی تھی۔ کہ اس طرف مٹکی لگانا ادب دربار کے خلاف ہی۔ کیونکہ حرم شاہی کی بگیاات کو اجازت دیدہ گئی تھی کہ وہ پردے کے اندر سے کھانچا تاشہ دیکھیں۔ مجھے اکثر مروج اس طرف نفاذ کو دیکھا تھا حفظ ادب دربار کے حاصل ہوتا رہا۔ یہ پردہ اتنا سنگین تھا کہ ہم آدھرواؤں کی صورت نہ پہچان سکتے تھے مگر صرف اس قدر خفیت مٹکی سے دیکھ سکتے تھے کہ کچھ لوگ پٹے کے اندر چل پھر رہے ہیں۔ انہیں سے ایک عورت زیادہ شخص کے ساتھ نشستیں معلوم ہوتی تھی۔ یہی بیگم غالباً اس زمانے میں شاہ کی منظور نظر تھیں اور جب روشنی کا عکس پڑتا تھا تو ان کے اٹھنے کے زور کی چمک معلوم ہوتی تھی۔ جو وقت کٹھ پتلیاں کاٹ کے گرا دیکھتی تھیں، اس وقت میں نے پردے کے اندر سے دیکھی دیکھی پیاری پیاری زمانہ ہنسی کی آواز سنی تھی۔ گو ہم لوگ دور ہونے کی وجہ سے پٹ کے اندر کی کوئی چیز صاف صاف دیکھ نہیں سکتے تھے۔ مگر پردہ انھیں لوگ بخوبی باہر کی چیزیں دیکھ سکتے ہوں گے۔

عیش و نشاط کی بے برہمی۔ تاج گانا ہوتا رہا۔ اور رفتہ رفتہ بادشاہ سلامت شراب سے سرشار ہوتے چلے گئے۔ حتیٰ کہ وہ بالکل ہی سہست ہو گئے۔ آخر کار خواہشوں اور وقوی الجشہ خواہ سراؤں نے سماراٹے کر بادشاہ کو پٹے کے اندر پہنچایا۔ اور وہ محض راجین داخل ہو گئے یہ امر قہر انگیز تھا کہ بادشاہ سلامت بھی اسی طرح نشہ میں چر رہے ہو گئے جیسے ایک معمولی رند خراباتی ہو جایا کرتا ہے۔

دوسرے دن میں نے وہ حصہ دیا ان شاہی کا دیکھا جواب تک میری نظر سے پنہاں تھا اس اندرونی حصے میں بھی وہی آرائشی تھی جو اوآن کے دیگر حصے میں تھی۔ یعنی بہت سے مربع اور زرنگار آئینے اور بیش بہا نفیس شیشہ آلات سے مکان سجایا ہوا تھا۔ جنہیں ظاہری آپ ادب بہت تھی لیکن حسن و خوشنوائی کم تھی۔ مجھے اس قلعے کے ایک حصے کو دیکھتے بہت ہی حیرت ہوئی۔ یہ ایک مصنوعی جمیل تھی جو نام بارغ کو چھائے ہوئے تھی۔ اس کے چوں بیچ میں ایک بہت ہی خوبصورت بارہ دری بنی تھی جو کسی کنائے سے ملتی تھی۔ اس بارہ دری میں باہر کی جانب نہایت نفیس رنگ آمیزی اور گلکاری کی ہوئی تھی۔ اور اس کی وضع بڑی بانگی تھی۔ اسپر چھوٹی چھوٹی پھلی غزیاں اور خوبصورت خوبصورت بنے اور مینارے بنے ہوئے تھے۔ اس جمیل کاپانی ایسا صاف شفاف تھا کہ نہ تک کی سب چیزیں بلا غفلت دکھائی دیتی تھیں۔ اور اس کے اندر بڑی بڑی شہری۔ دھپیلی پھلیاں تھرتھرتی تھیں۔ یہ پھلیاں ایسی نہ تھیں۔ جیسی اکثر محفلان میں شیشوں کی اچاریلوں یا چھوٹے چھوٹے

حوضوں کے اندر بند پانی میں تیرتی نظر آتی ہیں۔ بلکہ برطانات اسکے ایک فٹ یا دو فٹ کی لائیں تھیں۔ اس بارہ دری تک پہنچنے کی صورت یہی تھی کہ بجرے پر سوار ہو۔ یہ بجر ایک کنا سے سے لگا رہتا تھا اور اسکا ٹیچ محل کی اس جانب تھا جہاں سے ہم نکلے تھے۔ میرے رفیق طریق درخشاں میرے مصاحب شاہی تھے۔ اور انکی وقعت بادشاہ کی نظر میں مجھ سے زیادہ تھی اکشتی میں بیٹھے اور مجھے بھی آنکھوں نے اشارے سے بلالیا۔ ملاحوں نے بجر اکھولا اور ہم دونوں اس پرستان کی عمارت میں داخل ہو گئے تھے تو لکھنؤ میں یہی عمارت سب سے زیادہ خوشنام معلوم ہوئی۔ اس بارہ دری میں دو کمرے تو متوسط عرض و طول کے تھے اور دونوں جمید آراستہ تھے۔ اسیں بڑے بڑے دھگل اور کومیں دیواروں سے لگی ہوئی رکھی تھیں۔ بڑے کمرے میں سے ایک میں ایک مینہ پر پورا نمونہ محلات شاہی کا بنا ہوا رکھا تھا جس میں پورے محل کے ہر سرخزد کا نہایت باریک بینی اور دیدہ ریزی کے ساتھ چھ بانٹا گیا تھا اور رنگ ایسے ٹھیک دیے گئے تھے کہ گویا ہو ہو نقویں کھینچ دی تھیں۔ یہ بات تو ہندوستانی دستکاروں کا حصہ ہو۔ اسی نقشہ میں اس بارہ دری کی نقل جو ایک آخر وٹ سے بڑی نہ تھی اس خوبی سے آماری تھی کہ اسکی جزئی سجاوٹ تفصیل وار معہ کروٹے دکھائی گئی تھی۔ کوئی چیز چھوڑی نہ تھی۔ بارہ دری میں کھڑے ہو کر صاف شفاف پانی کا نظارہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا پرتانیں گزر ہو گیا ہو۔ جمیل میں پھلپھلکا سیاب وشی سے ادھر ادھر تیرنا۔ ڈوبنا۔ اور ابھرنے کا بجرے کی سجاوٹ۔ سوا محل پر رنگ برنگی پھولوں کی گوٹ۔ اور انکے ارد گرد لائیں لائیں گھاس اور گھنی گھنی جھاڑیاں جنھن کا ریاں جنیں پھول چھپے ہوئے تھے اور جنکی وجہ سے گرد و پیش کی عمارتیں نظر سے پوشیدہ ہو گئی تھیں۔ یہ سا سالانہ مجھے اس قدر دل فریب و دلکش معلوم ہوا کہ اگر میں بادشاہ ہوتا تو سا سے ایوان شاہی کو چھوڑ کر میں اسی بارہ دری میں بود و باش اختیار کرتا۔ بادشاہ سلامت اب یہاں کبھی کبھار آ جاتے ہیں۔ اور اسوجہ سے بے توجہی کے علامات رو بکار ہونے لگے ہیں۔ خادموں کا بیان تو یہ تھا ایک وقت میں بادشاہ کو اس بارہ دری کی جانب ایسی توجہ تھی کہ بیگمات کے بھر مٹ میں اکثر بجرے پر سوار ہو کرتے تھے۔ ایسی حالت میں بجرے کو خواجہ مراد لوگ کھینچتے تھے۔ مگر اب چند سال سے گویا وہ اسکو بھول گئے ہیں اور اسی وجہ سے وہ بے مرمت معلوم ہو رہا ہو۔

چند روز بعد کھانی کی میز پر دفتر رنگین پھلیوں کا ذکر چھڑ گیا۔ اور لوگوں نے کہا کہ معلوم نہیں حرسے میں پکیسی ہوتی ہیں "اور خدا جانے یہ کھائی بھی جاتی ہیں کہ نہیں" اس پر بادشاہ نے فرمایا کہ "ہاں کھائی کیوں نہیں جاتی" اور حکم دیا کہ تھوڑی سی بکوائی جائیں۔ دوسرے دن پھلیاں

ہک کر سبز پڑیں اور کھائی گئیں۔ انکی بوباس کچھ اچھی نہ تھی۔ نذائقہ ہی کچھ اعلیٰ تھا اور اگر لذیذ بھی ہو میں تو کائنات اس کثرت سے تھے کہ کھانا دشوار تھا۔ اس سے تو ہلکا بھلی ہزار درجہ بہتر اور مالانکہ اسکی نسبت ہندوستان نہیں مشہور ہے کہ اس میں کتنے بحضرت ہوتے ہیں۔

بھے دربار کے نئے نئے آداب۔ قرینے روز سیکنا پڑتے تھے۔ اور میں اُن سے وق ہو گیا تھا۔ ایک مرتبہ شامی دعوت کی نوبت آئی۔ یہ دعوت مولیٰ بادشاہ کجانب سے صاحب رزینٹ اُنکے ایڈیکانگ صاحبان۔ اور بعض افسران چھاؤنی کی تھی۔ جلسہ تماشے کے خاتمہ پر دفعۃً ایک جنرل ملازم کپنی (جسے ہم جونس کے نام سے یاد کرینگے) کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا۔

بادشاہ۔ جونس صاحب۔ آپ ہمارے ساتھ ڈرافٹ کی ایک بازی کھیلتے گا۔  
( واضح ہو کہ بادشاہ کو جونس صاحب سے کچھ غلط ہوئی تھی کیونکہ جب وہ بادشاہ کی مصاحبت میں تھے تو انکو بادشاہ کے زک ویر کی ہمیشہ فکر ہا کرتی تھی۔ )

جونس۔ حضور کے ساتھ کھیلنا میرے لیے سرسہ باعث اعزاز و افتخار ہے۔  
بادشاہ۔ سواشرنیوں کی بازی بد گئے۔

جونس۔ حضور۔ میں غریب آدمی ہوں۔ سواشرنیوں کا مقدور نہیں رکھتا۔  
بادشاہ (اپنے ماسٹر کی طرف مخاطب ہو کر) ماسٹر جی۔ بھلا تم۔ مجھے سواشرنیوں کی بازی کھیلو گے۔  
ماسٹر۔ یہ حضور کی سرفرازی ہے۔ میں تو اسے اپنا شرمسوروں گا۔

ماسٹر صاحب بادشاہ کے مزاج سے واقف تھے اور اُنکے دل کی لہرت اچھی طرح سے پہچانتے تھے۔ تختہ آیا۔ ٹرے قائم کیے گئے۔ میں بھی بادشاہ کے قریب بیٹھا ہوا ہر ایک چال کو بغور دیکھ رہا تھا۔ چونکہ مجھے ماسٹر صاحب کے ساتھ شطرنج کھیلنے کا اتفاق ہو چکا تھا اسلئے مجھے یقین تھا کہ کہ وہ ڈرافٹ میں بھی ہنسے ماہر ہونگے۔ لیکن اس موقع پر میں نے دیکھا کہ گو بادشاہ سلامت خواب کھیلتے تھے لیکن ماسٹر اُن سے بھی بدتر کھیلتے گئے اور اس سے میں نے آداب و ربا کو ایک سبق حاصل کیا۔ کیونکہ مجھے معلوم ہوا کہ حتی المقدہ بادشاہ کو شکست نہیں دینا چاہیے۔ ماسٹر صاحب کا یہ حال تھا کہ اگر چہ بہت برا کھیل رہے تھے مگر ہر طرح ظاہر یہی کیے جاتے تھے کہ جس قدر غور و فکر اور کوشش سے وہ کھیل سکتے تھے کھیل رہے ہیں۔ با اینہم بہت دشواری سے اسکا موقع

لما تھا کہ کسی طرح پر بادشاہ بازی جیتیں۔ میں نے یہ بھی سنا کہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بعض مصاحبین فریق ثانی کو کھیل کے وقت باتوں میں لگا لیتے ہیں اور بادشاہ سلامت آنکھ پکا کر ٹھہرے اول بدل کے

رکھ دیتے ہیں۔ بالآخر۔ بازی ختم ہو گئی۔ اور بادشاہ نے ماسٹر صاحب کو شکست دیدی۔ بادشاہ نے خوش ہو کر ماسٹر صاحب سے فرمایا۔ اب میری سوا اشرفیاں تمھارے لئے واجب ہیں۔

ماسٹر۔ حضور۔ بیشک۔ بیشک۔ میں آج ہی شام کو اشرفیاں حاضر کر دینگا۔

بادشاہ نے محاصرہ جاتے وقت ماسٹر صاحب سے فرمایا کہ ”خبردار۔ اشرفیاں بھول

نہ جانا۔“ چنانچہ شام کو جب ہم پانچوں صاحب کھانے کے واسطے جمع ہوئے تو بادشاہ نے ماسٹر

صاحب کو دیکھتے ہی فرمایا۔ ماسٹر صاحب۔ ”اشرفیاں لائے گا؟“ ماسٹر صاحب نے کہا۔ جی۔ حضور۔

پالکی میں رکھی ہیں۔ لے آؤں؟ بادشاہ بول اُسٹھے۔ یہ کیا نوبات ہے۔ آپ کو اشرفیاں مبارک

رہیں۔ مجھ کو حاجت نہیں۔ اپنے گھر بھج دیجئے۔ جو س کو شاید یہ خیال تھا کہ میں اُسکی اشرفیاں

لیونگھا۔ تنہ دیکھا تھا سو کس طرح کھانے پر جٹا ہوا تھا۔ واللہ۔ مجھے اُسکی صورت سے نفرت ہے۔“

ناظرین کے دل میں یہ سوال پیدا ہو گا کہ کیا جو جس صاحب سے کسی نے بادشاہ کی طبیعت کا حال

نہ بیان کیا ہو گا۔ لیکن بات یہ ہے کہ جو شخص اُسکو یہ صلاح دیتا کہ اگر ابکی بار موقوف آجائے تو بازی بد

تو گویا وہ اُسکے ایک سوا ساٹھ پاؤنڈ کا نقصان کرتا۔ کیونکہ بادشاہ سلاست ایسے متلون مزاج تھے۔

کہ اُسکے اقوال و افعال کا کچھ بھی ٹھیک نہ تھا۔ بادشاہ کے خانگی ملازموں میں سے ہر شخص کو پتہ جاتا

تھا۔ کہ اگر بادشاہ ضرط کاروپہ لیلیں گے تو اُسکے دو چند اُسکو وصول بھی ہو جائیگا۔ یا خود بادشاہ انعام کلام

کے حیلے سے دیدینگے یا وزیر۔ لیکن جس شخص سے بادشاہ کا دل پھرا ہوا ہو اُسکے حق میں البتہ نتیجہ

یہ ہے کہ بادشاہ کے ساتھ شعر و نثر یا ڈرافٹ وغیرہ کھیلنا ذرا بیادب تھا کیونکہ فواد خواہ اُن کو

جتنا ناپڑتا تھا۔ وہ دونوں کھیل کھیلتے تھے۔ اور بُرا کھیلتے تھے۔ مگر ہمیشہ جیتتے تھے۔ کیونکہ یہ بات

آداب و ربا میں داخل تھی کہ کبھی اچھو شکست نہ ہونے پائے۔ مجھے بھی بادشاہ کے ساتھ کھیلنے کا

اکثر اتفاق پیش آیا اور میں نے ہمیشہ اُس سبق کو یاد رکھا جو ماسٹر کے کھیل کو دیکھ کے بڑھا تھا۔ بادشاہ

کے ساتھ اٹنا کھیلنا بھی آسان نہ تھا۔ کیونکہ یہ لازم پڑتا تھا کہ کوئی صاحب قریب کھڑا ہو اور اُنکے

بچا کے گیند کو اس طرح پراچھال دے کہ بادشاہ کا گیند فریق ثانی کے گیند سے آگے نہ بھجائے یا ایسی

چابکدستی سے چھوڑے کہ کھیل بادشاہ کے موافق پڑ جائے۔ یا ایک گیند تعمیل میں پہنچ جائے

اور ایک تعمیل میں پہنچنے سے رک جائے۔ لیکن یہ ساری ہمت پھریاں بڑی ہوشیاری اور احتیاط

سے کرنا پڑتی تھیں تاکہ ظاہر نہ ہونے پائیں۔ کیونکہ بادشاہ اسی وقت راضی و خشن ہو سکتے تھے



جبکہ اٹکا مقابل میں فوجی کارروائی سے سراسر بے خبر اور اس کے نتیجے پر حیران و پریشان رہے۔  
 گو اس کچھ خبر نہیں کہ اس قسم کے طفلانہ حرکات اور پھر ایک بادشاہ کے شایان شان کسی طرح  
 نہیں۔ لیکن اگر اس بنا پر ہمارے ناظرین یہ سمجھیں کہ ایسی باتیں لکھنے میں محد و مخمس اور یہ کہ دیگر  
 مقامات پر شاہی ایوانات اور ان ممالک میں جو اودھ سے بدرجہا زیادہ تہذیب یافتہ ہیں نہیں  
 ہوتے تو یہ اگلی غلطی ہو۔ مثلاً کسی مصاحب کی مجال نہیں کہ وہ شہنشاہ روس کو شطرنج - اٹا - ڈرفٹ  
 وغیرہ میں شکست دیدے باوجود کہ شہنشاہ روس نادان - نا سمجھ بچے نہیں تاہم ہر صورت سے  
 ایسی کوئی چال چلی جاتی ہے جس سے وہی بازی جیت لے جاتے ہیں۔ خیر۔ یہ تو ایک جملہ مسخر  
 تھا۔ اب ہم یورپ کے ایک بادشاہ کے شکار کی واقعی روٹا و بیان کرتے ہیں جسکے واقعات بعینہ  
 دیکھے ہی ہیں جیسے کہ ہمارے نفعیر الدین حیدر بادشاہ اودھ ظل ساجی کے - لینے بروز سینٹ ہرٹ  
 ہر سال کی ۳ نومبر کو دربار ہلن میں بھام گرونیو الڈ جنگلی سور کا شکار ہوتا ہے جس میں حضور شاہ  
 پردھیا نفیس پوشاک (لینے سیاہ اعلیٰ درجے کے رنگ کی مخل کا فرغل اور سفید براق پتلون زیب  
 تن کر کے میدان میں آتے ہیں اور ان کے ہمراہ بہت سے شکاری سرخ کوٹ اور چرمی وردی پہنے اُس کے  
 جمع ہوتے ہیں۔ اور سورتیا کر کے چھوڑا جاتا ہو دینے اُس کے دانت کاٹ ڈالے جاتے ہیں تاکہ کوئی  
 نقصان نہ ہو بخائے پھر اُس کے پیچھے بادشاہ مع رفیق رنقا اور شکاری کتوں کے اور سب لوگ میدان  
 میں دوڑتے ہیں۔ پھر ایک جست میں بادشاہ اور اُس کے پیچھے پیچھے ساری بھڑکتے - اور سرخ کوٹ  
 اور چرمی وردی والے اُس کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ کتے اُس کو سب طرف سے دبوچ لیتے ہیں اور بالکل  
 بے قابو اور لپٹ کر ڈالتے ہیں۔ اُس وقت چند شکاری اپنے گھوڑوں سے اُتر کر جانور کو پکڑ لیتے ہیں اسلئے  
 پتہ کہ سرا پر اٹھا ہوا ہو۔ کتے واپس بلائے جاتے ہیں اور اُس وقت بادشاہ قریب آتے ہیں۔ اُن کے ہاتھ  
 میں ایک شمشیر آبدار دیدی جاتی ہو اور وہ گھوڑے سے اُتر کر سور کے پاس جاتے ہیں اور اُس کی گردن پر  
 ایک ضرب لگاتے ہیں۔ اس پر بادشاہ کی شجاعت و استقلال - دلیری و جوانمردی پر چاروں طرف سے  
 واہ و اسجانات اُسد کا غل بلند ہوتا ہو۔ اور وہ مارے خوشی کے جامے میں نہیں سماتے اور خوش  
 خوش مجلسیں چلتے ہیں۔ اس حکایت کے سننے سے معلوم ہوگا کہ لکھنؤ کے ایوان شاہی کی جو  
 حالت ہے وہ یورپ کی سلطنتوں کے ایوانات شاہی سے زیادہ مغائر نہیں۔

دربار اودھ میں یورپین ملازمان شاہی کا جو کچھ رسوخ و اقتدار تھا اسے ہندوستانی امر و عمائد  
 سلطنت ہرگز اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے۔ بلکہ ان لوگوں کو یہ باتیں بہت خار گزرتی تھیں اور اردو کے

انصاف یہ کچھ بجا اور غیر معمولی بھی تھا۔ کیونکہ نواب یعنی وزیر یا سپہ سالار عساکر جو پولیس کا حاکم اسٹے بھی تھا (یعنی راجہ بنما در سنگھ جی کی بابت میں آگے چکر بہت کچھ لکھ چکا) انھیں کسی کی بادشاہ کے سامنے بے قیادہ خاصہ تراش کے کچھ نہ چلتی تھی۔ ایک مرتبہ نواب وزیر نے بادشاہ سے عرض کیا کہ ان پورہ میں مصاحبوں کو زیب نہیں ہے کہ جہاں پناہ کے حضور میں جوتا پہن کے حاضر ہوں ہم لوگ تو یہ بات اپنے واسطے بھی روا نہیں رکھتے۔ حضور نے اس قسم کی مراعات سے ان لوگوں کو خیرہ کر رکھا ہے اور میں باقی میں عرض کرتا ہوں کہ حضور کے والد بزرگوار نواب غازی الدین حیدر مقرر کبھی اسکو جائز نہ رکھتے بادشاہ کو اپنے منکسر متواضع اور باتمیز وزیر کی یہ تقریر سن کر غور سے دیر سکوت رہا۔ لیکن۔ روشن الدولہ نے اس عنوان سے یہ گفتگو کی تھی کہ بجائے اشارہ چشم دابر کے بادشاہ کو زبان ہی سے جواب دینا پڑا۔ چنانچہ انھوں نے ارشاد فرمایا۔

بادشاہ۔ نواب۔ کیا میں شاہ انگلستان سے بھی عظیم المرتبت ہوں۔

وزیر۔ خداوند۔ شاہان ہندوستان میں تو کوئی حضور کا ہمسرہ نہیں۔ بلکہ شاہ دہلی کی بھی اب یہ شان نہیں ہے۔ خدا قبلہ عالم کو ہزار برس زندہ رکھے۔

بادشاہ۔ روشن الدولہ میں یہ پوچھتا ہوں کہ انگلستان کے بادشاہ سے بھی میرا رتبہ بڑا ہو۔

وزیر۔ غلام کی تو یہ مجال نہیں کہ کسی بادشاہ کو قبلہ عالم پر ترجیح دے سکے۔

بادشاہ۔ نواب سنو، اور جنرل تم بھی سنو، کہ بادشاہ انگلستان ہمارا حاکم ہو۔ اور یہ لوگ اُس کے ساتھ جوتا پہنکے جاتے ہیں۔ پھر میرے سامنے جوتا پہننے رہنے میں کیا مضائقہ ہے۔ کیا یہ لوگ میرے حضور میں ٹوپی دیکے حاضر ہوتے ہیں؟ نواب۔ اسکا جواب دو۔

نواب۔ نہیں خداوند۔ انکے سر و نیز ٹوپی تو بیشک نہیں ہوتی۔

بادشاہ بس۔ تو اٹھا طریقہ اور اُنکے ہاتھ آداب دربار شاہی یہی ہو کہ ٹوپی اتار ڈالتے ہیں جیسے تم لوگ جوتا اتار ڈالتے ہو۔ اب تمھاری تشکیں ہو گئی کہ نہیں۔ اگر نہیں ہوئی تو میں ابھی ان لوگوں کو حکم دیے دیتا ہوں کہ جوتا اتار کے حاضر ہو کر ہیں۔ لیکن تم کو بھی بگڑی اتار کے حاضر دربار ہونا پڑے گا۔ کیوں ہو منظور؟

انکے بعد پھر کبھی نواب نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کہی کیونکہ مسلمانوں میں بگڑی اتار ناجائز ہی ذلت سمجھا جاتا ہے۔ اور ان لوگوں میں ایسے موقع پر جبکہ کسی فعل کے نکرے کا

تصد کریں یا کسی کام کے کرنے پر دل سے آمادہ ہو جائیں یہ قسم کھائی جاتی ہے کہ اگر ہم اپنا نہ کریں تو ہمارے باپ کی بگڑی اتر جائے۔

اس گفتگو نے ہلوگوں کو سحر کر دیا۔ اور بادشاہ نے اپنے واقعہ نگار منشی کو حکم دیا کہ اس گفتگو کی یاد قلمبند کرو۔ کیونکہ اس قسم کی جواہر بائیں و بائیں ہوتی تھیں اُن کو دقایق نگار لکھ لیتے تھے۔ تاکہ معلوم رہے کہ جس وقت بادشاہ اپنی وقت فیصلہ اور عقل سے کام لیتے ہیں تو یہ وقت ثابت نہیں ہوتے البتہ جب وہ عالم سرخوشی میں ہوتے تو منشی کی ترنگ میں یا طبیعت کے بھولے پن سے طفلانہ خیال و حرکات بھی اُسے صادر ہو جاتے تھے۔ چنانچہ شطرنج - انٹا - ڈرافٹ وغیرہ کے کھیل انھیں حالتوں میں ہوتے تھے۔

میں نے بادشاہ کی تصویر مختلف پھلوں سے کھینچنے دکھادی ہے اور ابھی صفحات آئندہ میں بہت کچھ اُنکی ہر ایک اچھی بُری حالت و فعل کو بیاں کرونگا۔



## باب سوم

شکاریوں کی جماعت

ایک مرتبہ کھانے پر کسی شخص نے شکار کا ذکر چیر کر کہا کہ گھنٹوں سے چند میل کے فاصلے پر ایک جھیل میں شکار خوب ہے اس وقت بادشاہ سلامت خوشی میں تھے۔ فرمانے لگے۔ "ہاں ہاں۔" ہنسنے بھی اس جھیل کی کیفیت سنی ہے۔ اچھا۔ چلو وہاں چل کے شکار کھیلیں۔ دیکھیں ہمارے جیسے میں شکاری کون کون ہے؟ اسی وقت احکام جاری ہو گئے۔ اور یہ قرار پایا کہ ہم لوگ ان عمارت میں جو جھیل کے کنارے واقع ہیں دوسرے روز مجتمع ہوں۔ یہ عمارت جسکا نام دلکش تھا۔ مدو د شہر سے چند ہی میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ لہذا اس خیال سے کہ شام تک ہم لوگ شکار کھیں گے تو اس آبی جا میں گے کسی نے شب باشی کا انتظام بھی نہیں کیا۔ جب ہاں پہنچے تو دیکھا کہ بادشاہ سلامت سے اپنے رفیق رنقا۔ اہلی موالی کے دلکش میں تشریف فرما ہیں۔ ہلوگ بکتے بکتے تھے کہ پہنچتے ہی پہنچتے بادشاہ ہکو جھیل پر چلنے کے واسطے طلب فرمائیں گے مگر کسی نے خبر بھی نہ لی۔ اسی انتظار میں کہ اب طلبی ہوئی اب طلبی ہوئی۔ دن طے لگا۔ اور دوڑھٹے تمام ہو گیا۔ اور ہلوگ اٹا کھیل کھیل کے وقت کاٹتے رہے۔ رات کے نو بجے معمولی کھانے کے وقت طلبی ہوئی۔ حاضر ہوئے تو دیکھا کہ حسب معمول بادشاہ سلامت خاصہ نوش فرمانے پر طیار بیٹھے ہیں۔ کسی کو یہ عرض کرنے کی جرأت بھی نہ ہوئی کہ شکار کیوں ملتوی کیا گیا۔ اور خود بادشاہ نے بھی اسکا کچھ تذکرہ نہ فرمایا۔ معمولی کھانے پینے۔ دور شراب اور رقص و سرود میں رات بسر ہوتی رہی۔ حتیٰ کہ آدھی رات گزر گئی۔ بادشاہ نشے میں چور اور ہلوگ اسکے منتظر تھے کہ اب کوئی دم میں لوگ انکو کھسکھسائیں و اصل کیا چاہتے ہیں۔ کہ دفعۃً انھوں نے ایک بڑا غصہ مندا۔ چونکہ بظاہر کوئی سبب معلوم نہ ہوتا تھا اسوجہ سے ہم سب متحیر تھے کہ کیا بات ہے۔ ہکو متوجہ پاکر بادشاہ نے فرمایا کہ "بھئی۔ یہ کوئی شرط و قادی نہیں ہے کہ لوگ ہمیں اکیلا چھوڑ کے یہاں سے چلو۔ یہ بڑا وہیات مقام ہے۔" پھر خاصہ تراش اوہ ایک اور صاحب جو غالب ہو کے فرمایا۔ "تم لوگ بیویاں رکھتے ہو۔ تم اپنے گھر جا کے رہو۔ مجھے یہ گوارا نہیں ہے کہ آجکی شب میں تمکو تھاری بیویوں کی ہم آغوشی سے محروم رکھوں۔ باقی اور سب لوگوں کو حاضر رہنا چاہیے۔"

جب ہلوگ بادشاہ کی ہر اہی میں گھنٹوں سے کچھ بھی دد رہا کرتے تھے تو ہمارے ساتھ ہمیشہ ہلوگ سفری پلنگ، نوکر چاکر، کپڑے لٹے، نمائے منہ دھونے کا سامان ساتھ رکھتا تھا۔ کیونکہ روزانہ از سر تا پا صاف چوڑا بدلنا پڑتا تھا۔ اسوجہ سے کوئی شخص صرف ایک گٹھری لیکر سفر نہیں کر سکتا تھا۔ چونکہ بادشاہ سلامت کی یہی مرضی ہوتی تھی لہذا ہلوگ اسکی تعمیل کرنا پڑتی تھی۔

اس گفتگو کے بعد بادشاہ نے یہ بھی فرمایا کہ بس اب کل شکار کھلیں گے۔ یہ کہتے ہوئے وہ تو داخل مجلس ہو گئے اور انکے جاتے ہی ہمارے دوست روہی دونوں جن کو اجازت مل چکی تھی چلے پھرتے نظر آئے۔ ان میں سے ایک صاحب چلنے چلاتے یہ وعدہ کر گئے کہ میں تمہارے مکان پر جا کر تمہاری پالکی میں دو گدا دیکھوں کہ سفر میں اکثر مرتبہ اسی پر رات بسر کرنے کا اتفاق ہوتا تھا اور تمہارے خدمتکار کو اور اس کے ساتھ تمہارے کپڑے بھی صبح کیلئے بھجوا دوں گا۔ بادشاہ سلامت جب مقدمہ مارتے ہوئے مجلس کے اندر داخل ہوئے تو ہم لوگ بھی ہنسی میں اٹھا ساتھ دیتے رہے۔

کیونکہ بحیثیت مصاحب یہ ہم سب کا فرض منصبی تھا۔ مجلس میں داخل ہوتے وقت پہلے تو ہم لوگوں سے ارشاد ہوا کہ آپ کا بھی چاہے تو بیچ کا ناموقوف نہ کیجئے گا۔ پر جب طوائفوں کے قریب کی جانچ دیکھا کہ گزر رہا تو اٹھنے فرمایا کہ تم لوگ ناچے گائے جاؤ۔ اور صاحب لوگوں کو خوش کرتے رہو۔ وہ وقت بھی عجیب تھا۔ ہمارے مہرباں تو جانچے۔ بق وقت کمرے میں جہاں ہر قسم کی تزیینیں، انڈیاں، دیواری گریباں بھاڑ، خانوس روشن تھے۔ قریب قریب ہو کا عالم تھا۔ بادشاہ گئے۔ اور انکے ساتھ انکی خاص میں پیش خدمتیں بھی داخل دفتر ہو گئیں۔ اب اتنے کمرے میں ہم نفسہ چند تھے اور بچاری شامت کی ماری ناچنے گانے والیاں۔ جی کیا خاک لگتا۔ آخر کار جب ہم خود دیکھا کہ اب بادشاہ ہماری آواز کی رسائی سے اٹھتے ہوئے گئے ہیں تو ہم نے ان بچاریوں کو رخصت کرادیا۔ چونکہ شہاب سے جھگڑے ہوئے تھے خار و خیاڑہ کا عالم تھا۔ جھک بھی سکتے تھے۔ لیٹنے پوٹنے کو بے اختیار جی چاہتا تھا۔ سچ یہ ہے کہ ہم کو اس وقت کوئی ایسی سخت تکلیف تو تھی نہیں کیونکہ ہلوگ شاہی مینہ میٹھے ہوئے تھے کہ جہاں ذرا سے اشارے میں رنگارنگ نواکھ اعلیٰ اعلیٰ شرا میں موجود ہو سکتی تھیں لیکن پھر بھی کیا ایک سارے کمرے کی رونق کا اٹھ جانا چھہ تمہیے نقل ملتا اور صدائے طنبور و تار کے عووض سننا چاہا جانا ہی کیا کم وحشت خیر تھا۔ اب ہلوگ بات کرتے تو آہستہ آہستہ۔ کیونکہ ہنسی مذاق کا کون موقع تھا۔ باقی سے نوشی۔ اسکا یہ حال کہ ایک روز پیشتر جو کچھ تکلیف دوسروں وغیرہ کی پہونچ چکی تھی وہ بھولی نہ تھی۔

بالآخر - ہلوگ میز پر سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور لگے کوٹھی کے گڑبگڑ کانٹے - یہ نکل عمارت ہماری چیل قدمی کے واسطے وقف تھی - خوابگاہ شاہی البتہ مستثنیٰ تھی کیونکہ اُنکے سامنے ہندوستانی عورتیں سپاہیانہ وردی پہنے - کاندھوں پر بندو قیں رکھے آہستہ خوامی سے پہرہ دے رہی تھیں - اب سب طرف بالکل ہوکا عالم تھا - اور غضب کی خاموشی طاری تھی - ادھر ادھر کچھ ہندوستانی خدمتگارانہ اپنے چادر و نمین پٹے - گولالانہ بنے - سست ماسے پڑے تھے - اور ایسے بے خبر سو رہے تھے کہ شاید ہنگامہ قیامت بھی اُنکے سر نہر پر پا ہو جائے تو اُنکے کان پر جوں تک نہ رہ گئے -

رات کے دو بج گئے اور اب تک ہمارے نوکروں کا کہیں پتہ نشان نہ تھا - مجبوراً ہم میں سے کسی نے کسی کچھ یاد نگل اور کسی نے آرام کرسی پر قبضہ کیا - اور اپنے جسموں کو پتھروں - پسوؤں پر وقت کر کے سونا شروع کیا - اُس وقت ایک بڑی موی شیخ میز پر روشن تھی - ادھر ادھر سے خزانوں کی آوازیں آرہی تھیں - کھانے کے کمرے میں بعض فراش شمعیں گل کر رہے تھے - اور باہر کچھ سستری مہولی رفتار سے منل رہے تھے - مجھے نیند آپہلی تھی کہ اتنے میں میری پالکی دوسرے کمرے میں لا کر رکھی گئی - میرے ساتھیوں کے واسطے بھی ہی سامان ہوا - ہمارے خدمتگاروں نے ہالکا آسائش کا انتظام مناسب کر دیا - اور ہم لوگ خواب خرگوش میں بادشاہ کے قہقہے اور انہی کھلیفات کو بھلی بسر کئے -

دوسرا دن ہوا - اور وہ بھی پہلے دن کی طرح گزر گیا - ایک شخص نے اُنکے کہا کہ بادشاہ سلامت آپ لوگوں کو کئی بار یاد فرما چکے ہیں - اسکا منشا صرف اسقدر تھا کہ ہلوگ یہاں سے جانے نہ پائیں - حسب معمول بارہ بجے خاصہ تراش بادشاہ کی بھلا ج بنائیکو حاضر ہوا - ہلوگ اپنے حسب مرضی شافع سے جی بھلاتے رہے - کبھی منہ میں چرٹ دبائے برآمد سے میں ٹپکتے کبھی اٹا کھیل کے وقت کاٹتے کبھی ہندوستانی صنعت و حرفت کے اُن نمونوں کو دیکھتے جتنے کوٹھی کے بعض کمرے آراستہ تھے - یہ ظاہر تھا کہ بادشاہ کی مرضی یہی ہے کہ ہلوگ حاضر رہیں لیکن شکار کے بارے میں اُنھوں نے ایک حرف بھی ارشاد نہیں فرمایا - نہ اُس جھیل پر پہنچنے کی کچھ بھی تیاری معلوم ہوئی جہاں ہکویقین ولایا گیا تھا کہ ہزار در ہزار شکاری پرند موجود ہیں -

مجموعی طور پر رات کے کھانے سے فراغت ہو گئی - اور اُس کے بعد بادشاہ نے پھر یہی فرمایا کہ ایسے وحشت خیز مقام پر اُنکو تہانہ نہیں چھوڑنا چاہیے - اور یہ کہ شکار پر کل چلیں گے - اُسی طرح پھر ہلوگوں نے پالکین میں بستر جوئے اور ہاتھ چند خدمتگارانہ صبح کیلئے کپڑے پہنے چلے گئے - میں نے اس خیال

سے کہ کہیں بادشاہ سلامت اسی کو ٹھہریں یا جیل کے کنا سے جو پڑاؤ والا گیا ہو اس میں چند روز قیام نہ کریں اپنے ملازم کو حکم دیدیا کہ جلد سامان سفر اور ٹھکانا چھوڑنا۔ کپڑوں کے صندوق وغیرہ وغیرہ لیتا آئے تاکہ عند الضرورت ہر شے تیار ہو۔ کسی چیز کی تکلیف نہ ہو۔ ہندوستانی خدمتگاروں سے پوچھ بچھ کی تو ہم کو اس کی سن گئی کہ بالکل بادشاہ اپنی ایک نئی حرم سے جو بہت ہی کسن اور خوبصورت ہو اور جسے ہلوگوں نے وہ ایک دن پیشتر و لکنا پہونچکے دیکھا تھا معروف پیش و نشاط ہیں۔ یہ ایک نیا شگوفہ کھلا تھا جو بہت ہی جلد اسی طرح کھلنا چاہیو والا تھا جیسے چھوٹے بچے آج ایک کھلونے سے کھیلنے ہیں اور کل دوسرے سے بھی بھلاتے ہیں۔

میں نے تو انہیں پیش بند یوں کے خیال سے ایک ہفتہ کے قیام کا سامان اور پتی آسائش کا بندوبست پوری طرح کر لیا تھا۔ چنانچہ ایک ہفتہ میں گزر گیا اور اسکے بعد ہلوگ جیل کی طرف روانہ ہوئے۔ کیونکہ بادشاہ نے حکم لگادیا تھا کہ سب لوگ وہاں ایک ساتھ چلیں۔ جیل کو اور اسکے گرد و جوسامان کیا تھا اسکو دیکھ کر ہلوگوں کو سخت قہج ہوا۔ جیل کی اُس طرف یعنی جدھر سے ہم پہونچے تھے زمین تہریج کم ہوتی چلی گئی تھی۔ اور سائل کی طرف نہ چلا۔ اور اسی وجہ سے جب تک ہم کن لے کے ٹیکرے پر نہیں چڑھے چارو آب نظر نہ آئی۔

اب ہمارے سامنے جیل ہریں لے رہی تھی۔ اور دوسرے ہوسے آفتاب کی جھکی جی کی کوئی پانی میں شرح سرخ رنگ گھل رہی تھیں۔ پوچھ جیل طوطا دو سیل اور بوسنا ایک سیل ہوگی۔ بجز اُس رخ کے جو صر سے ہم پہونچے اور سب طرف گھنٹا گھنٹا چل رہا تھا۔ جسکے درختوں کی شاخیں پانی پر سایہ لگاتیں۔ جو درخت چل رہا تھا اور گھراؤرا بلند تھا اور اُس پر بند شاہ داب مرغزادہ رنگ نظر آتا تھا۔ اسی سبزہ زار میں بس بڑے بڑے نیچے۔ راہنیاں۔ چھوٹا ریاں نصب تھیں۔ بچوں بیچ میں بادشاہی نیچے تھے۔ بچکے گرد قنات تھے۔ ہوتی تھی۔ خاص شامی خیر زندہ تار باد لے کا تھا۔ جس میں قرمز رنگ کی دھاریاں جب نمود کی تھیں اور اسکے ارد گرد رنگہ جھنڈے پھر ہرے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ قنات کی پشت پر شاہی محلات و بلکات تھیں۔ پیش خدمتوں فاضلوں۔ زنانہ پہرے والیوں۔ ہریوں۔ وہ نہیںوں۔ وغیرہ کے نیچے ترتیب والے نصب تھے۔ چونکہ اس موقع پر صاحب روزینٹ بھی آئیوا لے تھے لہذا بادشاہ کے نیچے کے دائیں جانب ایک خوشنما خیمہ لگے واسطے بھی نصب کیا گیا تھا۔ اور دوسری جانب تھوڑے فاصلے سے ایک مرج خیمہ ہم دو بین ملازمان خانگی کے لیے کھڑا کیا تھا۔ ان خیموں کے علاوہ۔ لوہ۔ اُنکے صاحبزادے یعنی سپہ سالار۔ جنرل صاحب یعنی پولیس کے افسر اعلیٰ۔ اور دیگر اعلیٰ عہدہ داران کے بھی خیمہ جات تھے

اور انہیں سے بعض کے ہمراہ بہت کچھ چشم و قدم تھے اسی چھوٹے سے شہر میں باغی - گھوڑے - اونٹ اور  
 بچہ بھی جا بجاتے - کہیں ہونے نظر آتے تھے - کہیں پالکیاں اور ہوادار - اور پھر انہیں کے ساتھ وہ طرح  
 طرح کی بند سواریاں جنہیں شاہی محرمات عالیہ سوار ہوا کرتی تھیں -

بادشاہ کا یہ منشا تھا کہ یہ چاہ و چشم - خیمہ و خکاہ - دیکھکے ہلوگ دنگ ہو جائیں - چنانچہ ایسا ہی ہوا -  
 ہلوگوں کے استعجاب سے بادشاہ کی باجیس کھل گئیں - کیونکہ ہمارا یہ استعجاب ہرگز تغص اور بناوٹ سے نہ تھا  
 فی بحقیقت آرائش و زیبائش کے یہ ساز و سامان تو ہمیں کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے - ہم لوگوں میں سے کسی کو  
 یہ جرات نہ ہوئی کہ بادشاہ سلامت سے پوچھتا کہ در انخالیکہ یہ جیل شہر سے اس قدر قریب تھی تو پھر اس قدر ہتھام  
 کی کیا حاجت تھی - کیونکہ آسانی سے یہ ممکن تھا کہ صبح کو سویرے گھر سے چلتے - دن بھر گھر - کھیتے اور شرام لہجہ  
 اپنے گھروں کو واپس چلے جاتے اور مرے سے اپنے مکان پر کھاتے پیتے - پڑھتے - غیر - یہ ہلوگوں کا  
 منصب بھی نہ تھا - ہلوگ جیل کے گرد و پیش کے خوشناساں اور خیمہ گاہ کی غلام نشان - اور دیگر سامان پر  
 اپنا تعجب ظاہر کرتے رہے - جس سے بادشاہ شاد ہوئے اور ہلوگ بجائے خود مطمئن - ہکو معلوم ہوا کہ  
 بادشاہ کے ساتھ شکار رکھنا معمولی بات نہیں - یہ کچھ شے دیگر ہے - کیونکہ بادشاہ کی مرضی یہی ہو کہ خود بدلت  
 ہی کل شکار کھلیں اور کوئی انکار مزاحم و رقیب نہ ہو - چنانچہ کئی دن تک متواتر تنہا بادشاہ سلامت ہی شکار  
 کیلئے رہے - جیل کے کنارے ایک پردہ ٹانا جاتا تھا - جس کا منشا یہ تھا کہ شکاری پرندہ کوئی نظر بادشاہ پر  
 نہ پڑے - پھر کنلے دانہ وغیرہ ڈالکر پرندوں کو مجتمع کرتے تھے اور جب صد ہایہ ہو جاتے تو تمام لشکر  
 میں سکوت ہو جاتا اور بادشاہ سلامت کو فوراً خبر کیا جاتی کہ اب جانور کثرت سے سطح آب پر اکٹھا ہونگے ہیں  
 اسوقت بادشاہ آہستہ آہستہ پرے کے پاس آتے اور انکے پیچھے پیچھے ایک رفیق انکی ولایتی بندوق کیلئے آتا  
 پرے میں ایک سوراخ پہلے سے کر رکھا جاتا تھا اور اُس سے بندوق کی نال باہر جانوروں کی طرف  
 نکال دی جاتی - اب اسوقت جانور تو داخل ہو کر مرے سے دانہ چٹکنے میں مصروف اور آپس میں چونچوں  
 چونچوں سے شوخیاں کرتے - اور اپنی بولی ٹھولی میں اپنے ”چٹم“ ہونے پر خوشی منا رہے ہیں اور اُنہیں  
 کوئی اتنی بات کہنے والا نہیں کہ جسے نزدیک شکار گل کے بل جھکے جانا نہ پھندے لگا رہا ہو صیاد چٹکے چٹکے  
 عین ایسے وقت میں یکایک ہوا میں ”ڈن“ کی آواز گونجتی اور نال سے دھواں نکلتا - یعنی بادشاہ سلامت  
 اپنے ہی دست مبارک سے بندوق دھنستے اور اپنے نزدیک بڑا کمال دکھاتے اور ان غریبوں پر بلا سے  
 بے درماں اور آفت ناگمانی کی طرح چھڑوں کی بوجھ بڑھاتی - اگرچہ بادشاہ بڑے قادر انداز نہ تھے -  
 اور اسوجہ سے اکثر چھترے ٹھیک ٹھکانے پر بھی نہ پڑتے بلکہ اوپر ہی اوپر ہوا میں اُڑ جاتے لیکن انہیں



سے کہ کہیں بادشاہ سلامت اسی کو بھی میں یا جھیل کے کنارے جو پڑاؤ والا گیا ہو اس میں چند روز قیام نہ کریں اپنے ملازم کو حکم دیدیا کہ جلد سامان سفر اور ٹھکانا چھوڑنا۔ کپڑوں کے صندوق وغیرہ وغیرہ لیتا آئے تاکہ عنانِ ضرورت ہر شے میں ملے۔ کسی چیز کی تکلیف نہ ہو۔ ہندوستانی خدمتگاروں سے پوچھ چکچکی تو ہم کو اس کی سن گئی کہ نعل بادشاہ اپنی ایک نئی حرم سے جو بہت ہی کسن اور خوبصورت ہو اور جسے ہلوگوں سے دو ایک دن پیشتر وکٹا پوسٹ کے دیکھا تھا مصروفِ پیش و نشاط ہیں۔ یہ ایک نیا شگوفہ کھلتا تھا جو بہت ہی جلد اسی طرح کھل جائیگا اور آج ہی سے چھوٹے بچے آج ایک کھلونے سے کھیلنے ہیں اور کل دوسرے سے بچی بھلاتے ہیں۔

میں نے تو انہیں پیش بند یوں کے خیال سے ایک ہفتہ کے قیام کا سامان اور اپنی آسائش کا بندوبست پوری طرح کر لیا تھا۔ چنانچہ ایک ہفتہ میں گزر گیا اور اُس کے بعد ہلوگ جھیل کی طرف روانہ ہوئے۔ کیونکہ بادشاہ نے حکم لگا دیا تھا کہ سب لوگ وہاں ایک ساتھ چلیں۔ جھیل کو اور اُس کے گرد جو سامان کیا تھا اُسکو دیکھ کر ہلوگوں کو سخت قہج ہوا۔ جھیل کی اُس طرف یعنی جد ہر سے ہم پہونچے تھے زمین بتدریج کم ہوتی چلی گئی تھی۔ اور ساحل کی طرف ڈھالو۔ اور اسی وجہ سے جب تک ہم کنارے کے ٹیکڑے پر نہیں چڑھے چادر آب نظر نہ آئی۔

اب ہمارے سامنے جھیل ہمیں لے رہی تھی۔ اور ڈوبتے ہوئے آفتاب کی چمکی سی کرنیں پانی میں سُرخ سُرخ رنگ گھول رہی تھیں۔ پوچھنا تو نا دو میل اور عرضاً ایک میل ہوگی۔ پھر اُس رخ کے جدھر سے ہم پہونچے اور سب طرف گھٹنا گھیرنا چکل تھا۔ جیسے درختوں کی شاخیں پانی پر سایہ لگائیں۔ جدھر جکل نہ تھا اُدھر کنگار اور بلند تھا اور اُس پر بندو شاداب مرفوراد و رنگ نظر آتا تھا۔ اسی سبز و نارین پر۔ اُسے نیچے۔ راہتیاں۔ چھو لاریاں نصب تھیں۔ بچوں بیچ میں بادشاہی نیچے تھے۔ جیسے گروتات تھیں۔ ہوتی تھی۔ خاص شامی خیر نہ تار باد لے کا تھا۔ جس میں قرمزی رنگ کی دھاریاں غلب نمود کی تھیں اور اُس کے ارد گرد۔ نگارنگ جھنڈے پھر ہرے ہوا میں اُڑ رہے تھے۔ قنات کی پشت پر شاہی محلات و عیالات انگلی پیش خدمتوں و عاصوں۔ زنانہ پہرے والیوں۔ ہریوں۔ وہ سنہیوں۔ وغیرہ کے نیچے ترتیب وار نصب تھے۔ چونکہ اس موقع پر صاحبِ رزیدنٹ بھی آئے تھے لہذا بادشاہ کے نیچے کے داہنی جانب ایک خوشنما خیمہ لگائے واسطے بھی نصب کیا گیا تھا۔ اور دوسری جانب تھوڑے فاصلے سے ایک مربع خیمہ ہم یورپین ملازمانِ شاہی کے لیے کھڑا کیا تھا۔ ان خیموں کے علاوہ۔ نو اب۔ اُس کے صا حبزائے یعنی سپہ سالار۔ جنرل صاحبِ مینی پولیس کے افسرِ اعلیٰ۔ اور دیگر اعلیٰ عہدہ داران کے بھی خیمہ جات تھے

اور انہیں سے بعض کے ہمراہ بہت کچھ حشم و خدمت تھے اسی چھوٹے سے شہر میں باقی - گھوڑے - اونٹ اور  
چغیر بھی جا بجا تھے - کہیں ہونے نظر آتے تھے - کہیں پالکیاں اور موادار - اور پھر انہیں کے ساتھ وہ طرح  
طرہ کی بند سوار یاں جنہیں شاہی محدثات کا یہ سوار ہوا کرتی تھیں -

بادشاہ کا یہ مشاہدہ کیا کہ یہ جاہ و حشم - غیر ذرا گاہ - دیکھ کر ہلکے دنگ ہو جائیں - چنانچہ ایسا ہی ہوا -  
ہلوگوں کے استعجاب سے بادشاہ کی ہاتھیں کھل گئیں - کیونکہ ہمارا یہ استعجاب ہرگز تصنع اور بناوٹ سے نہ تھا  
فی الحقیقت آرائش و زیبائش کے یہ ساز و سامان تو ہنسنے کیسی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے - ہم لوگوں میں سے کسی کو  
یہ جرأت نہ ہوئی کہ بادشاہ سلامت سے پوچھا کہ در انحالیکہ یہ جیل شہر سے اس قدر قریب تھی تو پھر اس قدر ہتہام  
کی کیا حاجت تھی - کیونکہ آسانی سے یہ ممکن تھا کہ صبح کو سویرے سکر سے چلتے - دن بھر تھکا کھینچتے اور سر شام اپنے  
اپنے گھر کو واپس چلے جاتے اور عمرے سے اپنے مکان پر کھاتے پیتے - پڑھتے - خیر - یہ ہلوگوں کا  
منصب بھی نہ تھا - ہلوگ جیل کے گرد و پیش کے خوشگامان اور خدیوہ گاہ کی عظم و شان - اور دیگر سامان پر  
اپنا تعجب ظاہر کرتے رہے - جس سے بادشاہ شاد ہوئے اور ہلوگ بجائے خود مطمئن - ہلوگ معلوم ہوا کہ  
بادشاہ کے ساتھ شکار کھیلنا معمولی بات نہیں - یہ کچھ شے دیگر ہے - کیونکہ بادشاہ کی مرضی ہی ہرگز خود بدولت  
ہی کل شکار کھیلیں اور کوئی انکا مزاحم و رقیب نہ ہو - چنانچہ کئی دن تک متواتر تہا بادشاہ سلامت ہی شکار  
کھینچتے رہے - جیل کے کنارے ایک پردہ تانا جاتا تھا - جسکا نشانہ تھا کہ شکاری پرندوں کی نظر بادشاہ پر  
نہ پڑے - پھر کن لے دانہ وغیرہ ڈال کر پرندوں کو مجتمع کرتے تھے اور جب مدہایح ہو جاتے تو تمام شکار  
میں سکوت ہو جاتا اور بادشاہ سلامت کو فوراً خبر کی جاتی کہ اب جانور کثرت سے سطح آب پر اکٹھا ہو گئے ہیں  
اسوقت بادشاہ آہستہ آہستہ پرستے کے پاس آتے اور اُنکے پیچھے ایک رفیق انگلی و ناچی ہندو کی لیلے آتا  
پرستے میں ایک سوراخ پہلے سے کر رکھا جاتا تھا اور اُس سے ہندو کی مال باہر جانوروں کی طرف  
نگال دی جاتی - اب اسوقت جانور تو داخل ہو کر مرے سے دانہ کھنے میں مصروف اور آپس میں چونچوں  
چونچوں سے شوغیاں کرتے - اور اپنی بولی ٹھہری میں اپنے ”چہ غم“ ہونے پر خوشی منادے ہیں اور اُنکے  
کوئی اتنی بات کہنے والا نہیں کہ وہ نزدیک شاخ گل کے بل جھوٹے جاناہ پھندے لگا رہا جو صیاد چپکے چپکے  
عین ایسے وقت میں پکایا ہوا ”دون“ کی آواز گونجتی اور نال سے دھواں نکلتا ہے یعنی بادشاہ سلامت  
اپنے ہی دست مبارک سے ہندو دانے اور اپنے نزدیک بڑا کمال دکھاتے اور ان غریب پرہیزگار  
بے درماں اور آفت ناگمانی کی طرح پھروں کی ہچکار پڑ جاتی - اگرچہ بادشاہ بڑے قادر انداز نہ تھے -  
اور اسوجہ سے اکثر پھرے ٹھیک ٹھانے پر بھی نہ پڑتے بلکہ اوپر ہی اوپر ہوا میں اڑ جاتے لیکن باہمیہ

اس نیر کے ہوتے ہی چڑیوں کا ٹیڑی دل غوغا کر کے اڑتا۔ کچھ دیر ادھر ادھر ہوا میں بہو اسی کے ساتھ مٹا لٹا اور آخر کار جھیل کے کنارے والے جنگل میں اڑ جاتا۔ تب ملا زمان شاہی پانی میں کود کود کے مردہ اور نیم مردہ جانور نکال ایتے۔ اور بقتے درمیل بادشاہ کے دست بہارک سے فرق اقدس پر تصدیق ہوئے تھے اُنسے دو چند جانور جہاں پناہ کے رو برو ڈھیر کر دیے جاتے۔

ناظرین کے دل میں یہ سوال پیدا ہو گا کہ دو چند جانور کہاں سے آجاتے تھے۔ بلکہ وہ یقین ہی مانینگے مگر۔ یہ ایک واقعہ ہے۔ اور یہی ہمیشہ بیان ہوتا رہتا ہے بلکہ اگر بادشاہ کے نشانے سے ایک بھی زخمی نہ ہوتا تب بھی ایک تعداد کثیر زخم خوردہ جانوروں کی آجاتی۔ کیونکہ اسکا سامان تو پیشتر سے کر لیا جاتا تھا۔ بات یہ تھی کہ چونکہ ہر شخص کا کمزور خاطر بھی ہوتا تھا کہ جہاں پناہ کو راضی و خرسند کرے اسلئے وہ لوگ جو ٹخنوں ٹخنوں پانی میں ڈوبے کھڑے رہتے تھے پیشتر سے کچھ کچھ جانور اپنے پاس چھپائے رکھتے تھے۔ اور نہر فی ہوا۔ اور اُنھوں نے غوطہ لگایا۔ اب غوطہ لگانے میں اُنکو بھولی موقع ملتا تھا کہ جانور جو اپنے پاس چھپے ہیں اُنکو بھی نکال لیں۔ چنانچہ وہ ایسا ہی کرتے تھے۔ اور جب وہ ستر نکالتے تھے تو کچھ نہ کچھ جانور لے ہی کے نکلتے تھے اور اسوقت کسی کے منہ میں دانت نہ تھے جو یہ کہتا کہ یہ جانور بادشاہ کے نشانے کے مارے ہوئے نہیں ہیں اپنی جانب سے تو میں ناظرین کو یقین دلاتا ہوں کہ میں تو مشترک اس بارے میں ایک حرف منہ سے نہ کہتا۔ آخر۔ مجھے جو ایک ہزار روپیہ ماہوار ملتا تھا۔ وہ کس دن کے واسطے ملتا تھا۔ اسی واسطے کہ بادشاہ کو ناخوش نہ ہونے دوں۔

غرض کہ۔ اسی طرح تین چار دن متواتر یہ شکار ہوتا رہا۔ اور اسکے خاتمے ہی کے وقت صاحبِ ریڈ معد ہر بیان تشریف لائے۔ اسوقت بادشاہ نے یہ ممانعت کا حکم منسوخ فرما دیا۔ تب ہمراہیان صاحب ریڈنٹ اور ہلوگوں نے بھی شکار کھیل۔ ہلوگوں کے واسطے جھیل میں کشتیاں چھوڑی گئیں۔ اور جی کھول کے ہنسنے شکار کھیلے۔ بعد اسکے سد ہائے بوسے شکاری بازوں سے شکار کھینچنے کی نوبت آئی۔ معمولی باز کے شکار سے جو بعد کو کھیل گیا شکار بالکل مختلف اور خارج از عقل و قیاس تھا۔ ان سکھائے۔ سد ہائے بوسے جانوروں سے ایسے ایسے کام لیے گئے تھے جو انکی سمجھ سے بہت بعید معلوم ہوتے تھے۔ ان بازوں کو شکار ایک خاص طور پر سکھایا گیا تھا۔ یعنی پہلے تو ہزار ہا جانوروں کو دانہ وغیرہ ڈال کے لوگ جھیل کے کنارے پر جمع کرتے تھے۔ اسوقت چار پانچ باز چھوڑے جاتے تھے۔ بندوقیں لیکر ہم میں سے کچھ لوگ تو جھیل پر اکٹھے میدان میں کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور کچھ لوگ کشتیوں پر بیٹھتے۔ کبھی نئی کشتیاں دوڑاتے۔ اسی نشان میں ہزار ہا جانور پانی سے اڑ کر ہوا میں بلند ہو جاتا۔ اور بانٹے اوپر سے ان جانوروں کو گھیر گھار کر کے ایک قلم

پر قائم کر لیتے تھے۔ نہ اوپر ہوا میں بلند ہونے دیتے تھے نہ نیچے زمین پر اترنے۔ اسی حالت میں بیچ ہوا میں ہزار ہا جانور کو ہلوگ اپنی بند و قون کا نشانہ بنا لیتے تھے۔

واقعی یہ ہر کہ سارا سامان عجیب کچپ ہوتا تھا۔ ذرا آنکھ بند کر کے تصور کرو کہ اوپر ہوا میں تو سہاگن ہوئے باز ایک چکر باندھے ہوئے ہیں۔ اُنکے نیچے سے اور وحشت کھائے ہوئے شکاری جانور ایک دہائے میں تصور ہیں کہ نہ اوپر جا سکتے ہیں نہ نیچے آ سکتے۔ گھبرا گھبرا کے کبھی ادھر نکل جانے کا قصد کرتے ہیں کبھی آدھر۔ اسی اثنا میں ایک دوسرے سے ٹکرا بھی کھا جاتے ہیں۔ گتھ بھی جاتے ہیں۔ اور اسپر ستر ادھنہ کہ ایک جم غفیر شکاریوں کا۔ جنہیں سے بعض تو بھیل کے کنالے بند و قین چھتیا لے کھڑے ہیں اور بعض کشتیوں میں دوڑ لگا رہے ہیں۔

ہمارے اس پڑاؤ میں چار طرف عجیب چل ہل اور زندہ دلی نظر آتی تھی اور نت نیا سامان دیکھی پیش نظر رہتا تھا۔ لیکن بادشاہ سلامت کی شگفتہ مزاجی کی وہ کیفیت برقرار نہیں رہی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ قادر انداز شکاری تو تھے نہیں۔ لہذا اُنکو پورا لطف بھی نہ آتا تھا۔ بلکہ برخلاف اسکے یہ امر بالطبع نہیں آتا کہ وہ ہوتا تھا۔ کیونکہ درحقیقت یہ بات تھی کہ بحیثیت ایک شکاری کے اُنکی نشانہ بازی کے جذبات وقت کو گئی نگاہوں میں نہ تھی۔

ہم ملازمان خانگی جنگو سلسل اُنکی حضوری میں حاضر رہنا پڑتا تھا۔ اُنکے تکرر طبع سے سخت پریشان ہو جاتے تھے۔ غرض کہ بادشاہ کی یہ کیفیت دیکھ کر سب نے اُنکو ترغیب دی کہ آگے چل کر بڑے شکاریں جی بھلائیں۔

ایسی صورت میں مجھے اس خوشنما بھیل اور اُسکے گرد کے عہدہ شکار سے جدائی بہت شاق تھی۔ کیونکہ اس مصفا بھیل میں (جسکے کنارے پر گھنے گھنے خوشنما درخت اپنی پھلکی ہوئی شاخوں کے عکس سے صفحہ آب پر عجیب غریب نقش جمائے ہوئے تھے) کشتیوں کا کھینا اور اُنپر سے کبھی تو کتاہوں پر کے عظیم الشان شکار اُنکے موشیوں اور لشکریوں اور درگرد و دل بادل خیموں کا نظارہ کرنا اور کبھی اس تمام سامان کا انکوں سے اوچھل ہو جانا عجیب لطف دیتا تھا پھر کشتی میں بیٹھے ہی بیٹھے کبھی دفعتاً کسی سارس کا پانی میں پھر نظر آتا اور کشتی دیکھ کر اُسکا بھرا کرنا۔ اور اُڑنے پر پرتو لانا اور اُسی حالت میں کسی چیرہ دست شکاری کے ہاتھ سے اُسکا نشانہ ہو کر عالم تحریر بیان یا نجان ہو کر پانی میں ڈوب کر کھا جانا اور اُسکے پروں کے اُڑنے اور مینہ ق کے دھنسنے سے پھوٹے پھوٹے جانوروں کے غول کے غول کا رخوفا کر کے ہوا میں بلند ہونا۔ اور کبھی اس مہلت میں کئی بڑے جانور کا (جو پھلکی کے شکار میں معروف تھا) خود نشانہ اچھل ہو جانا۔ اور کبھی اسی منظر

میں غروب آفتاب کے وقت جو سماں نظر آتا تھا۔ اُس سے زیادہ حسین کیفیت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ یعنی عات و شفاف چادر آب پر سرخ سرخ شفق کا پرتو لگن ہونا اور ڈوبتے ہوئے آفتاب کی کرنوں کا گھنے گہمان جنگل کے سرسبز بقیوں پر سنہری افشان چھڑکنا۔ اور میں اسی جھٹ پٹے کے عالم میں جھیل کے کنارے اور پڑاؤ کے قریب بعض خدا پرست مسلمانوں کا نماز مغرب میں رکوع و سجود۔ قیام قعود میں مصروف ہونا اور اُنکی ہر حرکت کا پانی میں عکس دکھائی دینا۔ اور ان نمازیوں کے اوپر سرخی شفق سے لئی بہار نظر آنا۔ کیونکہ انہیں سے بعض تو شاہی باد کی گارو کی زرق برق وردی۔ اور باب آب و تاب سلو۔ سے مزین و اسلحہ ہوتے تھے۔ اور بعض اُنسے زیادہ سائے سپاہیانہ لمبوس اور بعض اہل حرفہ مہمونی پہناوا پہنے ہوتے تھے۔ اور جب اُنہر شفق کا عکس پڑتا تھا تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ سب دریلے احمر میں غوطہ مار کے نکلے چلے آتے ہیں۔ اُسوقت جھیل کے کنارے چڑیوں کی چھکار۔ بندروں کی تلقاریاں موقع موقع سے بہت ہی خوشگوار معلوم ہوتی تھیں۔ اچھیوں کا کندھے پر خاموش کھڑا رہنا۔ اونٹوں کا کبھی گردن ہلاتا کبھی خوشنمائی سے جھگائی کرنا۔ گھوڑوں کا اپنے تھانوں پر دانا کھانا اور بہننا۔ اور چھوٹی چھوٹی چڑیوں کا حشرات الارض کا اپنی آواز سے آسمان سر پر اٹھالینا بھی خالی از لطف نہ تھا۔ انھیں حشرات الارض کی پیچھے دھاڑ پڑھنا پڑتا ہو کہ یہی حالت انسانی زندگی کی بھی ہو۔ کاؤ کا کوچا منوانے آدمی دنیا میں کچھ زیادہ فائدہ رسان نہیں ہیں۔ عام طور سے تو جو لوگ زیادہ شور و غوغا مچاتے ہیں وہ کام کی باتیں کم کر گئے ہیں۔“

بادشاہ کو اندرونی حسد ملک کا دورہ کر کے شکار کھیلنے پر آمادہ کرنا کوئی دشوار امر نہ تھا۔ کیونکہ کھانا بڑھت کے آنے سے پہلے خود اُلوگو اپنے پرندوں کے شکار میں ایسا لطف لاتا تھا کہ خود انھیں نے آگے بڑھنے کی زیادہ خوفناک جانوروں کے شکار کھیلنے کی جانب اپنی رغبت ظاہر فرمائی تھی۔ اُسوقت تنگ میں تھے۔ ذکر چٹرا تو بول اُٹھے کہ ہم لکھنؤ جاتے ہیں۔ شیر سور (بندیلے) اور شیر کا شکار کھیلنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ حسب الحکم جھیل کے کنارے سے خیام شاہی اُٹھاڑے گئے اور شمال کی جانب کوچ کا حکم بول دیا گیا۔ کیونکہ اسی جانب بندیلے اور شیر وغیرہ کا شکار بکثرت تھا۔ بلحاظ اُس کرو فرادر بھیڑ بھڑکے جو بادشاہ کی ہر اہی میں تھے یہ تو بہ آسانی کچھ میں آسکتا ہر کہ قطع منازل بجلت ممکن نہ تھا۔

سامان شکار میں پالو بارہ شگہ بھی تھے کہ جو شکار کو چھاپ بیٹھتے تھے۔ باز بھی تھے کیونکہ ابھی ہانکے و نیچے سے شکار کھیلنا پھر بھی منظور تھا۔ اور چھپتے بھی تھے جو خاکسار ہرن کے شکار کے واسطے تیار کیے گئے تھے یہ سب کھنڈ میں بند گاؤں میں لے چلے جاتے تھے اور انھیں کے ہمارا اُنکے محافظ بھی تھے شاہی

حرم سرا بھی دمرہ سافراں میں تھی۔ جنہیں خاص نیکیاں شاہی۔ اور بہت سی نظر کردگان شاہی۔ رنڈیاں ڈومنیناں۔ خواہیں۔ پیش خدمتیں۔ اور پرہ دارنیاں۔ یہ سب بند سواروں میں سوار ایک فوج کی فوج تھیں باؤی گاؤں کا رسالہ بھی مغربی نیلگوں وردی سے بچا ہوا ساتھ تھا۔ ہاتھی بھی تھے جنہیں سے بعض خیمے وغیرہ سامان بار برداری لیجاتے تھے۔ اونٹ اور سانڈیاں بھی تھیں جنہیں سے بعض توہر کاروں کی سواری میں تھیں اور بعض بار برداری میں۔ گھوڑے بھی ریل پل تھے۔ اور ان سب میں ہمارے جلوس کو اضافہ کرنا چاہیے جس میں ہاتھی گھوڑے اور پالکیاں تھیں۔ اور اب خیال کرنا چاہیے کہ اتنے بڑے گاؤں لشکر کا سفر کرنا کھچھ آسان نہ تھا۔ جو کسی طرح یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ صرف ساتھ سے شکار کھینچنے جا رہے ہیں بلکہ ہی نہ ہوتا تھا کہ کوئی ہندوستانی راجہ قمار فوج لیکر کسی ملک پر چڑھائی کرنے چلا جاؤ اور شاہانہ فوج و سامان سے چلا جاؤ ہم لوگوں کی رے میں اس لشکر کا جہان گزر ہو جاتا تھا۔ بچائے دہاتیوں پر عذاب نازل ہو جاتا تھا اور وہ از حد پریشان و مرسیمہ نظر آتے تھے۔ کیونکہ اس سے پیشتر کبھی بادشاہ یا اسکے لشکر کا گزراں ملک میں ہوا ہی نہ تھا۔ اور ایک مشرقی بادشاہ کے لشکر کا دورہ غریب رعایا کے حق میں نمونہ قہر آتی ہوتا ہے کہ لشکر ان شاہی یہ سمجھتے ہیں کہ ہکوب طرح کی زیادتی معاف ہو اور رعایا پر دست درازی کر نیک ایک گونہ استحقاق ہوگا ہے۔ چنانچہ لشکریوں کے ہاتھوں بہت کچھ ظلم زیادتی اور جبر و تعدی غریب رعایا پر ہوتی تھی۔ علاوہ ہر بن راستے میں اگر کسی شتم کی سختی پیش آتی یا کوئی دشوار گزار راہ صاف کرنا یا جہاں سڑک نہ تھی وہاں سڑک بنانا منظور ہوتا تو بچائے دیہات کے باشندے زن و مرد۔ بچے بوڑھے۔ سب بیگاریں پکڑتے۔ اور جب ملک نواب چاہتے ان غریبوں سے مفت کام لیتے۔ بلکہ اگر کام میں درستی یا ذمیل ہوتی اور نواب کی مرضی کے موافق ہوجلت نہ ہو سکتی تو اچرت کے عوض مار دھاڑ۔ گالی گلوچ نصب ہوتا۔ انگلستان کے باشندے غالباً خیال کریں گے کہ یہ ناممکن بات ہے۔ مگر ہندوستان میں جن لوگوں کو دیسی ریاستوں کا کچھ بھی تجربہ ہو تصدیق کریں گے کہ اس معاملے میں میری تحریر لفظاً بلفظ صحیح ہے۔

غرض کہ اس لشکر کا ورود ایک دوسری جھیل کے کنارے جو اس پہلی جھیل قریب لکھنؤ سے ۴۵ میل کے فاصلے پر تھی ہوا۔ یہ جھیل پہلی جھیل سے طویل میں دو چند تھی لیکن صحراست میں بدرجہا زائید۔ جوں جوں ہم شمال کی جانب بڑھتے جاتے تھے۔ ہر کوہ ہمالیہ کا بر فیلا سلسلہ صاف نظر آتا تھا۔ اور ارہنی مڑوہ کردیمیان درمیان کوہستانی زمین اور گھنے جنگلوں کے ٹکڑے برابر ملتے تھے۔ کئی میل تک ایک سخت سڑک کا کہیں پتہ نہ تھا۔ ہاں شاہ اس کچے راستے کے جو بجلت نواب کے حکم سے درست کر لیا گیا تھا۔ اور یہاں تیرہ سو سترہ دھانوں کے کھیتوں۔ گنجان جنگلوں اور بیش بہا مڑوہ ارہنی کے درمیان ہو کر نکلا لایا تھا۔ جس کے نکالنے

میں بادشاہ اور انکی جمعیت کے آرام و آسائش کا خیال مقدم تھا اور غریب رعایا کی بربادی و تباهی کا خیال مؤخر۔

برطبق انتظام سابق۔ لشکر کا پڑاؤ جھیل سے کچھ فاصلے پر ڈالا گیا۔ چونکہ صاحب زمینیت امر تیرہ ہزار ساتھ نہ تھے اسوجہ سے صرف اُنکے غنیموں کی کمی تھی۔ حسب دستور سابق بادشاہ سلامت نفس نفیس شکار پر مصروف ہوئے مگر چونکہ اس جھیل کے کنارے دلدل بہت تھی لہذا انکو اس قدر فائدہ کا ایسا لطف حاصل نہ تھا اس جھیل کے فواح میں بنگلے اور مرغایوں کی کثرت تھی لہذا باز کے شکار کی نوبت بھی آئی جسکے شکار میں انکو کئی روز متواتر لطف اُٹھایا۔ سوا بادشاہ سلامت کے ہم میں سے کسی نے اس طریق سے شکار کو نہ کیا تھا۔ جو ہی باز کو چھوڑتے وہ تیر سا پہلے ہوا پر جانا۔ پھر شکار کو دیکھکے پہلے آہستہ آہستہ اُسکے گرد گھومتا پھر تیز می کے ساتھ پرنڈ پر حملہ کرتا اور فوراً اُس سے آوپر اڑ کر سب طرف سے بھاگنے کی راہ روک کر اسکا منتظر رہتا کہ اُسکو کسی ڈھب سے اوپر سے دبوچ لے۔ بالآخر بھلی کی طرح ایک دفعہ زمین کا رخ کر کے چلتا۔ اور نقصا میرم کی طرح جا فوراً کو اپنے پنجوں میں پکڑ کے چونچ اور پنجے سے جلد جلد بالکل گھائل کر ڈالتا۔ اور اسی حالت سے پنجوں میں دبائے ہوئے گدہ مذاقات و مقتول زمین پر آگرتے۔ یہ سب تماشہ واقعی قابل دید تھا اور ایک مرتبہ دیکھکے عجب انسان بے ہول نہیں سکتا۔ جو وقت ہلوک دیکھتے تھے کہ اب باز نے شکار کو دبوچ لیا ہوا چوٹ فوراً اُسکے تقاب میں گھومتے دوڑتے کہ دیکھیں کس مقام پر شکار ریہ گرا ہوا۔ اس تماشے کے دیکھنے کو بڑے بڑے سن لوگ انتہائے شوق میں بے سرو پا بلا لحاظ اپنی قوت اور راستے کی اتربی خرابی کے دوڑتے تھے۔ تماشے کے اشتیاق میں وہ اس طرح بے تماشہ بھاگتے تھے جیسے پیچھے سے کوئی غنیم آ رہا ہو۔ ہر شخص کی یہی فکر ہوتی تھی کہ میں سب سے پہلے باز کے موہ شکار کرنے کا تماشہ دیکھوں۔ باز و درہزی ہوشیاری سے جان جاتے تھے کہ اس جنگ میں باز کے کہاں کہاں زخم لگے ہیں۔ اور یہ ڈاؤنپس معنوں ہوتا تھا کہ باز بلا لحاظ اپنی چوٹ یا زخموں کی تکلیف کے کمال اشتیاق سے منتظر رہتا تھا کہ شکاریں جس قدر حصہ اُسکا ہے وہ اُس سے فوراً لے جائے۔

چونکہ بادشاہ شہسوار بہت اچھے تھے اسوجہ سے اس شکار کے تقاب میں انھیں خاص حظ حاصل ہوتا تھا۔ میرا بادشاہ کے بڑے خیمے میں روزانہ بعد شکار ہلوک کھانا کھاتے۔ کھانے پر ہنر کا سامان جو کھنٹوں میں ہوتا تھا بہرستور مہیا رہتا۔ صرف شراب کے اعتدال سے نہ پینے کی بیشک کمی تھی۔ اور کھانے میں ہی مزہ لیتا تھا۔ طرح طرح کے اوان نعمت۔ بڑے بڑے شہدیان۔ بیش بہا چٹنی و لٹری۔ شاہی نوشہیں اور پیچیدہ تہیں۔ سور کے پنکھوں سے معروف گیس رانی۔ اور باب نشاٹ سرگرم رقص و سرود۔ یہ سب

جنگل کو غصے بجائے ہوتا تھا۔ ہرگز قیاس نہیں کیا جاسکتا تھا کہ جنگل ایسے کسی مقام پر ہیں جہاں گھوڑے چھاپیں گے فاسے، بچے اور گروہ بالکل خشک ہی جنگل ہے۔

جو گنگا اس جنگل میں بڑھنے لگا اور شیر نہ تھے اس لیے ہکوان موزی جانور کے شکار کی چاہت میں آگے  
 شامی حصہ لٹکری جانا پڑا۔ اس جنگل میں ہرن البتہ بہت تھے۔ لہذا یہ تجویز کیا گیا کہ ہلوگ تین طریقوں سے  
 شکار کھیلیں۔ یعنی اولاً سداٹے ہوئے بارہ سنگوں کے ذریعے سے۔ دوم چیتوں کے ذریعے سے اور  
 خود گھوڑے پر سوار یا پیدل ہو کے۔ اور یہی تجویز ہفتہ آئندہ کے شکار کے لیے طے ہو گئی۔ کیونکہ اب اپنا وہ  
 سلاست جو ان کو زندگی سے مارنے یا پاؤں کے ذریعے سے شکار کرنے پر آگے لگائے تھے۔

[illegible]



ہوے۔ ہکو دیکھتے ہی اور جتنے ہرن تھے سب روجکڑ ہو گئے۔ فقط لڑے والے برابر میدان میں اڑے رہے۔

اسی اثنا میں ایک گروہ دیہی شکاریوں کا (جو اسی مقصد کی واسطے بھیجے گئے تھے) آہستہ آہستہ ہرنوں کے قریب پہنچ گیا۔ اور اُنکے اور جنگل کے درمیان حائل ہو گیا۔ اُنکے اس منشا کا ہکو اسوقت کچھ علم نہ تھا۔ اور سچ یہ ہے کہ اگر ہوتا تو ہم اُنکی مداخلت کو ہرگز روانہ نہ رکھتے۔ بالآخر ان لوگوں نے سانس کی طرف سے جنگلی زہروں کی راہ روک لی اور وہ ابھی تک بے خبر صوف جنگ تھے۔ اب وہ لوگ پھر سے چپکے چپکے اُنکے قریب پہنچے اور اپنے بڑے بڑے چاقوؤں سے اُنکے بدنوں کو گھائل کر نیکلے جسکی وجہ سے یہ غیب ولا چار جانور تھر تھرانے اور بہت ہی بیکسی کے ساتھ زمین پر گر پڑے۔ اور پالو بارہ سنگھوں نے پیچھے سے دھک پیل کر کے اُنکو چاروں شانے چت زمین پر گرادیا۔ یہ حالت دیکھ کر ان غریب بے زبانی زہلوگوں کو ترس آیا۔ کیونکہ ایک مرتبہ زمین پر گر کر کے وہ پھر اُٹھنے کے قابل ہی نہ رہتے تھے۔ جب یہ جانور گر چکے تو بارہ سنگھے واپس بلائے گئے۔ وہ تو اپنا کام کر چکے تھے محافظوں کی آواز اور اُٹھنے پر کتوں کی طرح سر جھکائے چلے آئے۔ اور کسی نے بھی اپنے شکار کی طرف نہ دیکھا۔ اُنیں سے بعض کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُنکے سینوں پر کاری زخم لگے ہیں اور جوتھ اُنکو حاصل ہوئی ہو وہ آسانی سے ہلکے دامن میں حاصل ہوئی جو۔

گھوڑو نیز سوار ہو کر پہنچے دیکھا کہ یہ نعمت بارہ سنگھے نشہ نعمندی میں غمور اینڈ تے برستے اور بڑی نکنت کے ساتھ اپنے سینگو کو بل دیتے۔ زمین پر کبھی کبھی سبزے پر نہ مارتے بہت ہی خوشی کے ساتھ آگے چلے جاتے تھے اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی انہیں لڑنے کا بہت کچھ دم و غولے باقی ہے۔ بلکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس جوش میں باغ و باغ نہ جائیں۔ اس کے ساتھ ہی ان غریب جانوروں کی حالت البتہ لائق رحم تھی جو زمین پر بے دست و پا پڑے ہوئے تھے۔ اُنکو نہ اب طرائے یا در ہے تھے نہ زخمیں۔ نہ انہیں یہ سکت تھی کہ اپنے سینگو کو بل دیں اور نکنت کی شانیں اپنی اکڑوں سے ظاہر کریں۔ اُنکی ماؤسی و حرام فیسی کی تصویر اُنکی حسرت آمیز نگاہوں سے معلوم ہوتی تھی۔ اور جنگ سے معذوری نیجانی یا جاں کنڈنی اُنکی پھرائی آنکھوں کے ڈیمیلوں سے ہو رہی تھی۔ اُنکی صورتیں کے دیتی تھیں کہ وہ ہماری اس ناجائز ترقی اور بزدلانہ کارروائی پر نفیر کرتے تھے کیونکہ ہمارے حرکات سرسرمظالم پر مبنی تھے۔

انگلستان میں مجھے کبھی خرگوش کے شکار میں جہاں ہزار ہا انسان اور غور انگوٹوں کا شکار ہوا ہو کے اُنکے پیچھے دوڑا ہے۔ اور خونخوار کتے کمال برہمگی سے اس غریب جانور کو پرچے پرچے کر ڈالتے ہیں

کبھی اتنا تعلق نہیں معلوم ہوا جیسا کہ اس شکار کے موقع پر جیسا کہ تصور ان بڑی بڑی آنکھوں واسے  
ہندوستان جانوروں کی زراعت پر اور ان کی بیکسی کی نگاہوں پر۔ اور اسکی وجہ یہ تھی کہ اودھ میں جس قسم کا  
شکار ہوتا ہے اسکی سختی کا میں نقل نہیں ہو سکتا تھا اور بے اختیار میرا دل دکھتا تھا۔ بادشاہ سلامت  
کے اشارہ فرماتے ہی ان غریب جانوروں کے سر تن سے جدا کر دیے گئے کیونکہ ایسے زخموں سے جو  
ہونیکے حالت میں آنکھوں کا کٹا لگانا بڑی ہی برجمی تھی۔ اُنکے حق میں سلوک ہی تھا کہ ایک اردہ میں زندگی  
کی کشتیوں سے آزاد کر دیے جائیں۔

ان پالو بارہ شکاریوں کے کھانے کا صرف یہی مشاؤ نہ تھا بلکہ مجھے معلوم ہوا کہ اگر حکم دیا جاتا تو  
یہ اپنے مخالفوں کو بلا ضرر زندہ کرنا دکر سکتے تھے۔ اسطور پر کہ عین حالت معرونی جنگ میں وہ آدمی  
مضبوط طریقوں کے پھندے بنا کر راہ میں ڈال دیتے اور پالو بارہ شکاری پیچھے سے جنگلی ہرنوں کو ڈھکیلتے  
اور شکاری لوگ چالاک سے اُنکو گرفتار دام کر لیتے۔ انکی گردنوں میں بھی پھندے پڑ جاتے۔ وہ جھپک جاتا  
اور پھر ڈرا سے اٹھنے میں پھندے گھومیں پھین جاتے۔ بیشک میں یہ احتمال ضرور تھا کہ اگر وہ ایسی  
حالت میں گھوم کر اچھا رسیدے ہوئے حملہ کرتے تو قریب کے ایک آدمی کی جان بھی جاتی۔ علاوہ  
اسکے اس طریق شکاریں یہ بھی دقت آپڑتی ہے کہ کہیں ایسا نہ پالو بارہ شکاری کے سینک میں پھندا پھنس جائے  
اور چاؤ کندہ راجا دہش کا مضمون ہو جائے۔ ایسے یہ کرتے ہیں کہ جب تک وہ نوں کو بھلے شاخ بٹا رہے ہوتے  
ہیں اسوقت تک پھندے نہیں ڈالتے۔ بلکہ ایسے موقع پر کہ جب وہ نوں جانور دم لینے کیواسے ایک دوسرے  
سے تھوڑے عرصہ کیلئے غلط ہو جاتے ہیں اسوقت پھندے ڈالے جاتے ہیں۔

ایک روز ہرن کے شکار کے واسطے پالو چیتے پھوڑے گئے۔ چونکہ اب یورپ کے اکثر ملکوں کے  
زندہ جانوروں کے عجائب خانوں میں چیتے اکثر دکھائی دیتے ہیں لہذا انکی صورت اور طریقہ کے تفصیل  
بیان کرکے چنداں ضرورت نہیں ہے۔ چیتے اور معمولی تیندے کی شکل میں یہ فرق ہے کہ چیتے کے سر کی  
ساخت مختلف ہے یعنی اسکا سر ہٹا اور چھوٹا ہوتا ہے اور اسکی کھال پر ہلکے سیاہ رنگ کی دھاریاں دور  
دور ہوتی ہیں۔ اور قد میں اور نیز قوت میں معمولی تیندے سے چیتا زیادہ ہوتا ہے۔ میں نے ملک سیلون میں  
اسہرے کے بھوک کے تاؤ میں شکار کی تلاش میں وہ جنگلوں سے باہر نکل آتے ہیں۔ اور بوڑھے مردوں اور عورتوں  
یا بچوں کو اُٹھا لیتے ہیں۔ سیلوں کے لوگوں کی زبانی یورپ کے سیاحوں اور مورخوں نے جو چیزیں لکھیں  
قصص و روایات تحریر کیے ہیں انہیں بجا مواظہیتوں کی قوت اور قد و قامت کے شک نہیں کیا جاسکتا۔ اگرچہ  
شمالی ہندوستان میں ایسے واقعات گوش گزار نہیں ہوئے کیونکہ یہاں مردم خوار کی اکثریت نہ ہوتی تھی

ہوتی ہے۔

کھڑے سے شکار کے پاس پہنچے گا بیجا کوئی انسان بات نہیں کر پیتے کے پاسنے واسے نکلے گا کہیں  
 انہوں کی طرح باخیز نہ لگے پھلتے ہیں۔ تھوڑی دیر تک وہ خوشی خوشی چلا جاتا ہے۔ لیکن جہاں کسی چیز پر اس کی  
 تھوڑی یا بھل کی طرف سے کوئی آواز اس کے کان میں آئی یا زمین میں سے کسی قسم کی بدامنی میں پہنچی اس  
 وہ خشک خشک کر چپے اور سر اٹھا اٹھا کر جو بنگے جس سے ادھر ادھر دیکھنے لگتا ہے۔ پھر چند ہی منٹ بعد وہ  
 بالکل بیجا ہو جاتا ہے۔ اس موقع پر اس کو دم کرنے کیلئے اس کا محافظ اپنے بائیں ہاتھ میں ایک ناریل یا ٹانگ  
 لیے رہتا ہے۔ جس میں گڑی کا دستہ لگا ہوتا ہے۔ فوراً وہ ناریل کو پیٹنے کی ناک کے قریب بھا کر اس کو چٹا کر  
 اور ٹانگ کے اثر سے وہ دھڑا کے دماغ میں سرایت کیے ہوتی ہے دفع ہو جاتی ہے۔ پھر وہ سیدھی بال  
 آگے بڑھتا ہے۔ اس بائیں میں جتنی مرتبہ علامات وحشت نظر آتے ہیں اتنی باری تہر تہر جاتی ہے۔ اور ہر  
 مرتبہ چٹا دھبہ ہو کر قاف میں آ جاتا ہے۔ جب چٹا اور اس کا حافظہ بھلا کے شکار سے بہت ہی تھوڑے  
 خانے پر پہنچ جاتے ہیں اس وقت چپنے کی آجھل بھانڈ اور بیانی لائی وہ ہوتی ہے۔ اور صحت پر واپس  
 بہن اپنی جان بچانیکے واسطے بے تماشہ چوڑی ہرے لگتا ہے۔ اس وقت وہ پیچھے بھاگتی۔ خدق و پچھنیں  
 دیکھتا۔ اور بڑے زور کے ساتھ طرف سے بھرتا۔ لالنگ پھانڈ، دوڑتا ہے۔ یہ دیکھتے چپنے کا خون بھی کھولنے لگتا ہے  
 گویا جہاں اسے قدرتی شکار ہے۔ اور ب دھبے اختیار ہو کر زمین بھرتا اور اچھلتا ہوا دوڑتا ہے۔ اور بلا خیال کسی  
 روک ٹوک کے بلی کی طرح کبھی درختوں کی ڈالیوں پر چڑھنے کے پھانڈتا ہے۔ کبھی پانی میں جا پڑتا ہے۔ فرشتہ کسی صورت سے  
 اپنے شکار کو بھاگنے کا موقع نہیں دیتا۔ یہ ساری کیفیتیں دیکھنے سے تعجب رکھتی ہے جسے انسان ایک تہ  
 دیکھنے کبھی اپنے صفوں دل سے نہ نہیں سکتا۔ اسے موقع پر جو سوار لوگ اس کے پیچھے دوڑتے ہیں انکی  
 کار گزار ہی بھی کوئی آسان امر نہیں۔ باوجودیکہ ہزاروں کوششیں لگائیں کہ بادشاہ باسانی اس شکار کا تماشہ ملاحظہ  
 فرمائیں اور باوجودیکہ کہ راستے ہر طرح صاف کر دیے گئے تھے اور شکار کی سیر دیکھنے کی واسطے مقبول موقع  
 بھی تلاش کر دیا گیا تھا پھر بھی نظر جھلے رہنا آسان نہ تھا۔ ہلوگوں کی سواہی میں ہی نہایت تیز اور بھانڈا ہوا  
 دیکھ گئے تھے کہ جو نہایت ہوشیاری اور تیز روی کے ساتھ شکار کا تعاقب کر سکتے اور کبھی بہن کی چوڑی پر  
 کبھی چپنے کی تہ پر نگاہ دکتے تھے۔ اسہ بھی انکار تیلی زمین دلدل اور جھاڑیوں میں آسانی سے گزر دینا  
 ممکن نہ تھا۔ چونکہ کوئی شاہی سڑک شکار کا تماشہ دیکھنے کی واسطے پہلے سے بنائی نہیں گئی تھی اس وجہ بادشاہ  
 اور اس کے ہمراہی اس راستے سے خوش نہ تھے۔ بہزاد خرابی افغان و خیزاں ہلوگ حتی المقدور ایک ساتھ  
 گھوڑے دوڑائے چلے جاتے تھے۔ کیونکہ یہ کسی کی تاب و طاقت نہ تھی کہ بادشاہ کے آگے گھوڑا نکال کر لے

و ادھ میں کسی تو ایک بے ہنگم بد قرارہ سوکھاتا چاڑنا۔ کسی دہی لانی گھاس میں اُبھنا پڑتا تھا۔ جس پر  
 بدشوری گھوڑوں کے قدم جھمکتے تھے۔ لیکن تاہم ہلوگ بدحواس اور پریشان خاک چھانکتے آگے  
 بڑھے چلے جاتے تھے۔ باوجود ان تمام بدشوریوں کے بدحواس ہوتا تھا کہ چیتا گویا ہوا میں اڑا چلا جاتا  
 ہے اور زمین پر قدم ٹک نہیں جاتا۔ چلتے چلتے ایک موقع پر کھلے میدان میں ایک ایسی جگہ پر گرا پڑا جہاں  
 چھوٹی چھوٹی جھاریوں کا جنگل چلا گیا تھا۔ اُس پر سے گھوڑے بلا خوف و خطر اپنی بائیں موقع موقع سے  
 فراسے بھرتے چلے جاتے تھے کہ جنگل پیاں رسید۔ اب چچا وہ ہرن اپنی چوڑی بھول چکا تھا اور جنگل  
 سامنے نظر آ رہا تھا۔ اگر اُس میں آنا بھی دم باقی ہوتا کہ وہ جنگل تک پہنچ سکے۔ تو اس گنجان جنگل میں  
 کسی طرح ہمارے ہاتھ نہیں لگ سکتا تھا اور فکر کا فائدہ ہی ہو جاتا۔ مگر دو بچا وہ اتنی دیر دھوپ ستے اتنا  
 غصہ و فحش اور اپنے خونخوار دشمن کے سخت تعاقب سے خوف زدہ ہو کر اس قدر جو اس باعث تھا کہ وہ سیدھا  
 ایک جھاری میں پہنچے کہ جنگل میں سے شروع ہر قلابچہ اس کے ہور یا۔ لیکن پہنچتے ہی بدپختے اُس کے  
 سینکدھامتا جاتا ہی کی بل میں اُلجھ گئے۔ اور جیسے ہی اُسے گردن پھیر کے اپنی غلٹی پہاڑی پختہ نے  
 اُسے دھچ لیا اور چھاب بیٹھا۔

اس پر بادشاہ سلامت بہت ہی محفوظ ہوئے۔ کیونکہ حضرت سلامت عین اُس کے دم درگ پہنچے  
 تھے۔ چونکہ وہ ہلوگوں سے دوسری کی پونچھ کی کیفیت اور اُس اشتیاق کا حال سن چکے تھے جو شہر کا رہی  
 کو اُس کے حاصل کرنے کی بابت ہوتی جو ہذا اُنھوں نے فوراً ہی بڑھکے ہرن کی دم کاٹ کر اپنی شکاری  
 توپی میں لگائی۔



## باب چہارم

جواب ترکی بہ ترکی

اس شکار کے وقت ہلوگ موضع ہھر کے شمال جانب چند میل کے فاصلے سے دریا سے گومتی اور اس کی شاخ گومتی ندی کے درمیان غنیمت ہوئے تھے۔

ایک بار کسی خاص ضرورت سے۔ خوب یاد نہیں۔ برن کی تلاش میں یا چیتے کے تعاقب میں۔ یا ہنیں معلوم کس وجہ سے ہلوگ کپ سے بہت دور پہونچ گئے۔ اور پلٹے پلٹے ہمارا گزرا ایک چھوٹے سے جھولے آب پہونچا جسکے کناروں پر سفید سفید پکدار بالو۔ کثرت تھی۔ فرسے میں بید شورا اور غار صورتیں ہاں ایک پسے ہوئے شور سے یا قوسا در کی ایسی۔

ہندوستان کے ماہران حقائق ارضی اور محققان طبقات الارض اس وغیرہ ریگ کے عجیب عجیب حالات اور فوائد بیان کرتے ہیں۔ اور انہیں باخود بابت کچھ اختلاف آرا اور قیل و قال ہو چکی ہے۔ جو کچھ مجھے علم طبعیات میں دخل نہیں ہے لہذا میں صرف اپنے شاہسے کے بیان پر اکتفا کرتا ہوں اور جو کچھ میں نے اپنے جواسوں سے محسوس کیا ہے اسی کو تسلیم کر کے قلمبند کرتا ہوں۔ اسی بنا پر وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ یہ صرف معمولی صاف ریگ ہے اور اسطرح کی ہے جیسے ساحل سمندر پر کبھی پانی پانی جاتی ہے۔ البتہ رنگت میں ذرا زیادہ سفید ہے۔ میرے نزدیک وہ لوگ مجھے ایسی بات باور کرانا چاہتے ہیں کہ جسکو مجھے خوب یاد ہے کہ میری عقل نے اس وقت تسلیم نہیں کیا تھا جب میں نے اپنی آنکھ سے اُسے دیکھا تھا۔

اس جھیل یا جھلے آب کا پانی فرسے میں بہت کھاری تھا۔ اور جس وقت ہلوگ اس شان سے ادھر آئے کہ پہلے ذرا تیزی کے ساتھ اور پھر آہستہ آہستہ اُس وقت لگے ہائے فاک ہوا پر بلند ہوئے اور سب طرفں چھا گئے۔ یہ معلوم ہوا کہ جیسے یہ ریگ ہوا سے بھی ثقل میں زیادہ نہیں۔

خوش قسمتی سے اس وقت ہوا تیز و تند نہ تھی۔ ورنہ ہلوگ بالکل آنکھوں سے محذور ہی ہو جاتے یا اینہہ جس قدر گرد آڑی تھی اُسکا اتنا اثر ہوا کہ آنکھ۔ کان اور ناک میں بہت کچھ سا گئی۔ اور اگرچہ دیکھنے میں یہ ذرے بہت ہی چھوٹے چھوٹے ہونے باوجود ایک تھے۔ تاہم ہر ذرہ آنکھ۔ کان میں گھسکا ایسا چھبتا تھا جیسے تمام جسم میں چونٹیاں لگ گئیں۔ ہمارے گھوڑوں۔ بھی بھی اثر ہوا تھا۔ وہ بار بار دروزد سے کھانستے کھانستے تھے کہ شور سے اثر سے نجات پائیں۔ اور بار بار پانی کی طرف پلٹنا چاہتے تھے حالانکہ وہ نہایت شورا و ید مرزا تھا۔

اس واقعے سے گویا ہمارے شکار کے خاتمے کی بنیاد پڑ گئی۔ کیونکہ اسکا اثر بادشاہ سلامت کی آنکھ ناک پر بھی دیا ہی پڑا تھا۔ جیسا ہلوگوں پر۔ اور اس موقع پر نہایت غم و غصہ کی حالت میں اُنکی زبان سے کلمات نہ لانا کم اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں نکل رہے تھے۔ ہماری جماعت کے ایک صاحب جو ماہر حقائق ارضی تھے کہنے لگے کہ بدو دنیا پر ایسے عجائبات کم نظر آتے ہیں اور ہماری خوش قسمتی تھی کہ ایسے موقع پر ہمارا گڑبگڑ گیا جسکے۔ خاتمے و مشاہدے کی واسطے وہ انما یان یورپ بہت کچھ لو پانی پک کرتے اور ہزاروں منزلوں کا سفر اختیار کرتے ہیں۔ بیشک اُنکی اس بات نے اُسوقت ہلوگوں کو شہود بہت مراضہ و دیا۔ مگر اُسوقت تو سب کا حال یہ تھا کہ کھانستے۔ کھنکھاتے۔ چھینکیں پیتے اور آنکھیں ملتے چلتے جا رہے تھے۔ بادجو دیکھ ہم میں سے اکثروں نے جیسے ہی اس خاک کا اثر محسوس کیا فوراً اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ مگر پھر بھی یہ ریزے بند ہلوگوں کے اندر بھی اپنی رسائی پیدا کرتے۔ آنکھوں سے نکلے جاتے تھے اور ہلوگوں کو بڑا اندیشہ اس بات کا تھا کہ کہیں ہمارے گھوٹے اندھے نہ ہو جائیں۔

بعض دانشمند لوگ بتاتے ہیں کہ پوچھ پٹھیں کے کہ کیوں حضرت۔ اس بالوکی دلدل میں پھنستے ہی آپ لوگوں نے پیچھے پلٹ جانیکا ارادہ کیوں نہ کیا۔ اور آخر۔ آگے کیوں بڑھے چلے گئے؟ لیکن مندرجہ بالا بیان پر غور کرنے سے اُنکو معلوم ہوگا کہ فی الحقیقت ہلوگوں کو نہ تو اس سرزمین سے کوئی اُنس یا لگاؤ تھا۔ نہ حقائق ارضی کے تجسس کا ایسا ذوق کہ ہولوگ کے شہید و نہیں داخل ہونیکے واسطے ہلوگ اپنے ہاتھوں آفت میں مبتلا ہوتے بلکہ بغاوت اسکے ہلوگوں کی ہر لحاظ یہ متنازعہ کی کسی طرح جلد اس ہلما سے نجات پائیں لیکن یہ ممکن نہ تھا۔ کیونکہ اس ریگستان میں ہلوگ دفعۃً نہیں پہونچے تھے۔ بلکہ پہلے تو کسیکو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ کہاں سے ریگستان شروع ہوا اور کہاں جانے کے ختم ہوگا۔ رفتہ رفتہ کر کے ہلوگ اس بلاتین پوں گھر کے رتھے کہ پہلے تو جا بجا کچھ تیکریاں۔ ریت کی ملیں۔ اور کسی مقام پر تو انہیں کچھ مٹی بھی ملی ہوئی تھی اور کسی جگہ چال نظر آتی تھی جیسے پہلے کیا ہو کہ اُنکی روک سے ریگ دلی ہوئی تھی۔ چلتے چلتے تو دُری دور آگے بڑھ کر آئے اس ریگستان میں پہونچے کہ جہاں ہمارے گھوڑوں کے ٹاپوں سے اُڑاؤ کے یہ ریت ہوا میں بند ہوئی اور اُسکے غبار سے ہم از سر تا پا آلودہ ہو گئے۔ اُسوقت جوہ لکھا تو معلوم ہوا کہ پیچھے پھر کے لوٹ جانے سے آگے بڑھنے میں مسافت کم طے کرنا ہوگی۔

اُس روز شام کو جب ہلوگ اپنے اپنے غیموں میں پہونچے تو حسب معمول خاصہ کیوقت شاہی میز پر حاضر ہوئے۔ اُسوقت ملک بادشاہ سلامت پر اس تکلیف و زحمت کا اثر باقی تھا۔ اور آنکھ ناک میں یہ ریزہ ہمارے خاک کشک رہے تھے۔ طبع محلی کد نہ تھی۔ اور بات چیت بھی بہت اکھڑی اکھڑی تھی۔

اُس شب کو المصنوعہ جوگوں سے زیادہ مخاطب نہیں ہوئے۔ خاصہ تر اشپ کا سفر۔ معالجین کے  
 کے لطافت و ظرافت۔ تاچ کا گانے کسی چیز سے غیرِ خاطر شکستہ نہ ہوا۔ اس کو زیادہ تر غصہ اس بات رہا  
 کہ اس کو چلتے سے اس عیبت کی خبر کیوں نہ کر ہو گئی۔ ہمارے ہیران ماہر حقائق ارضی نے جہوت پر اسے  
 ظاہر کی کہ اس مقام پر ایک بیش بہا کان نکل سکتی ہے تو بادشاہ سلامت نے اسے کیسے توجہ کے ساتھ سن  
 تو کیا مگر اُس پر کچھ انتہات نہ فرمایا نہ کوئی حکم دیا۔ بلکہ وہ اُس طرح بد مزہ اور بے کیف رہے۔ اور غلافان معمول ذرا  
 سویرے ہی سے داخل کلاسد ہو گئے اور جوگوں نے بھی جلسہ خلافت کر کے اپنے اپنے غیر ملکی راولی۔  
 خدا ہی اُس عبادی نیابت (عورت) پر رحم کرے جسکی قسمت میں یہ لکھا ہو کہ ایسے وقت میں آپ  
 پر اندر و خستہ اور پر غضب خود مختار بادشاہ کے بدلے یا ناراض کر نیک سبب ہو۔ اتفاقاً چھینک مینا۔ معمول ہی  
 ذرا زیادہ اور اسے کھانسا۔ کھنگھارنا۔ بلکہ ذرا سی بہ نایا ہے قطع بعض عضوہ کی بعض اوقات ایسی شین  
 سزا داتی ہے کہ چمکے خیال سے روح کو وحشت ہوتی ہے چلے اور اگر بڑی مائیں۔ بیویاں۔ بیٹیاں اُسکے  
 ہی سنیں تو کانپ اُٹھیں۔ لیکن ہندوستان میں ہندوؤں کے زمانہ خانوں میں ایسے ایسے امور اکثر وقوع ہوتے  
 رہتے ہیں۔ انگریزی مبشرین جانتے ہیں کہ اکثر ایسے واقعات ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن وہ تعارض  
 کرنے سے محذور ہیں۔ ورنہ خانہ یاحرم کے ساتھ تقدس کا خیال و اثر سائر جوار و کثرواں کے نفسی حالات کوئی  
 مانا نہیں یا تو ذی بانہی باہر ظاہر کر دے تو اسکی سزا نہایت دردناک موت دیجاتی ہے۔ اور یہ تکلیف ایذا  
 انہیں عورتوں کے ہاتھوں سے اُسکو پہنچتی ہے جسکے تحفظ یا منفعت کے خیال سے نفسی حالات کا اہتمام کیا  
 گیا تھا۔ بعد اسی وجہ سے ان مقامات کے حالات بھی پردہ خفایں رہتے ہیں۔ اسیر اور دولتمند لوگ تو  
 ایسے موقع پر عروت بہ رنجی سے منبرے تعذیری ہی دیتے ہیں۔ البتہ اگر ایسی کسی بات سے بادشاہ کا  
 شعلہ غضب و غضب بزرگ اُٹھتا ہے تو اسکے غیر محدود اور ناہستہ خیالات صرف کیے جاتے ہیں یعنی  
 بلاتامل اور بغیر تحقیق مزید فورا گردن مارنے کا حکم صادر ہو جاتا ہو۔ ایک مرتبہ ایک بے تیز روشی ہندو راہر  
 نے اپنے ایک دوست اور ہمین سالار سے کہا کہ ”میری بیوی حاملہ ہے۔ اگر ابکی بار اسنے جوکانہ پیدا کیا تو  
 بیشک کوڑے مارنے لگے اسکی جان ہی لوگیا۔ چند روز بعد اُس رانی کے لڑکی پیدا ہوئی اور سنا گیا کہ  
 دورہ زہد سے حل کے اُس کجمنت رانی کی لاش جلادینے۔ اور نہانخانہ کی چاند پوری سے باہر کیسے معلوم  
 بھی ہو سکے کہ وہ کیوں مری۔ راجہ کی اس دھکی کا حال کھلا بھی تو بہت دنوں کے بعد۔ اور وہ بھی اہل  
 ملہ و ملو اور وہ میں کوئی ہندوستانی حضوری شاہ میں پھٹنے کے جرم کا مرتکب ہوا تو اسکی سزا میں ہی کہ اس کی ناک  
 آڑا کیا گئے۔ یہ ویشنا سڑا شرقی و ربد میں کچھ بھی ذرا نہیں جو۔ مصنف

کہ ایک مصیبت نئے کے کالعدم کرینگے واسطے انھیں سالٹر صاحب کو اسکی ضرورت پڑی کہ راجہ کو بجائے  
کیرسنی دیوانہ و فائر عقل ثابت کریں۔ تب یہ راز بھی طشت از با م ہوا۔

اب تک ہمارے شکار کیواسطے موسمی حالت بہت اچھی تھی۔ لیکن اسی شب کو (یعنی جسروز بہت  
سی خاک بھانگی تھی) یہ واقعہ ہوا کہ ہلوگ جیسے ہی پٹنگ پر اطمینان خاطر کے ساتھ لیٹ کے منڈ بلانے لگے  
دفعۃً بڑی گرج دھمک کے ساتھ موسلا دھار مینہ برسنے لگا۔ اور ہلوگ کھڑکڑائے اٹھ بیٹھے۔ معلوم ہوا  
کہ موسم برشکال کا پیش خیمہ آگیا۔ بجلی اس تیزی اور تابش سے چمکتی تھی کہ جیسے منظرہ حارہ کے سوا کوئی نہیں  
نظر آتی۔ ہم پانچوں آدمی اس شے بھاری مربع ٹیپے میں بیٹے ہوئے یہ کیفیت دیکھ رہے تھے کہ کبھی بادل  
کی گرج اس زور سے کانوں میں آتی تھی جیسے ہمارے سرو پر ہے اور شامیانے کی چوڑوں کے سوسے ہی  
پر گرج ہو رہی تھی۔ کبھی بجلی کی چمک مک سے سارا خیمہ نور ہو جاتا تھا۔ اور آسمان پر اسکا کوڑے کی طرح  
رہ رہ کے چمک اٹھتا ہوا کونچے کے اندر سے نظر آتا تھا۔ حالانکہ ہمارا خیمہ دوپٹا تھا۔ پھر بھی یہ حال تھا کہ  
گھڑی گھڑی کے بعد ایسی روشنی ہو جاتی تھی کہ خیمے کے اندر کی ایک ایک چیز صاف معلوم ہوتی تھی بلکہ وہ  
کالے کالے بادل بھی جو آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ اور پھر وہی اندھیرا۔ وہی تاریکی۔ وہی ہاتھ کو ہاتھ  
نہ سوجھنا۔

آدمی رات آگئی۔ جب ذرا بادلوں کی گرج کم ہوتی تو ہوا کی سننا ہٹ دیو غراں کی طرح سنائی دیتی تھی۔  
اور اُسکے زور شور کے تھپیڑوں کے سبب ہمارا خیمہ بار بار سر جوڑ ہوتا۔ چوہن کبھی ایک طرف جھکتیں تو زمین سے  
لگ جاتیں کبھی دوسری طرف اٹھتیں تو اوپر تن جاتیں۔ چوہوں کے ساتھ ہی خیمے کے کپڑے میں بھی ہوا بھر  
جاتی تھی۔ ہمو تو یقین ہو گیا تھا کہ دو گھڑی میں خیمہ ضرور گر جائیگا۔ اور چونکہ اب سب لوگ ہوشیار و خبردار ہو چکے  
تھے۔ اسوجہ سے آپس میں اسی خطرے اندیشے پر گفتگو کر رہے تھے۔ لیکن یہ ہلوگوں کی غلطی تھی۔ ہمارے  
خیمہ تنگ روں نے پہلے ہی سے یہ بندوبست شروع کر دیا تھا کہ کہیں تو ایک سیخ ٹھونک دی۔ کہیں ایک رتی ہانڈ  
دی اور گھیر گھاڑ کے سب طرف سے جکر بندی کر دی۔ ظاہر ہے کہ ایسے طوفان ابر و باد سے سائے لشکر میں  
ایک بلی جھپکی تھی۔ جب ذرا گرج۔ کہ کہ کے شور سے فرصت ملتی تھی تو اس وقفہ میں ہلوگوں کو ملتی ہنسا  
اونٹوں کا بلبلانا۔ اور ہاتھیوں کی چنگھاڑ۔ اور آدمیوں کے شور و غوغا کی آوازیں برابر سنائی دیتی تھیں۔  
جب ذرا طوفان کی زور اور بیان کم ہوتیں تو ہلوگ آپس میں کہتے کہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ  
جانور چھوٹ گئے ہیں۔

خدا خدا کر کے طوفان گھٹا۔ اور شور کم ہو چلا۔ لیکن لشکر میں شور و ہنگامہ سبجائے کم ہونیکے اور زیادہ



بلند چہ۔ اور ہلوگوں نے آپس میں یہ کتنا شروع کیا کہ ”قرینہ یہی کتا ہو کہ بہت سے جانور چھوٹے ہیں خدا کرے ایسا نہ ہو کہ ہاتھی نیسے کے قریب آکر بیٹھیں اچھ جائیں ایسا ہوا تو خیمہ کی خیر نہ ہوگی“ اسی مضمون کی دعا ملک کے اور اپنے خدا شکار کو یہ حکم دیکے کہ ذرا دیکھتے بھاسے تر ہیں کوئی جانور اس کے ہکونہ ستائے ہلوگوں نے پھر تہیہ کیا کہ ذرا آرام کر لیں۔

آسوقت آدمی رات سے لیا وہ گزر چکی تھی۔ اور چونکہ ہمارا خیمہ بہت نفیس بنا تھا۔ حتیٰ کہ اُس میں پانی بہت ہی کم پکا تھا۔ اسلئے ہلوگ منیسے پاؤں پھیلانے کے لئے توندی کے بیٹھے بیٹھے چھوٹے آنے لگے مین ہنوز نیم خواب تھا۔ سینے کچھ خفتہ کچھ بیدار۔ اور اس خیال میں گن تھا کہ ایسے وقت میں جبکہ ہمارا خدا جانے کس مصیبت میں گرفتار ہیں۔ میں اس نرم اور گرم کو بچ پر دراز ہوں۔ با انہم جانور کی خیر دعا اور آدمیوں کا نقل چلا ڈالا اور بھی زیادہ ہو رہا تھا۔ اور اسکی وجہ سے سونا شکل تھا۔ لہذا۔ میں نے اپنے خدا شکار سخی بخشو سے کہا کہ ”بخشو! ذرا باہر جا کے دیکھ قویہ غل کیا ہو رہا ہے“ بخشو گیا۔ وہ ابھی واپس بھی نہ آیا تھا کہ کہنے دروازے پر سے ایک اور آدمی کو پکارا۔ اور بھنے یہ سنا کہ کوئی کہ رہا ہے کہ ”جا پناہ کا چہ دار کچھ پیام لے کر آیا ہے“

وہ پیام یہ تھا کہ ہم پانچ آدمیوں میں سے ایک صاحب جو شاہی ہاڈی گاڑ کے رسالے کے کپتان تھے انکی نسبت جا پناہ کا حکم ہر کہ ”خدا حاضر ہوں“ یہ حکم سنتے ہی ہم سب اٹھ بیٹھے اور لگے خیال کرنے کہ کوئی ایسا ہی غیر معمولی اور اہم امر پیش آگیا ہے۔ جسکی وجہ سے ایسے طوفان کی حالت میں اور نا وقت کپتان کی طلبی ہوئی ہے۔ چہ دار سے پوچھا تو اسنے کہا ”مجھے نہیں معلوم۔ کوئی ضرورت و دشمنی اتنا جانتا ہوں کہ خیام شاہی میں بڑی گڑبڑ بھی ہوئی ہے۔ اور ایک خیمہ ہو اسے گر گیا ہے“ تو عقل آمانیاں ہولے لگیں۔ ”کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ فوج وزیر سے جتنے سپہرہ خیام شاہی کا انتظام تھا۔ بادشاہ سلامت خفا ہو گئے ہوں اور اسکی پاداش میں انکی گرفتاری اور“ ”یہی سی جگہ قتل“ کا حکم دیدیا گیا ہو کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ حرم شاہی میں کوئی خطرناک واردات پیش آگئی ہو۔ اور ”کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ“ لیکن زیادہ عقل آرا کی کی کچھ ضرورت نہیں۔ جو کچھ ہوگا دو گھڑی میں معلوم ہو جائیگا۔

کپتان صاحب کی روانگی کے بعد تھوڑی دیر بعد میرا خانا مان واپس آیا اور یہ خبر لایا کہ بادشاہ کے ہمارے نہیں چل کوچ کی عیاریاں سرگرمی سے ہو رہی ہیں۔ مگر یہ تحقیق نہ ہوا کہ کس وجہ سے۔ بلکہ جب اسنے ایک جہدار سے وچ پوچھی تو اسنے جواب میں اسنے ایک گتہ ارسال کیا۔

اتنی بات سننے سے ہلوگوں کا خاک بھی اٹھان نہ ہوا۔ چونکہ پانی ابھی جھا جھم برس رہا تھا۔ اسلئے

ہم میں سے کسی کو یہ جرات نہ ہوئی کہ خود باہر نکلے اور کچھ تفتیش کرے۔ آخر کار کپتان صاحب نے اسے اور کہنے لگے۔

”مارو! ہم تو جانتے ہیں۔ تلوک اپنی جان و مال کی حفاظت کرو۔“

ہم سب لوگ ہنر بان ہو کے بول اٹھے۔ ”اے بھئی۔ کہاں؟ کون کون؟“

انہوں نے جواب دیا۔ ”چاہناہ نے فوراً آدھ گھنٹے میں لکھنؤ کا کوچ و لدا ہے۔ ہلوگ اور اٹلی کل فرج سے محلات شاہی ہمارا درکاب ہونگے۔ بادشاہ بہت ہی برہم ہیں اور فوراً لکھنؤ جانا مناسب جانتے ہیں دیکھو۔ میں پھر تیسے کہتا ہوں کہ اپنے اسباب کی بخوبی حفاظت کرنا۔ نہیں۔ گنوار لوگ کبھی گنوار دیا یہ کیونکہ کپتان صاحب نے جلد جلد اپنا پورا بدھنا یوں بھلت سمیٹنا شروع کیا۔ کہ کبھی تو خدنگا کو حکم دیا کبھی کچھ اسباب اردلی کے سپرد کیا۔ اور لیس ہو گئے۔ اب میں نے اُسے پوچھا کہ کیا واقعی۔ تلوک اندیشہ ہے کہ گاؤں والے کچھ دست درازی کریں گے اور ستائیں گے۔ اسپر انہوں نے کہا بیشک جیسے تم مستعدی کے ساتھ اپنی حفاظت کرو گے۔ ایسا تو اکثر اتفاق ہوا کہ جہاں گنوار دیا تو تنوس گن لگتی کہ بادشاہ سلامت سے لاؤ لشکر کوچ کر گئے ہیں اور خالی کچھ ہمراہی اور بھیڑ کے لوگ رہ گئے ہیں وہ تو پٹے اور جو تختیاں اور مصیبتیں ملازمان شاہی کے ہاتھوں خود اٹھا چکے ہیں۔ اُسکی تلافی کر سیکے۔“

بادشاہ کے ہمراہ ہلوگ جا ہی نہیں سکتے تھے کیونکہ اول تو ہمارے پاس ملازمان کافی تعداد میں نہ تھے۔ علاوہ اسکے ہماری نسبت بادشاہ سلامت نے یہ حکم دیدیا تھا کہ نواب یعنی وزیر کے ساتھ آئیں اور میں پچاس ہیل کا سفر کرنا ایسا آسان نہیں ہے جیسے یورپ میں عمدہ عمدہ سڑکوں پر سفر کرنا۔ یہ سننے دیگر آدمیوں سے ہر ایک کے ہمراہ ایک ہاتھی۔ کسی کے پاس ایک گھوڑا تھا اور کسی کے پاس ایک سے زائد۔ لیکن دنگو سفر کرنے کے واسطے بند گاڑیاں یا پاکیاں رکارتھیں۔ اور پاکلیوں کی واسطے سڑک پر سلسلے کے ساتھ نکالوں کی ڈاک بٹھانا بھی ضروری تھا۔ پھر یہ لازمی تھا کہ آدمیوں کی وجہ سے ہکو بہت کچھ اسباب پیچھے چھوڑ دینا پڑتا اور جو اسباب ہم یہاں چھوڑ جاتے وہ یقیناً ضائع ہوتا اور ہمارے ہاتھ نہ لگتا۔ کیونکہ اگر دہاتی لوگوں سے بچ بھی جاتا تو نواب کے ملازمین کے ہاتھوں سے ہرگز نہ بچتا۔ انچہ اڑدو دہاتی و درتال برد کا واسطہ تھا ایسی صورت میں بچر اسکے چارہ کار کیا تھا کہ صبح کے انتظار میں رات کاٹیں۔ اور صبح ہو چکیں کہ نواب ہمارے لیے کیا ہندو بیت کرتے ہیں۔ اور کہتے آدمی بکھڑپتے ہیں۔

بادشاہ سلامت سوار ہوئے۔ سواری بڑھی۔ ہم نے بھی غم میں بیٹھے بیٹھے گھوڑوں کی ہنہات ہاتھ کی کے کنارہ دیکھی۔ ”ہنہا ہنایاں“ کی آواز۔ ہاتھوں کی بھاری بھاری پاؤں کی چاپ سن لی۔ رفتہ رفتہ

جس قدر یہ سواری دور ہوئی گئی آوازیں بھی مدھم پڑتی گئیں۔ اور آخر کار ستا جا ہو گیا۔ بادشاہ سلامت کا حکم بھی نادری حکم ہوتا تھا اور دھڑلے سے بات نکلی۔ اُدھر فوراً قبیل ہو۔ اسی وجہ سے سواری چلی تو بس چلی کہیں رکھنے تھیں کا کیا ذکر۔

اب بھی خیمے کے باہر کچھ ہونہ ا باندی ہو رہی تھی۔ رات نہایت تیرہ و تار دور آؤنی اور سنسان تھی۔ خیمے کے اندر ایک چھوٹی سی میز پر بیچ میں لمپ روشن تھا۔ لیکن سرد ہوا کے داب کیو جس سے اُدھر اُدھر کی چیزیں ذرا دھندلی دھندلی نظر آرہی تھیں۔ ہم چاروں آدمی اپنی اپنی چار پائیوں پر بس ترکیب سے لیٹے تھے کہ دو خیمے کے اس طرف اور دو اس طرف۔ ہماری پالکیاں بھی خیمے کے دروازہ پر لگی ہوئی تھیں۔ البتہ میری پالکی ایک دروازے کے اندر رکھی تھی۔ کپتا ن صاحب کی بات ہمارے کانوں میں پڑی ہوئی تھی۔ اور اُسکی وجہ سے ہلوگوں نے یہ قرار د کر رکھی تھی کہ ایک ایک گھنٹہ باری باری جمع تک ہم میں سے ایک شخص برابر جاگے۔ اور اپنے سامنے میز پر ایک جوڑی پستول اور ایک تلوار رکھتے رہے۔ چنانچہ اس صورت سے ایک صاحب نے (جو اسٹریا کی فوج میں افسر درگین رہ چکے تھے) اُنکی وضع قطع سپاہیانہ تھی اور بڑی بڑی موچیں رکھائے تھے) پہلے نوکری دی۔ اور اپنے منہ میں ہرٹ دبا کر کرسی پر پہرہ دینے کو جا ڈٹے۔ خیمے کے اندر فرش پر اُدھر اُدھر بہت سے ہندوستانی خدمتگار پڑے ہوئے لیکن اُن پر کمال بھروسہ نہیں ہو سکتا تھا۔ علاوہ اسکے ہلوگوں کے دل میں اُن دہاتی گنواروں کا بڑا اثر پایا ہوا تھا جن غریبوں کو ایک روز قبل یہ لوگ سخت گالیاں دے سکتے بلکہ زد و کوب بھی کر سکتے تھے ہمارے فوجی محافظ صاحب اس شان سے کرسی پر جلوہ فرماتے کہ وہ آسانی دونوں دروازوں کی نگہبانی کر سکتے تھے۔ جب مجھے مزید آ رہی تھی تب ہی میں نے اُنکو اس وجہ سے دیکھا کہ میز پر کچھ پاؤں پھیلے۔ آرام کرسی کا ٹکدہ لگائے۔ اپنے پا جاٹے کے کمر بند میں دونوں ہاتھ ڈالے اور ٹیلا چرٹ (یہ چرٹ یقیناً بادشاہی ہونگے) منہ میں دبائے۔ برے برے بلفے دھویں کے اڑاتے تھے بیٹھے ہیں یہ دیکھتے دیکھتے میں تو بخیر سو گیا۔ میری چار پائی بائیں جانب اور دروازے کے قریب بھی تھی۔ اور ہمارے محافظ صاحب کی پشت اُسی طرف تھی۔ میری چار پائی کے برابر ہی میرا ہندوستانی خدمتگار اپنی چادر میں لپٹا۔ نیلے کپڑوں کی ٹھری بنا ہوا پڑا تھا اور مزے سے خراتے لے رہا تھا۔ میں سو تو گیا ہی تھا مگر ابھی ذرا ہوشیار تھا کہ میں نے اپنے برابر ہی کسی کے آہستہ رینگنے یا کھسکنے کی آواز سنی۔ میں نے آنکھیں تو کھولیں مگر مطلق جنبش نہ کی۔ چپ چاپ پڑا رہا۔ اور بجائے خود ہمت ہوشیار و خبردار ہو گیا اسی حالت میں میں نے دیکھا کہ ایک کالا کالا ہاتھ جیسے زمین سے نمودار ہوا۔ اور میرے قریب ہی

کے گوشے میں ٹہن کے صندوق پر جو گھڑی رکھی ہے وہ اُسے اٹھائی ہے۔ جھک پڑے طور سے یہ یقین تھا کہ میرے سائے سفید کپڑے جو دھلے دھلائے میں لکھنؤ سے لایا تھا وہ اسی گھڑی میں بندھے تھے لہذا مجھے اس میں کیا تا مل ہو سکتا تھا کہ فوراً ایک جست میں اسی ہاتھ کو پا جاؤں اور کپڑوں لیکن جب تک میرا ہاتھ پڑے پرے ایک شخص اُچک کے بھاگا۔ اور ہاتھ میں گھڑی لیکے بھاگا۔ ہاتھ فوجی محافظ نے میری آواز سنتے ہی فوراً اپنے پستول پر ہاتھ ڈالا۔ اور میری ہی طرف پورا نشانہ تاکا۔ کیونکہ میں ذرا دیر کیو اسٹے گھنٹوں کے بھل بیٹھ کے اپنی کوچ اور دروازے کے درمیان فیصل کو دیکھ رہا تھا۔ اس خیال سے کہ چور ابھی دروازے سے باہر نہ نکلا ہوگا۔ یہ سب ایک گھڑی بھر کا کام تھا۔ اب ہاتھ محافظ متا پستول ہاتھ میں لیکے آگے بڑھے۔ اسی مابین میں چور چھپکے چھپکے سانپ کی طرح رینگتا ہوا میری کوچ کے نیچے آیا۔ اور جو دروازہ قریب تر تھا اُسی طرف زقند بھر کے چلا۔ غالباً اسی دروازے سے وہ آیا بھی تھا۔

اسی عرصے میں سب لوگ جاگ پڑے۔ پوچھ کچھ ہونے لگی۔ غل مچا۔ چور کی دھندھیا شروع ہوئی۔ میری پالکی جو دروازے کے اندر رکھی ہوئی تھی اُسکے پٹ کھلے تھے۔ چور نے یہ خیال کر کے کہ اگر اندر ہو کے دروازے سے باہر نکلیا نا چاہیے اور مزقند بھری۔ فوراً ہی ہاتھ محافظ صاحب نے اُس پر پستول کا فیر کیا۔ میں نے بھی تلواریکے جب پٹا ہوں تو چور کی پالکی میں جاتے وقت جھلکی دیکھی۔ پالکی کے اندر میرا ایک نوکر پڑا سو رہا تھا۔ جیسے ہی چور اُسکے اوپر گرا وہ اچھلک چور کے ساتھ ہی پالکی سے باہر آیا اور خیمے کے دروازے کے سامنے کچڑ پانی میں لوٹ لگانے لگا۔ وہ یہی بھکا کہ صندوق بھی پر دغی ہے۔ اُسکے ساتھ ہی چور بھی کچڑ پانی میں گڈہ ڈھونڈ گیا۔ دونوں ہی سمجھتے رہے کہ نشانہ ہم ہی ہیں۔ بہر حال چور نے تو جیسے بنا اپنا پچھا چھڑایا۔ اور اپنی جان بچا کے بھاگا۔ اور میرے خدمتگار کو کچڑ میں لت پت چھوڑ گیا۔ اُسی کے ساتھ میرے دھلے دھلائے سفید کپڑوں کو (کہ جو اب ذرا سفید نہ رہے تھے) ایک گڈھے میں ڈبویا چھوڑ گیا۔

جس لوگوں نے کبھی منطقہ حارہ کے کسی ملک میں سفر نہیں کیا ہے۔ انہیں کیا قدر اور وہ کیا سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بھی کوئی مصیبت تھی جو چھپر پڑی تھی۔ اگر انکو ذرا بھی اُس راحت کا اندازہ ہوتا جو سفید کپڑوں کی تہذیبی سے ہوتی ہے۔ یا اُس تکلیف کو کبھی سمجھتا ہوتا جو سفید کپڑوں کے نوٹیکے پہنچتی ہے۔ خصوصاً ایسے ملک میں جہاں اُلٹے مقامات میں پارہ ۸۵۔ اور ۹۰ درجوں پر چڑھا ہوتا ہے گھٹے گجٹاں جنگل میں سب طرف سے ہواؤں کی ہوتی ہے۔ تن بدن سے دھواں نکلتا ہے۔ زمین تپتی ہے۔ درختوں سے آگ نکلتی ہے اور ہاتھی۔ گھوڑے اور باؤ بردار کے جانور سب پسینے پسینے رہتے ہیں یقیناً وہ مجھے ہمدردی کرتے۔

پہلے پہل یہ گھڑی میرے غاناں نے پائی۔ اُسے میرے سامنے پیش کی۔ میں نے اُسکا شکریہ ادا کیا مگر گریوں کی حالت دیکھ کر شکریے کے عوض مجھے غصہ چڑھ آیا جتنے کپڑے تھے سب میں زبردی مال بھوسے، بگ کی کچھڑکے (جو نہایت ہی چکنی اور نرم اور سدا رہتی) دھتے پٹسے ہوئے تھے۔ ایک بھی بے داغ نہ تھا۔ اب تو میں نے ایک ایک کپڑا اپنے فوجی محافظ صاحب کے سامنے پھینکا اور غصے میں اٹھوخت سٹ کناش شروع کر دیا۔ میں نے سارا الزام اُنھیں کے سر تھوپا کہ حضرت آپ ہی کی بدولت یہ مصیبت بھگہڑی ہے۔ وہ ہنسنے اور مجھے یقین دلانے لگے کہ ”جو رہی یہاں سو بے داغ نہیں گیا ہو۔ وہ بھی ایک گولی بدن میں لپکے گیا ہو“ اگر یہ بات صحیح ہو تو ضروری ہو کہ اُنھوں نے ایک ہی نال میں دو گولیاں بھری ہوں۔ کیونکہ صبح کو میں نے دیکھا تو میری بالکی کے ایک دسلے میں ایک گولی دکھائی دی جو خوب پیوست ہو گئی تھی۔ مجھے ضبط نہ ہو سکا اور میں نے محافظ صاحب کو یہ گولی دکھائی۔ ابھی دین دیری دیکھیے کہ اُنھوں نے اپنی ریش مرل پر ہاتھ پیر کے فٹھا کہ اُنھوں نے تو یہ نشان بہت دن ہو سے جب ہی دیکھا تھا۔ اور یہ کہ اُنکے خیال میں یہ گولی جب لگی تھی جبکہ ایک شب کو میں بالکی کے اندر سو رہا تھا۔ مگر یہ سب واپیات تھا۔

اُس رات بھر پھر کوئی نہیں سویا۔ کیونکہ وہ باتوں نے یہ خبر سُنکے کہ بادشاہ معہ باؤی گارڈ کھج فرما گئے۔ لشکر پر چار طرف سے پورش کر دی۔ تیرہ دن رات کے لانسچلانیے گھنٹوں نہیں بنے بھی خیام شاہی کی طرف سے عورتوں اور مردوں کے شور و شین کی آوازیں سنیں۔ حرم شاہی کی ادنیٰ ملازم عورتیں ساقہ تئیں جاسکی تھیں۔ اور وہ ان تم سیدہ دہاتیوں کے ہاتھوں انواع و اقسام کی اذاب بے رحمی کا نشانہ بنیں۔ نیچے پھانٹے اور لوٹے گئے۔ ہاتھ گلے کے زور چھینے گئے۔ صندوق صندوق چٹے توڑے گئے اور محل کے اعلیٰ درجے کی خاتونوں کی پوشاکیں دہاتیوں کے ہاتھ لگیں۔ ہمارا یہ حال تھا کہ ہلوگ حفاظت خود اختیاری کے اولیں فرض پر کار بند تھے۔ کیونکہ یہ ہمارا کام نہ تھا کہ ہم سارے لشکر کی حفاظت کرتے یہ نواب کا فرض منصبی تھا۔ بلکہ خود ہر خطہ ہی اندیشہ لگا تھا کہ کہیں ہمارے نیچے پورش نہ ہو۔ اور ہم میں سے ہر شخص بالکل مارنے مرنے پر تیار بیٹھا تھا۔ اس میں کچھ شک شبہ نہیں کہ شیروں نے ہمارے غم کے ارد گرد بھی تانے لگائے مگر ہکو مستعد بقا بلکہ کسی کو ہاری طرف رخ کر لینی ہمت نہ پڑی۔

ان حالات کے پڑھنے کے بعد شاید کوئی صاحب ہمسے یہ سوال کریں کہ ”حضرت۔ آپ لوگ سارے کرشمے دیکھا کیے اور کسی صاحب سے اتنا نہ ہو سکا کہ ذرا نیچے سے نکل کے ان بیچاروں کی حفاظت کرتا جن کو وہ اپنی لوگ سنا رہے تھے“ لیکن اسکا جواب باسانی ہم یہ دے سکتے ہیں کہ اول تو یہ عورتیں جو پیچھے چھوڑ گئی

تھیں انہیں اکثر تو نظروں سے گری ہوئی آٹھائیں تھیں۔ کچھ گائیں تھیں۔ کچھ زبیاں تھیں اور کچھ ماما مائیں تھیں۔ پس اگر ہلوگ انکے نمونے اندر جاتے تو یہ بتل عورتیں لکھنؤ کے بازار میں ہی مشہور کرتیں کہ ہلوگ کسی بڑی نیت اور ارادہ فاسد سے وہاں گھس گئے تھے اور انکے دامن محنت کے چاک کر نیچے مرگب بنے تھے پھر تو حرم شاہی میں مداخلت بجا کاجرم قائم ہو جاتا۔ اور ایک طرف شاہی عتاب اور دوسری طرف بڑے صاحب کے غیظ و غضب کا طوفان ہمہ نازل ہو جاتا۔ واروگیر موتی عذاب میں مبتلا ہو جاتے۔ اور آئندہ کی تمام توقعات تو خیر جاتی ہی رہتیں اسی کے ساتھ ہی بچھلا اندوختہ بھی منہلی فرقی سے نیت و ناود ہو جاتا دوسری یہ بات بھی تھی کہ اگر ہلوگ انکی حفاظت کو جاتے تو خود ہمارے نیچے میں موقع غنیمت سمجھ کر تیرے بے تکلف اور بلاتامل گھس آتے اور سارا مال اسباب ترس نہیں کر ڈالتے۔ اور یہ ظاہر ہو کہ ایسے مواقع پر ہمارے بہادر آدمی بھی اپنے مال اسباب کی حفاظت کو دوسروں کے مال اسباب کی حفاظت پر مقدم سمجھتا ہے اور اس کے ہم صرف چار نفر تھے اور یہ چار نفر ستورات کے ایک جم غفیر کا تحفظ ہی کیا کر سکتے تھے۔ اور اگر ہم اپنی جانوں پر بھی کھیں جاتے تب بھی یہ عورتیں ہرگز ہماری جانبازی کا شکریہ ادا نہ کرتیں۔ اور بغرض تھا اگر ہلوگ انکی حفاظت کو چلے بھی جاتے تو ہمارے کپڑوں۔ گھوڑے کی کاٹھیوں۔ میز کرسی چار پائیوں اور حملہ رخت سفر حتیٰ کہ پانکی گھوڑوں وغیرہ کو غارتگری سے کون بچا سکتا تھا۔

ہمارے گھوڑے نیچے کے گرد قطار در قطار اس طرح باندھ دیے گئے تھے۔ اور یہ ممکن نہ تھا کہ کوئی شخص چپ چاپ بے غیر شور و غل برپا ہو سکے انکو کھول لیا تا۔ پہلے ہی جھنگے میں سائیں ہو تیار اور خبر دا ہوجا کر یونکہ ہلوگوں نے یہ ترکیب کی تھی کہ جن رسیدوں سے گھوڑے بندھے تھے اور جسے نہیں کسی ہوئی تھیں وہ سائیں کھلے بازوؤں میں بھی ایک طرف باندھ دی گئیں تھیں۔

اس شب تاریک میں جسکا ایک ایک نفس ایک ایک برس ہو رہا تھا ہلوگ اپنے جوت پیا کیے اور یہ سائے کرشنے دیکھتے اور یہ سارا شور و غل سنتے رہے۔ جھکو جب ہلوگ شب گزشتہ کی غارتگری کے نتائج دیکھنے کو باہر نکلے تو عجب بوقلوں اور وحشت خیز سماں ہر طرف نظر آیا۔ جسکا نہ ٹھیک بیان ہی ہو سکتا ہے نہ تصور کیا جا سکتا۔ ایک شاہی عیسا نکل کر گیا تھا۔ اور بادشاہ اپنی روانگی لکھنؤ کی دھن میں لہو پڑے تھے کہ انکو اسکے دوبارہ استاد کرانے کی ذرا پروا نہ تھی۔ انہیں کے ساتھ ہر ہر منتفخ رخت سفر کے درست کرنے اور جلد سے جلد مل کھڑے ہو نیکی طیارہ نہیں ایسا گھبراہٹ کھلایا ہوا تھا کہ کسی کو اس عجیب کجبات پر اصلاً توجہ نہ ہوئی۔ کو بچ کا سیکو تھا اچھی خاصی بھگدڑ تھی۔ خیر۔ کیسے خبری یاد ملی۔ کیڑوں نے اس نیچے پر توجہ بھی کی اور خوب خیر بھی ملی۔ باوجودیکہ نواب کے سپاہیوں نے پوری کوشش اس نیچے کی حفاظت میں

کی پھر بھی دہاتیوں نے جو کچھ اسمیں پایا بٹوٹ لیا اور ستیاناس کر ڈالا۔ حتیٰ کہ بادشاہ سلامت کا وہ کوٹ پتھن جو گزشتہ شام ہی کو انھوں نے اُتارا تھا وہ بھی لوٹ میں گیا۔ خیمے کے گرد کی ساری زمین ہلکا رہی تھی۔ کیونکہ تمام وہ مغرق اور زرتار پوشا کیں۔ حرم شاہی کے وہاں پکھری پڑی تھیں بھلیات اور مہرباٹ میں کثیر و کثرت ہاتھوں سے چھوٹ گری تھیں۔ بڑی بڑی گراناہ اشیا و زمین پر منتشر پڑی تھیں جسیں خانہ داری اور باورچی خانے کا پورا سامان تھا۔ نفیس نفیس برتن۔ انواع اقسام کے کپڑے بچھنے پڑے۔ ہاتھیوں اور اونٹوں کی زریں بھولیں وغیرہ وغیرہ ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ان غارت کردہ اشیا میں کل سامان دسی ہی نہ تھا بلکہ ہلو۔ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ ادھر ادھر بعض اس قسم کے کپڑے پیسلے پڑے تھے جو ہندوستانی مستورات کے استعمال میں معمولاً نہیں آتے ہیں بلکہ وہ وہی تھے جو یورپ میں مستورات کے استعمال کیواسطے انگلستان کی بڑی بڑی دوکانوں پر نظر آتے ہیں اور جنکو دیکھ کر اسے مرد دل پر کٹن کے رچا ہے۔ چونکہ ہلوگوں کو اسکا یقین تھا کہ بادشاہ کے یورپین مصاحبین یا ملازمین۔ یعنی باورچی۔ کچا یا خاصہ ترانہ کے قائل ہیں سے کوئی عورت اس لشکر شاہی کے ہمراہ نہ تھی اسوجہ سے غل غالب ہی تھا کہ محل شاہی میں کوئی بیگم صاحبہ ہی ایسی ہونگی جو ایسی پوشاک بھی زیب تن فرمایا کرتی ہوگی اور جنکے جوڑ کا نہ ہکو علم تھا نہ ہنسنے کبھی سنا تھا۔

دیکھنے سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کٹیروں اور نواب کے آدمیوں میں سخت جنگ بھی ہوئی تھی۔ کیونکہ ایک جگہ دولاشین زمین پر ایسی پڑی ہوئی تھیں جنکے بدن کی بوٹی بوٹی قید کر ڈالی گئی تھی اور بہت غاہری سے یہ لوگ لشکر شاہی کے معلوم ہوتے تھے۔ اور ہنسنے یہ بھی سنا کہ نواب کے بہت سے ملازم بھی سخت مجروح ہوئے تھے۔

اسکے بعد ہلوگ اس ضرورت سے اپنے خیمے میں چلے آئے کہ روانگی سے پیشتر جدی سے کچھ ناشتہ کر لیں۔ خیمے میں پونچے تو دیکھا کہ ہر طرف ایک دُند چھی ہوئی ہے۔ ہنگامہ برپا ہے۔ اور خوب گالی گستاخ ہو رہا ہے۔ بڑی ڈانٹ ڈپٹ کے بعد ذرا خاموشی ہوئی اور اب ہنسنے پوچھ پچھ شروع کی کہ یہ طوفان بے تیزی کیسا برپا تھا۔ آخر یہ معلوم ہوا کہ کسی بات پر ہالے تو کروں اور نواب کے آدمیوں سے تکرار تھی۔ اور ہڑتے ہڑتے نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ دونوں جانب سے تہدید اُٹھیاں اُٹھائی گئیں۔ اور اگر ہلوگ عین وقت پر نہ پونچ جاسے تو شاید کچھ سر بھٹول بھی ہو جاتی۔ جب ہلوگ پونچے تو نواب کے سپاہیوں میں سے ایک شخص نے ہنسنے کہا کہ ”دیکھئے صاحب! یہ کونسا نواب صاحب کے حکم کی تعمیل سے انکار کرتے ہیں“ اسکے جواب میں ہمارے ملازمین نے ایکے بان لٹو کے

کہا: ”یہ حرامزائے کہتے ہیں کہ ہم اپنے مالک لوگوں کے نیچے کو چھوڑ کے ان لوگوں کی سربراہی کوئے کہیں اور جائیں“ غرض کہ دونوں فریق ہندوؤں کی طرح چلا پلا کے اپنا رنگ گانے لگے۔ ہندوستانیوں کا خاصہ بھوکھڑی کے وقت خوب گلا پھاڑ پھاڑ کے چیختے اور ایک دوسرے کو دھمکاتے ہیں۔

ہلوگوں کو اس جھگڑ میں کسی قدر دلچسپی ہو گئی تھی۔ تھوڑی دیر تحقیق کے بعد بالآخر یہ عقدہ حل ہوا کہ نواب نے صاحب لوگوں کے نوکروں کی بابت یہ حکم عام صادر کیا تھا کہ کوچ کے سامان کر نہیں یہ لوگ بھی مدویں اور اس بنا پر نواب کے پیاسہ سرپا ہی ہائے کماروں اور سائیسوں کو چو کوئی کام مثل کھانا پکانا یا اسباب باندھنے کے نہیں کرتے تھے پھر نہ کہ لجا بنے لگے۔ اور اگر ہائے ملازم اس نامنصفانہ حکم پر عمل کرتے تو فدا جانے کب ہلوگوں کے کوچ کی نوبت آتی۔ چونکہ تمام کپڑوں کے سیلے ہوا جیسے مجھے یہ جلدی بڑی تھی جیسے بنے جلد سے جلد یہاں سے کوچ بولیں اور میرے علاوہ اور صاحب لوگوں کو بھی بہت عجلت تھی کہ کہیں جلد لکھنؤ پہنچ جائیں۔ اور بادشاہ کے ہمراہی لوگ سائے لشکر کے قریب قریب کل کماروں کو اپنے ساتھ لے چلے گئے تھے۔ پس ایسی حالت میں ہماری اسباب کے اٹھانیں مدویتے کو بہت کم کمار باقی رہ گئے تھے۔ اگر وہ لوگ بھی ہمسے پیشتر یہاں سے تشریف لجاتے تو ہمارا لکھنؤ پہنچنا مشکل پڑ جاتا۔ بلکہ یہی خیال تھا کہ پھر خدا جانتا لکھنؤ کی صورت دیکھنا بھی ہو کہ نہ ہو۔ کیونکہ ہاموم باشندگان اودھ بادشاہ کے پیر میں مصاحبین کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے اور جی ہی جی میں انکو دیکھ کے کڑھتے تھے۔

ہلوگوں نے نرمی کے ساتھ سمجھا سمجھا کے ان لوگوں کو یوں راضی کرنا چاہا کہ ”حسب حکم شاہی ہو حضور شاہ میں بہت ہی جلد حاضر ہونا چاہیے“ اس کے جواب میں نواب کے سپاہیوں نے ہنسے کہا کہ ”آپ لوگوں کی روانگی میں اگر کچھ درنگ واقع ہوگی تو نواب صاحب اسکی جواب دہی کریں گے“

پھر سننے کہا کہ ”ہمارا فرض ہے کہ فوراً بادشاہ کی حضور میں حاضر ہوں۔ اور اگر ہلوگ یونہی اپنے نوکروں کو دیدینے کو گیا چاہنا ہے کہ حکم کی نافرمانی کا ارتکاب کرے“ اس کا جواب ہلوگ یہ ملا کہ ”بادشاہ کی غیبت میں نواب حاکم مطلق ہیں اور انکا حکم سب کے لیے واجب التعمیل ہے“ اب تو ہلوگوں نے ذرا تیور بدل کے کہا کہ ”ہلوگوں کے پاس کئی جوڑیاں سپتوں کی ہیں۔ چھڑکاری بندہ ہیں۔ دور فل ہیں۔ اور تلواریں تو متعدد ہیں۔ بس۔ یہ سمجھ لو کہ ہم اپنی اور اپنے نوکروں کی بخوبی حفاظت کر سکتے ہیں“ اس کے جواب میں ہنسے کہا گیا کہ ”نواب کے پاس آپ کے ایک آدمی کے جواب میں تین تین آدمی ہیں اور ہتھیاروں کا تو کوئی مقابلہ نہیں ہو سکتا۔ بے انداز ہیں۔ اور اگر آپ ایسا ہی مجبور کریں گے تو یاد رکھیے کہ آپ کے ساتھ کیوں اسٹیر ایک آدمی بھی باقی نہ چھوڑا جائیگا“



نواب کے آدمیوں کے ساتھ جو افسر تھا اسے ایسے استقلال اور خیرگی سے یہ ساری گفتگو کی کہ جس سے ہلکوبھی نہیں ہوا کہ اس معاملے میں نواب نے جو دل میں ٹھان لی ہر ذہنی کرپنے۔ اس افسر کی گفتگو میں اگرچہ خوشامد نہ ملے بھی تھے۔ ہماری بہادری کی توصیف بھی تھی۔ مگر ایسا نیمہ نہ اپنے اصرار پر قائم تھا اور ایک اینچ بھی اپنے قول سے نہیں ہٹتا تھا۔

ابو ہلوگ بہت ہی وق ہوئے۔ اور ضبط میں پڑ گئے۔ کیونکہ ہمارا اینٹا ہرگز نہ تھا کہ ہم فو ایک مقابلہ کریں گے۔ یہی قبل قال ہو رہی تھی کہ ہلو اپنے نمران خاصہ تراش کا خیال آیا۔ کیونکہ یہ وقت ہی ایسا نازک آپڑا تھا کہ ہم ایسے ہی شخص کی دوامی دیتے جس سے ازا علی تا ادنیٰ ہر ایک ملازم شاہی کی روح لرزتی تھی۔ اور جسکو وہ رسوخ بادشاہ کے مزاج میں تھا جس سے ہر کہ وہ واقف تھا۔ ایک بڑائی پھیل چلا مشہور ہو رہا تھا کہ کیا جاتا ہو دل ہی جاتا ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ہمارے خیال کے مطابق بے نشان گمان خاصہ تراش صاحب نمودار ہوئے۔ وہ بھی لکھنؤ کے سفر کے تیز میں بہت متعجب تھے۔ اور اسوجہ سے اب اسیں گویا کئی بھی غرض اٹھی ہوئی تھی کہ ہلوگوں کے ساتھ ہی چلیں اور جہدہ جلد ممکن ہو لکھنؤ پہنچیں اُن سے سب حالات بیان کیے گئے۔ سننے ہی مے غصہ کے پھول کے پٹا ہو گئے۔ پہلے تو اُسے انگریزی میں افسر سے مخاطب ہو کے کہا کہ ”تم سب یہ معاش۔ نواب بھی اور اُسے سب ساتھ ہی یہ معاش ہیں“ پھر نوٹی پھوٹی اُدو میں اُسے کہا کہ ”جاؤ اور وزیر اعظم صاحب سے عرض کرو کہ مجھے فوراً جاکے چاہناہ کی اصلاح بنانا ہے۔ میں ذرا وقف نہیں کر سکتا۔ اور یہ سب صاحب لوگ کیسے ہی ہمراہ جائیں گے۔ لہذا کوئی نوکر نہیں دیا جائیگا۔ گوارا بیگا رو کی یہاں کون کمی ہے“

اسکے جواب میں اُس افسر نے زبان بھی نہ ہلائی۔ چپکے سلام کیا اور چلتا ہوا۔ ہلوگ بھی چپ بیٹھے یہ تماشہ دیکھا کیے۔ خاصہ تراش کا کام نکلا۔ ہمارا بھی مقصد پورا ہو گیا۔ اگر نواب کو کچھ سوختی ہوئی۔ تو ہوا اُڑے۔ وہ اپنی خفت ہمہ کیوں ظاہر کرنے لگے تھے۔ البتہ اس ساری کارروائی کا نتیجہ یہ ضرور ہوا کہ پھر نوکر کو کمی مانگ نہیں ہوئی۔

جب ہلوگ لکھنؤ کے قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ بادشاہ سلامت نہایت اشتیاق کے ساتھ دیکشا میں پہنچے جہاں سے ہلوگ روانہ ہوئے تھے۔ ہمارا انتظار فرما رہے تھے۔

ایک روز صبح کو ہلوگ سلام کو گئے اُس وقت خاصہ تراش حسب معمول بالوں کے سنوارنے میں مشغول تھا بادشاہ سلامت نے ہم سے مخاطب ہو کے فرمایا کہ ”مہاجو۔ اس سنان مقام میں ہلوگوں نے مجھے بالکل بحال خود پریشان رکھا ہے“ ہماری جماعت کے ایک صاحب نے عرض کیا کہ ”حضرت تو مولیٰ انسانو

کے بہ نسبت تیس تیزی و سرعت کے ساتھ طے منازل فرماتے ہیں۔" اسپر بادشاہ سلامت بول اٹھے کہ "میرزا تنوگ صبح سلامت آگئے۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے اُن اور خطا دیہاتیوں کے ہاتھ سے خیام شاہی کی بربادی و غارتگری کا حال سنا ہے۔ مجھے خاس (یعنی خاصہ تراش) نے ساری کیفیت بیان کی ہے۔ ذرا اسکا مفصل حال پھر تو بیان کرنا۔" بلوگوں نے جو کچھ دیکھا تھا وہی بھسنہ عرض کر دیا۔ جسکو مَن کے بادشاہ سلامت بہت ہی غضبناک ہو گئے۔ اور بھلا بھلا کے فرمائیلے۔ "ان موزیوں کے ناپاک ہاتھوں سے میری اور میری بیگمات کی پوشاک کو کئی یہ ستیاناسی ہوئی جو۔" آیا جاتی کے سر کی قسم۔ دیکھو تو ان بد معاشرت کو کیسی سخت سزا دیتا ہوں کہ ہمیشہ یاد کریں گے، "خامدہ تراش نے عرض کیا کہ" حضور میں نے سنا ہے کہ نواب نے اُنکو گرفتار کر لیا ہے۔ اور بغرض صدور حکم سزا چھیچھے لیے آتے ہیں۔" بادشاہ سلامت نے ارشاد فرمایا کہ "سنا خان! اُن میں سے ایک ایک تنگس کی گردن ماری جائے گی۔ چاہے گنتی میں سو ہی کسوں کو سزا کی جان لوں گا۔ اور دنیا میں کسی کی یہ تاب طاقت نہیں کہ ان نابکاروں کو بچا سکے۔" یہی سزا اُن کو سنوئی اور اسطے جاہانہ نے تجویز فرمادی تھی۔

بعد اسکے بننے ان مصیبت زدہ لوگوں کو اسوقت دیکھا جب وہ محل شاہی کے سامنے لائے گئے وہی انکی صورتیں بہت ڈراؤنی اور خوفناک تھیں۔ دیکھنے ہی سے جلا وطن معلوم ہوتے تھے۔ ہر شخص ایک چارپائی پر اسی طرح بندھا پڑا تھا۔ جیسے انگلستان میں شرابیوں کو پولیس واسطے چارپائی میں باندھکے لے جاتے ہیں انہیں سے ہر ایک کے بدن میں تلوار کے کاٹ یا خنجر کے بھونکنے کے زخم تھے۔ اور سب زخم کھلے اور آسے تھے۔ جنکی مرہم بچی کچھ نہوئی تھی۔ شمار میں انکی تعداد غالباً بارہ تھی۔ آخر کار انکو قتل سنا دیا گیا اور اسی روز اُن سب سر گردن سے جدا کر دے گئے۔

میں اس بات کا تصدیق نہیں کر سکتا کہ آیا یہ حقیقت ہی لوگ اسمی سرغنہ فارنگوان خیام شاہی کے تھے یا نہ تھے۔ نواب نے کہا تھا کہ یہی لوگ بانی مانی ہیں۔ اور انکی سب سے مان لی گئی تھی۔ نواب کا تو یہ کام ہی تھا کہ اس قسم کے جرموں کو پیش کر کے غیظ و غضب شاہی کو فرو کریں۔ اور اگر تسلیم کر لیا جائے کہ یہ لوگ خطا اور بے شرد یہاں تھے۔ جنکو نواب کے سرکش سپاہیوں نے اس غرض سے بکریا دیا تھا کہ کسی طرح ہلائے اور بادشاہ کا غصہ زچا جائے تو یہ کوئی عجیب بات نہوگی۔ ہندوستان میں سیکلے کے ساتھ ایسے واقعات ہوا ہی کرتے ہیں۔ اور صرف ہندوستانی ہی درباروں میں نہیں۔ کیونکہ اس ملک میں کوئی سنگیں واقعات ایسے نہیں ہوتے جس میں پولیس کچھ بے گناہ غریبوں کو بکریا کے سزا نہیں دلا دیتا اور جنکی بابت اگر تم پولیس کے بیان پر یقین کرو تو کافی شہادت پیش ہو جائیگی کہ

یہی اصلی خطا کار اور مجرم ہیں۔

اودھ میں تحقیقات سرسری ہی پر بالکل انصاف کا وارود ادا تھا۔ بجز گھنٹوں کے ٹک بھر میں کہیں جیل خانہ نہ تھا۔ اور مقامات پر اگر کوئی شخص چوری کے جرم میں پکڑا جاتا اور اس پر ازکاب جرم کا قوی شہد پیدا ہو جاتا یا اس کے اثبات جرم کے شہادتوں میں سخت قسم کھائی جاتی تو فوراً اس کا سرتن سے جدا کر دیا جاتا چکلہ داروں کو یورپ کے طریقے کے مطابق داد گسٹری کے انتظام کی فرصت ہی نہ تھی۔ اگرچہ کمپنی کے قوانین اور مقامات پر کیسے ہی ناقص کیوں نہوں لیکن میں یہ عقیدہ راسخ رکھتا ہوں کہ اودھ کے واسطے ایک یورپین مجسٹریٹ ہزار درجہ عمدہ انصاف چکلہ داروں سے کرے گا۔ اگرچہ انکی دیسی زبان سے وہ کتنا ہی بے پرہ اور جاہل اور انکی شہادتوں کے سمجھنے سے کتنا ہی معذور اور قاصر کیوں نہو۔



## باب خیم

جسکو پی چاہے سہاگن بڑھی

جہاں ایسے بادشاہ کے ہاتھ میں عمان حکومت ہوا اور جہاں عام طور سے رعایا اس طرح شاہی احکام کی مطیع و منقاد ہو جیسی ہندوستان میں ہوتی جو اُس دربار میں کسی مقرب بارگاہِ سلطانی کے نامتناہی عزاز و اقتدار کا یقین کر لینا کچھ بھی بعید از عقل نہیں ہو سکتا۔ باہمہد و بارادودھ میں خاصہ تراش کا خراج شاہی میں رسوخ حاصل کر لینا اور پھر اُس رسوخ کا قائم رہنا ایک افولگی بات تھی۔ کیونکہ نہ تو یہ صاحبِ خاصہ یہی زمان میں بخوبی اظہارِ مدعا کرنے پر قادر تھے نہ بادشاہ سلامت کو زبانِ انگریزی میں اتنی مہارت تھی کہ بے تکلف اپنے خیالات ظاہر کر سکتے۔

امارت کے خطاب۔ دربار شاہی میں بے پایاں اختیارات۔ اور اُسی کی معرفت جلد و پین اشیاء کی خرید و گزیرہ میں اُوپر کر چکا ہوں۔ ماوراءِ ان اعزازِ مخصوص کے اُسکے سپرد شاہی سناجری (نقل و حرکت) کی انفری بھی تھی۔ ایک بار میں نے بھی اُسکے حساب کی ضخامت کو جو اُس نے میرے سامنے شاہی ملاحظے کے واسطے پیش کیا تھا دیکھا تھا۔ نقل یا پنج سے فراغت ہو چکی تھی اور اب وہ وقت تھا کہ ہلوگ ٹرکس ہینکو تھے کہ خاصہ تراش صاحب اپنے حساب کا ایک طومار ہاتھ میں پکٹ کر حضوری میں حاضر ہوئے۔ جہنشاہ میں دستاویزات قانونی یا کاغذات متعلق تجارت عام دستور کے مطابق بڑے بڑے بیسے تختوں پر تحریر کی جاتے ہیں اور کتاب کی طرح متعدد صفحوں پر جُدا جُدا تحریر نہیں کیے جاتے بلکہ یہ کیا جاتا ہے کہ بڑے بڑے کاغذ یکے بعد دیگرے طو لا چپاں کر کے طولِ طویل تہمتہ بنا کے اُسی پر لکھتے ہیں۔ اور پھر اُسی کو پکٹ کے چونکلا یا سبانا بیٹھتے ہیں۔ خاصہ تراش کو اس حیثیت سے دیکھنے کے بادشاہ نے مسکرا کر فرمایا: ”اٹھا۔ خان ہیں۔ کیا ہے۔ ماہواری حساب ہوگا۔ کیوں ہو نا؟“ اُس نے جواب دیا: ”جی خداوند“ بادشاہ نے ارشاد فرمایا: ”لاؤ۔ کھلو۔ دیکھیں کیا ہے۔ کتنا طولِ طویل ہے۔ کھلو۔ خان کھلو“ بادشاہ اُس وقت مسرور تھے۔ اور خاصہ تراش تو اُسی رنگ میں ڈوب جاتا تھا جیسے بادشاہ سلامت کو دیکھتا تھا۔ چنانچہ اُس نے فوراً ہی کاغذ ایک سر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور باقی چوٹکاز میں پر اس طرح لڑھکا دیا کہ خود بخود کھٹکنا چلا گیا اور جاتے جاتے دوسرا سر اکرے کی سامنے والی دیوار سے جا لگا۔ اس کاغذ پر نہایت خوشخط قریں سلسلہ وار ایک قلم سے نزولِ تا آخر لکھی ہوئی تھیں۔ بادشاہ کے حکم سے ایک گز لایا گیا اور کاغذ کی ناپ ہوئی۔ سات سے چار گز۔

لانا تھا۔ میں نے جو اسکی میزان پر نظر ڈالی تو کل حساب نوے ہزار سے زائد کا معلوم ہوا۔ نو ہزار پاؤنڈ سے زیادہ ۱۱

بادشاہ نے بھی صرف میزان کی رقم پر نظر ڈالی اور پوچھا کہ ”خان۔ یہ حساب معمولی ماہواری حساب سے زیادہ معلوم ہوتا ہے“ خاصہ تراش نے عرض کیا ”قبلہ عالم۔ اس حساب میں تقریبی و طمانی ظروف اور نو خرید ہاتھیوں وغیرہ کی قیمت درج ہے“ اسکی بات کو قطع کر کے بادشاہ بول اُٹھے ”ہاں ٹھیک ہے۔ ٹھیک۔ جاؤ۔ فوب پاس لیجاؤ۔ اور کو بیاق کرویں“ بادشاہ کے دستخط ہننے اور حساب بیاق ہو گیا۔ ایک بار ایک مقرب صاحب نے حضور میں عرض کیا کہ خان تو بالکل حضور کو لوٹے ہی لیتا ہے۔ اُسکا حساب تو دیکھئے۔ کیا بھاری بحرکم ہوتا ہے“ اُسکا جواب بادشاہ نے نہایت حقارت کی نظر سے دیا کہ ”اگر میری مرضی ہی ہو کہ خاں کو دو قلمند بنا دیوں۔ تو بتاؤ میں تمہارا کیا کسی کا کچھ اجارہ ہے۔ میں ہی جانتا ہوں کہ اُسکا حساب بہت کچھ فرضی ہوتا ہے۔ اور بڑا بھاری ہوتا ہے۔ مگر ہونے دو۔ میری خوشی اسی میں ہے۔ وہ ضرور دو قلمند بنا دیگا“

شاہی افسانہ و غزالیات کی یہی ایک مثال تھی کہ وہ خاصہ تراش کو مورد عطیات خسروانہ بنائے ہوئے تھے۔ مجھے اور بھی دو خاص مثالیں یاد ہیں کہ جنہیں بادشاہ کی نظر عنایت اور تلمون طبع کی بدولت فیاضی میں استعمال ہوا تھا۔ ایک کہ اسراف تک قوت پہونچ گئی ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ ایسے تلوں کے ساتھ فضا محو مانوہ مختار بادشاہوں اور یا مخصوص مشرقی حکمرانوں کے خیموں پر ہی ہوتی ہے۔ اور اجملا ایک مثال ایک کشمیری گائیک کی ہے۔

یہ کشمیری گائیک جو از حد حسینہ و جمیدہ تھی۔ جسکی بڑی بڑی سیاہ سیاہ آنکھیں تھرو دھاتی تھیں اور جسکا سبب اعضا جو کچھ پوشاک کے تنا و کچھاؤ سے نمودار تھا۔ پیش تھا۔ دربار شاہی میں دار و ہوئی۔ اس مقام پر مجھے یہ کمن ضروری ہے کہ بدن کی ترکیب اور ساخت میں جو خوشامی فطری ہوتی ہے وہ ہندوستانی عورات کے لباس میں اگر بڑی عورتوں کے لباس سے زیادہ ظاہر ہوتی ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ انڈیا میں عورتیں اپنی پوشاک سلی سلانی کسی دوکان سے خرید لاتی ہیں۔ جس سے وہ اصلی حسن بدن کا ظاہر نہیں سکتا برخلاف اسکے ہندوستان میں عورتیں اپنے خاص جسم کے مناسب موزوں لباس سلوا کے پہنتی ہیں اور لباس سے بدن کے اصلی جو ہر بخوبی عیاں ہوتے ہیں۔

اس کشمیری عورت نے سبکا نام نہندا اٹھا اپنے زاہد فریب حسن اور دلکش اداؤں سے بادشاہ کو لے آنکھیں کھل گئی ہوئی۔ یہی تو جن جن نے قلم کو استرا بنا کے ہر ایک خاصہ تراش کا سرو موٹا ہے۔ (مؤلف)

بھی اپنا والدہ وشیدا بنا لیا۔ زیادہ تر اسوجہ سے کہ جو شخص اس طوائف کو پنجاب سے لایا تھا۔ اُسے اس کے اوصاف و مناقب اپنی زبان سے کچھ زیادہ بیان نہیں کیے تھے۔ اُسکی آواز میں غضب کی کھٹک تھی اور عجب درد بھرا تھا۔ اور جب وہ اپنے وطن اپنے کشمیر حُزبِ نظریٰ درج میں غزل سرائی کرتی تھی تو عجب دلکش و دردناک انداز سے حسرت کا سماں کھینچ دیتی تھی۔ اور سننے والوں کے دل و سپر ایک چوٹ سی لگتی تھی۔ اُسکی بڑی بڑی آنکھوں میں حیا و شرم بھی تھی اور حسرت و نامرادی بھی۔ اور اُسکے انداز و اداسی سمویت اور لاؤ بائی پن نے وہ دلکشی و دلربائی پیدا کر دی تھی کہ جبکا لطف دیکھنے سننے پر مضمحل تھا۔

اگرچہ دربار شاہی میں وہ بطور ایک معمولی طوائف کے پیش کی گئی تھی۔ مگر اُسکی خوش قسمتی یا بد قسمتی تو اس شب کو اور جتنے تماشے تھے وہ سب ایسے بے لطف ہوئے کہ سب لوگ خواہ مخواہ اُسی کی طرف زیادہ متوجہ ہوئے۔ اور گھوڑ گھور کے دیکھنے لگے۔ خود بادشاہ سلامت نے اُسکی صورت دیکھی۔ ناچنے بھاؤ بتانے کی ادویکی۔ سُربلی آواز کا گانا سنا۔ خوش ہوئے اور نگے جھوم جھوم کے داد دینے۔ بادشاہ سلامت کے داد دینے سے بھاری نھو اُما لے خوشی کے جاسے میں نہ سہاتی تھی۔ دل کا کنول کھل رہا تھا اور کلیجہ بانسوں اُچھلتا تھا۔ آنکھیں جوش انبساط سے اور بھی روشن ہو گئیں۔ چہرے پر سُرخ جھلک آئی۔ جو وقت وہ اپنے جذبات کو روکتی اور جی کو سنبھالتی تھی اُس وقت اُسکے سینے کی حرکت دور سے نظر آتی تھی۔ بادشاہ ہولے ”شاباش! نھو شاباش!!“ اب تو شرم و حیا اور خوشی و مسرت سے چہرے پر ایک رنگ آنے ایک رنگ جانے لگا۔

اچھے ناظرین! آپ بھاری نھو اُپر الزام نہ دیکھیے گا۔ ذرا خیال کیجیے کہ یہ داد اُسکو کسی معمولی آدمی سے نہیں مل رہی تھی۔ ایک بادشاہ وقت تھا کہ جو اُسکی ناز و خوبی کی دادوں پر بیچ رہا تھا۔ اور اُسی بادشاہ کی پھر بگیا ت میں سے وہ ایسی تھیں جو نھو اسے بھی کم درجے کی تھیں۔ اور ہندوستان میں انھیں طوائف کے بطن سے بہترے و ارثان تاج و تخت پیدا ہو چکے ہیں۔ ہمارا جہ دلپس سنگھ جو رنجیت سنگھ شہرِ پنجاب کے بیٹے تھے اور جنکو حضورِ ملکہ مظفر کے ہمان رہنے کا مفتی حاصل ہو چکا جو اُنکی ماں بھی رندی ہی تھی۔ وہ ایسی حالت میں اگر بچا۔ ہی نھو خوشی سے بیتاب ہو گئی تو اُس پر الزام نہیں دینا چاہیے۔ تھوڑی دیر تک میں یہ سمجھتا رہا کہ اُسکا بیجان طبع اُسے ہی دالے گا۔ لیکن نہیں۔ اُسے فوراً ہی نے کو سنبھالا اور اپنے آپے میں آگئی۔ مز پر ہم قہنہ بیٹھے تھے اُس وقت سب کا یہ حال تھا کہ سب کی انگلی اُسکے رُخ و رخسار پر بندھی ہوئی تھی۔ جو وقت اُس نے اپنے حواس درست جمع کر لیے وہ اور بھی جی توڑ کے اُچی۔ گائی۔ حتیٰ کہ جاناہ بول اُنھے ”آجکے گانے کے انعام میں تمہیں ایک ہزار روپے میں گئے نہ

ایک ہزار روپیے ایک سو پانچ سو ایک غریب کشمیری بھوکری کے واسطے تو ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔

ابو ہاشم نے اور بھی پاؤں پھیلانے۔ یعنی جب ناچ ہو چکا اور حرم میں جانے لگے تو نفخوں کے سوا اور کسی کے شانے کا سہارا نہیں اچھا نہیں معلوم ہوا۔ چنانچہ وہ اُسی کے شانے پر سر نہوڑا کہ ہوسے حرم میں داخل ہوئے۔ وہ سماں بھی قابل دید تھا کہ پاری نفخوں کا چہرہ شرم اور رعب سے کیا جلد جلد رنگ بدل رہا تھا۔ بادشاہ کی یہ حرکت کہ حرم سلطانی میں ایک رنڈی کو لیے چلے گئے۔ کسی قدر بدناما تھی۔ کیونکہ ہندوستان میں اسکو میوب سمجھتے ہیں۔ مگر بادشاہ سلامت کو ایسے دستورات کی مطلق پروا نہ تھی جو ان کی آزادی اور تمکون مزاجی میں ہار جوتیں۔

دوسری شب کو نفخوں کے سوا اور کسی کا گانا ہوا ہی نہیں۔ آج اسکا بناؤ سنگار بہت اعلیٰ تھا جو اہر نگار زیور ہاتھ لگے۔ شانے اور سینے پر ایسی چمک دمک دکھارہے تھے کہ نظریہ ہوتی تھی۔ اور چہرہ مارے خوشی کے لالوں لال ہو رہا تھا۔ جب ناچ ختم ہوا تو بادشاہ نے فرمایا کہ ”آج کی شب تمکو دو ہزار روپے (دو سو پانچ سو) انعام ملیں گے“ آج پھر جاپنا وہ اُسی کے شانے پر سر نہوڑائے داخل مجلس راہوئے کئی شب متواتر یہی کیفیت رہی۔ بادشاہ کی داد و درخش حد و پایاں سے گزر گئی۔ اور نوبت بایں تجار سید کا سارا دربار اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنے لگا۔ اور وہ ایسی سب میں مل جل گئی کہ ازواج شاہی نے اسکا رنڈی ہونا بھی دل سے بھلا دیا۔ شاہی خواصوں نے بھی جنھوں نے پہلی رات کو اُسے حقارت کی نظر سے دیکھا تھا رفتہ رفتہ اپنا برتاؤ بالکل بدل ڈالا۔ پہلے اخلاق و تواضع شروع کیا۔ پھر عزت و تکریم کرنے لگیں۔ پھر تو مطیع و فرمانبروار ہو گئیں۔ اور چاچا پوسی و خوشامیوں میں لگ گئیں۔

ایک شب نشے کی ترنگ میں بادشاہ سلامت نے نفخوں کی جانب مخی طرب ہو کر فرمایا کہ ”میں تیرے واسطے سوئے کی اینٹوں کا ایک مکان بنوا دوں گا۔ اور ایک دن تجھی کو بادشاہ یکم بھی بنا دوں گا“ اب نفخوں کی عزت افزائی کی گویا حد ہو گئی۔

اس درمیان میں کسی ایسی قہیل کی وجہ سے ایک ہفتے کے لیے ہلوگوں کی خاصہ کید وقت کی حاضر یا میں خلل پڑ گیا۔ اور اس عرصہ میں ہمنے نفخوں کی جھنک بھی نہ دیکھی۔ جب یہ زمانہ ختم ہوا تو پھر ہمنے اسے دیکھا وہ اپنی اُسی آن بان سے ناچتی۔ گاتی۔ دلوگوں بھاتی تھی۔ لیکن بادشاہ سلامت کی طبیعت بدل چکی تھی۔

لے آپکے پیٹ میں کیوں قرا رہتا ہو۔ کاش آپ بھی اسی زمرے میں ہوتے۔ کئی پشتوں کے کھانے پینے کی فکر وں سے فراغت ہو جاتی۔ مترجم

جناب مترجم صاحب! اسے رجا کس پر سرور و جلال ہے۔ کئی رجا کس پر کچھ ہے۔ کم دلوں میں کس پر نہیں ہے۔

چنانچہ ایک بار وہ اُسکی طرف دیکھتے ہی دیکھتے انگڑائی لیکے بولے۔ "ارے معاذ اللہ! اتویہ اجیرن ہوئے۔ کیا آجکی شب کے واسطے کوئی دوسرا تماشہ نہیں ہو۔ اچی۔ خاں۔ لاؤ۔ آج تیر بازی ہو جائے۔" خاصہ تراش تو بھر منگوانے آٹھ گئے۔ اور بادشاہ سلامت آنکھیں پھار پھار کے ننھو ایچاری کوتاکنے گھورنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد بولے تو یہ بولے۔ "اسکو اگر یورپین لباس بچھایا جائے تو یہ کیسی معلوم ہوگی۔ یہ جملہ کچھ تو آپ ہی کہا آپ ہی سنا اور کچھ ماسٹر صاحب سے مخاطب ہو کے کہا جو قریب ہی بیٹھے تھے مگر کسی نے کچھ جواب نہ دیا کہ اتنے میں خاصہ تراش صاحب پھر نمودار ہوئے۔ اور بادشاہ سلامت نے وہی فقرہ اُٹھائے بھی کہا۔ اور انھوں نے جواب دیا۔ "پیر و مرشد۔ اسکا معلوم ہونا کون شکل بات ہو۔ لیکن یہی ایسی انتظام ہو جاتا ہو۔" چونکہ وہ خود متاہل تھے۔ انھوں نے فوراً اپنے گھر سے سایہ۔ گوں اور دیگر انگریزی لباس منگا بھیجا۔ جو جب آگیا تو ننھوا سے کہا گیا کہ "ذرا اسے پہننے آؤ۔" پھر آگئے اور شاہی میز پر جوڑا لے گئے۔

بیچاری ننھوا بھی تھوڑی دیر بعد نئی کپڑی میں نمودار ہوئی۔ یہ لباس اسپر بالکل بے پھاب تھا۔ ڈھیلہ۔ ڈھالا۔ چھابڑھیول لباس۔ بدنمائی کے ساتھ کچھ ادھر لٹکتا۔ کچھ اُدھر۔ اُسکو خود محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بالکل بدرجہ ہت ہو گئی ہو۔ سارا حسن تشریف لیگیا۔ ساری نزاکت پر پانی پھر گیا۔ اور اب جو وہ آکے بددی کے ساتھ بیٹھی تو اُسکی صورت دیکھنے ترس آتا تھا۔

اُسکی اس حالت پر بادشاہ سلامت اور خاصہ تراش دونوں خوب جی کھول کے کھار کھلا کے ہنس پڑے۔ اور بیچاری ننھوا کے گلگوں رخساروں پر بڑے بڑے آنسو ٹپکنے لگے خواہو نہ خواہو مطلق رحم اسپر نہ آیا۔ بلکہ وہ اُسکے اس توہین پر برابر وہی زباں سے ذرا سُکرا سُکرا کے کہا کہیں۔ "ہا۔ چوڑیل۔" اور بولے۔ "اسی طرح کئی دن بلکہ کئی ہفتے تک بیچاری ننھوا سب کی نشاہ تمسخر اور توہین و غرافت بشکے حاضر ہوا کی۔ بادشاہ سلامت اُسے کسی دوسرے لباس میں دیکھنا اپ پسند نہیں کرتے تھے۔ اور اُسکی کوئی ادا اُسکے لیے دُلفریب نہ تھی۔ بلکہ کسی قدر ناگوار ہی تھی۔ جب دربار کا رنگ بدلا دیکھا۔ بادشاہ کی نظر پھری پائی۔ تو اس بیچاری نے متواتر اجازت چاہی کہ اپنے وطن کشمیر مو آئے مگر ہر مرتبہ درخواست نامنظور ہوئی حتیٰ کہ اُسے خاصہ تراش کو بیچ میں ڈالا اور اُس سے بھی سفارش کرائی مگر کچھ شنوائی نہ ہوئی۔ بادشاہ کے پہلو میں دل نہ تھا۔ پھر کا ایک منکر تھا۔

اسی زمانے میں محرم آگیا اور کامل چالیس دن تک ہلوگ دیار سے الگ تھک رہے۔ کبھی کبھار دربار جنگا ہی میں اتفاقاً بادشاہ کی زیارت ہو جاتی تھی۔ عزاداری کی وجہ سے تاج رنگ دار انگریزی



دو عتیں یکھم نہ تھیں وجہ یہ تھی کہ بادشاہ نے اپنی تخت نشینی سے پیشتر بہ سنت مانی تھی کہ اگر مجھے کبھی تخت شاہی نصیب ہوگا تو میں بجائے عشرہ کے (جس میں عام لوگ محرم منایا کرتے ہیں) ارہین تک عزا داری کیا کروں گا۔ جب نچ اس عہد پر تھی کہ ساتھ وہ قائم رہے۔

محرم کے آجانے سے ہلوگ بیجاری تھو اسکے دیدار سے محروم ہو گئے۔ جب محرم ہو چکا تب بھی وہ ایوان شاہی میں کہیں نظر نہ آئی۔ یہ کچھ نہ کھلا کہ اُس بیجاری کا حشر کیا ہوا۔ خاصہ تراش سے ہو چھا اُسے اپنی اعلیٰ ظاہری۔ خدا جانے وہ بھی ہماری طرح ناواقف تھا یا جان بوجھکے چھپاتا تھا۔ بظاہر اُسے اپنا یہ قیاس بیان کیا کہ غالباً بادشاہ نے اپنے کسی محل کو بطور خواص اُسے عطا کر دیا ہو۔ اور محلات میں کہیں نہ کہیں موجود ہوگی۔ مگر ایک خواجہ سرا سے معلوم ہوا کہ محلات میں تو وہ ہر جنیں۔ میں نے ایک بار تذکرہ بادشاہ سلامت کے حضور میں اسکا نام لے لیا۔ مگر انھوں نے اس پر مطلق التفات نہ فرمایا۔

ایک مثال تو ہو چکی۔ اب دوسری مثال سناتا ہوں۔ یہ ذرا پہلی سے درجے میں گئی ہوئی ہو۔ یعنی ایک مرتبہ بادشاہ سلامت کی سواری جلوس کے ساتھ اُس سڑک پر جو رمنے کے اندر سے نکل گئی ہے چاند گنج (جہاں موذی جانوروں کی لڑائی ہوا کرتی تھی) جا رہی تھی۔ خود بادشاہ سلامت ایک کھلی گاڑی میں پورے انگریزی سازو سامان سے سوار تھے۔ کوچ کس پر اُنکا اُرش (باشندہ آر لینڈ) کو چنان بیٹھا ہوا تھا اور نہایت خوبصورت۔ عربی آنس۔ تقریاً بگ چوڑی ہانک رہا تھا۔ دسمبر کا مہینہ اور موسم خوشگوار تھا۔ ہوا خشک اور روح پرو تھی۔ اور تازت آفتاب کا اثر محسوس نہ ہوتا تھا۔ بادشاہ سلامت نے کوچان کو حکم دیدیا تھا کہ ذرا آہستہ قدم قدم چلے کہ ٹھنڈی ہوا کا لطف لے۔

ہلوگ شاہی گاڑی سے تھوڑا پیچھے گھوڑو پر سوار تھے۔ اور شاہی باڈی گاڑو کا رسالہ ہمارے پیچھے تھا۔ کبھی کبھی جب ہم میں سے کسی کو کچھ عرض معروض کرنا ہوتا تھا تو وہ آگے بڑھ جاتا تھا اور ٹوپی اتار کے بادشاہ کی گاڑی کے باہر بیٹھا جاتا تھا اور جو کچھ عرض کرنا ہوتا تھا عرض کر لیتا تھا۔ کیونکہ یہ ہمیشہ کا دستور تھا کہ جب کبھی بادشاہ ہم میں سے کسی طرف متوجہ ہوئے اُس سے کچھ فرمانے لگتے تھے یا ہم کچھ عرض کرنا چاہتے تھے تو فوراً اپنی ٹوپی سر سے اتار کے ہاتھ میں لے لیتے تھے۔ چنانچہ گاڑی بھلی جا رہی تھی اور ماسٹر صاحب بادشاہ کی گاڑی کے برابر موجود تھے۔ کہ ایک شخص نیم بہنہ کشیدہ قامت۔ قوی اجڑے سر کے ایک کنارے سے سامنے آکر ناچنے اور دھنیا دین سے گانے لگا۔ بادشاہ اُس شخص کی طرف مڑ کے

لے آخر اس قدر تحقیق کی گیا ضرورت تھی۔ ان ٹھیک ہو۔ آپ تو جردی کی حالت میں تھے۔ بڑا تعجب ہوا اپنی بیڑیوں کی مرکز منت مصل نہ سالی۔ معلوم ہوا کہ آپ دو ہی ڈیڑے کے عاشق بنے رہے۔ مترجم

دیکھنے لگے۔ استے میں دو ایک سوار آگے بڑھے کہ اس شخص کو سامنے سے ہٹا دیں۔ مگر بادشاہ سلامت نے انکو منع فرمایا اور حکم دیا کہ گاڑی ٹھہرا لو۔ اسوقت یہی لہر آگئی تھی کہ گاڑی روک دی ورنہ کوئی اور موقع ہوتا تو سواروں کی اس دوا رگیر اور تعدی کو دیکھکے میا خٹہ ہنستے اور قہقہے مارتے۔

پیر و (یہ اس شکستہ حال وحشی خضال شخص کا نام تھا) یہ سمجھ کے کہ بادشاہ سلامت اسپرستو بہر ہن خوشی کے مائے اپنے آپ سے باہر زور ہا تھا۔ اور جب اُسکی کشش نے یہ اثر دکھلایا کہ شاہی سواری رگ ٹکی اور سارا جلوس جہاں کا تھاں تھم گیا تو وہ اور بھی خوش لعلیاں دکھانے لگا۔ بے تکان ناچتا بھی تھا۔ بھیننی آواز سے گاتا بھی تھا۔ گاتا کیا تھا؟ ایک گیت تھا۔ جو خود اُس نے جوڑا تھا۔ اس گیت کی ایک کڑی جس میں بادشاہ سلامت کی بہت کچھ ثنا و صفت کی تھی۔ اور چا پوسی کی تھی قبلہ عالم کو بجا گئی۔ اور وہ بھوم بھوم کے اول سے آخر تک گیت سنا کیے۔ آخر ایک خدنگار کو حکم ہوا کہ اسے پانچ شرفیاں انعام دو اور اُس سے فرمایا کہ ہم تمہارا گانا کل ایوان شاہی میں سنیں گے۔ اسکے بعد حکم دیا کہ سوار ہی بڑھے۔ اُس وقت پیر و نے نہایت ادب سے عرض کیا کہ قبلہ عالم کا ظل ہمایوں مجھ پر ویسا ہی پرتو افکن ہو جیسے کجور کے درخت پر شعلہ آفتاب۔

پیر و سلیطہ وحشیانہ طریقے کا ایک شاعر تھا۔ البتہ شعراے قدیم کے خلاف اُس میں شرم و لحاظ کی کمی تھی۔ شوخی طراری زیادہ تھی۔ دوسرے دن وہ در دولت پر حاضر ہوا۔ اور ایک نو تصنیف گیت گاتا چاہا۔ لیکن بادشاہ کو وہی گیت مرغوب ہو چکا تھا جو پہلے دن سنا تھا۔ اور کچھ سننا نہ چاہتے تھے چنانچہ انکی دن برابر پیر و حاضر و بار بار ہو کے وہی راگ گاتا رہا۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ بادشاہ سلامت کو اُسکے سننے سے ہر روز دنیا لطف حاصل ہوتا ہی۔ اتوا انعام اکرام۔ اور داد و دہش کا مینہ برسنے لگا۔ اور پیر و بھی لکھنؤ کے شمار میں لوگوں میں سبھا جانیدگا۔ ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا کہ بادشاہ سلامت کی مرضی دیکھکے نواب صاحب جنرل صاحب۔ اور راجہ پنجا اور سنگھ جنرل پولیس نے بھی خوب تحفے تحائف پیر و کو دیے اور ہر طرف سے چھپر بھاڑ کے دولت برسنے لگی۔

ان حالات کو دیکھکے ہر شخص یہی سمجھنے لگا کہ ایک نہ ایک دن پیر و بھی عائد سلطنت کے زمرے میں داخل ہو جائیگا۔ چنانچہ لوگوں نے جب دوسرے وہ نکلتا تھا تعظیم دینا شروع کر دی۔ غالباً بعض ناظرین یہ خیال کریں گے کہ ”یہ کیفیت دیر پا تو نہ ہوگی“ نہیں یہ بات نہ تھی۔ اُسکے اقبال کا دریا زوروں پر بہ رہا تھا۔ اور بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ ایوان شاہی میں اُسکی سکونت کیواسطے کچھ کمرے بھی مرتب کر دیے گئے اور پہلے جس جسم پر ثنابت کپڑے بھی نہ تھے۔ اب زرد سرخ گزٹ وغیرہ سے وہاں بہتہ و پیراستہ رہنے لگا

نواب صاحب اور جنرل صاحب اور راجہ پنجاہ و سرنگھ پور تینوں اعلیٰ اراکین سلطنت اُس سے بدرجہ سادہ  
تخلیص کر لے گئے۔ اور پھر بھی اپنی زرق برقلبوس اور تازہ بزار عورت افزائیوں سے ہر وقت برسرِ حساب  
رہنے لگا۔ بھلا۔ ایسا شاعر کہیں اور بھی ہوا ہے۔ جسے اس طرح ادھن ملی ہو۔

رکتہ رفتہ روزانہ سے ہفتے ہفتے وار اور ہفتے وار سہ ماہوار اور سالانہ آخر کبھی کبھار پیر و دربار شاہی میں  
لگانے کو حاضر ہو بیٹھا۔ لیکن اب بھی الطاف و عنایات شاہی پر متور تھے۔ اٹھارہ مہینے تک کا تو حال میں  
چانتا ہوں۔ کیونکہ جس روز پشمنس شرک کے ایک گوشے سے جنگی جانور کی طرح ٹھکڑا شاہی گاؤں کی کراسنے  
آیا تھا اور سواران ہزاری اپنے نیزوں سے اُسے قتل کرنے کو بڑے تھے۔ اُسکے اٹھارہ مہینے بعد جب  
میں نے لکھنؤ کو چھوڑا تھا۔ اُس وقت تک پیر و شاہ میرا سہ لکھنؤ میں بچنا چاہتا تھا۔ پیر کا خطاب مجھے ٹھیک  
یاد نہیں ہے مگر اتنا خیال ہے کہ پہلے شاہ کا پیر راجہ کا خطاب اُسے ملا تھا۔ کیونکہ وہ ہندو تھا۔ اور جہانگیر مجھے  
یاد ہے کہ راجہ اور شاہ ہندوؤں کا لقب خطاب ہے اور میرا تو اب مسلمانوں کا۔

چونکہ اس موقع پر میں شاہی نظر عنایت اور الطاف و مہر و خیر و ان کی قصیدہ خوانی کر رہا ہوں اسلی  
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک اور روایت بیان کروں۔ جن میں ہوشاد سلامت نے میرے ایک پور میں  
دوست پر جو عنایات مبذول فرمائیں انھیں قلمبند کروں۔ یہ صاحب اُس وقت کلکتے سے آئے تھے اور  
اب ولایت میں قصبہ بڈل سس کے شریعین (یعنی ؟ ... ) ہو گئے ہیں۔ اور اُنکے حال پر بادشاہ  
سلامت بہت مہرباں ہو گئے تھے۔

مجھے لکھنؤ میں آئے ہوئے چند مہینے گزرے تھے کہ ان صاحب نے مجھے الہ آباد سے لکھا کہ اُن  
داہمی پنجستان میں یہ قصد رکھتا ہوں کہ بالاسے ہند کے صوبجات کو بھی تھوڑا سا دیکھ لوں ؟ اعلیٰ حضرت  
کا منشا یہ تھا کہ وہ محمد سے پوچھتے تھے کہ اگر وہ لکھنؤ آئیں گے تو اُنکو کوئی موقع مل سکیگا کہ یہاں وہ جانورنگی  
لڑائی و بار لکھنؤ کی کچھ سیر۔ اور یا اب باتو میں سے کوئی بات دیکھ سکیں گے جو لکھنؤ کی واسطے مخصوص ہیں اور  
جنگی واسطے اودھ کا دار السلطنت مشہور و معروف ہے۔

میرے ان مہربان نے کلکتہ میں بذریعہ تجارت بہت کچھ دولت پیدا کر لی تھی۔ اور چونکہ وہ میرے  
بڑے ہلکری دوست بھی تھے لہذا مجھے یہ بتانا تھی کہ میں کسی طرح اُنکو اپنا مرہون منت بنا لوں۔ کیونکہ  
روپے والے آدمیوں کے دوست احباب کی ہمیشہ ہی آرزو ہوتی ہے کہ کسی طرح اُنکو اپنا منہوان و احسان  
بنالیں۔ چنانچہ میں نے اُنکو لکھنؤ بھیجا کہ تم فوراً چلے آؤ میں تمکو قعر شاہی کے سیر بھی دکھا دوں گا۔ قش غما سنبھی  
دیکھو گے۔ اور بادشاہ سلامت کی زیارت سے بھی شرف کروں گا۔ اس سے زیادہ اور کچھ وعدے نہیں کر سکا

آنکھ کھینچنے کے بعد میں نے ایک دوست سے جو صاحب شاہی تھے اسکا تذکرہ کیا اور انھوں نے مجھے کہا کہ "اگر کوشش کیجئے تو خاصہ تراش سے سی کر کے جانور دہلی لڑائی کا تاشہ مثلاً باتھو کی لڑائی کا تاشہ بھی ضرور دکھلادینا چاہیے۔ کوشش ضرور کرنا چاہیے اس میں ہرج ہی کیا ہو"۔

خاصہ تراش کے مکان پر بادشاہ نے ایک میز انشا کھینچنے کی ہم پرہی لوگوں کیواسطے منگا کے رکھوا دی تھی۔ اور ہم میں سے کوئی نہ کوئی ضرور وہ پر کو وہاں جایا کرتا تھا۔ چنانچہ اسی روز میں وہاں گیا۔ دیکھا کہ باڈی گارڈ کے کپتان سبھغا خاصہ تراش صاحب مکمل پہے ہیں میں نے اُن سے کہا کہ "کلانہ کے مشر آج میرے بڑے دوست ہیں الہ آباد سے لکھنؤ کی سیر دیکھنے آتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انکو قش خانے کی سیر کا موقع تو ملنا چاہیگا"۔ انھوں نے مہربانی کے لہجے میں جواب دیا کہ "بیشک بیشک۔ تم کوئے تو میں اپنا ایک چوہہ ار ساتھ کر دوں گا وہ سارا قش خانہ دکھلائینگا"۔ چونکہ یہی خاصہ تراش بلخ کانگول - اور قش خانے کا مہتم تھا۔ لہذا قش خانہ میں جیس قابل دید تھیں اُنکے دکھانکوا سکا چوہہ ار کافی تھا۔ پھر کھیل دیکھتے دیکھتے رواروی میں اور کسی قدر بے پروائی کے ساتھ کہا کہ "میں جانتا ہوں بالکل کوئی موقع باتھیوں کی لڑائی کا نہوگا"۔ اتنے میں خاصہ تراش نے کہا کہ "کپتان صاحب انشانہ مارینگے۔ یعنی وہ بازی جیت لی"۔ پھر سری طرف مڑ کے کہا کہ "میں سمجھتا ہوں آج کل کوئی ہاتھی مست نہیں ہو"۔ پھر تھوڑی سکوت کے بعد فرمایا مجھے پوچھا کہ "کیوں جی۔ تمہارے یہ دوست کچھ تنہائی کا روبرو کرتے ہیں نا؟ بھلا اگر میں چاہوں تو وہ میرے واسطے کپنی کے کچھ نوٹ خرید دینگے؟" میں نے کہا کہ "بیشک۔ وہ ناجبری ہیں اور شاہد تینے کلانہ کے مشر آد مالک کا رخانہ آر۔ پی۔ اینڈ کپنی کے مالک کا نام سنا ہوگا۔ بس یہ وہی صاحب ہیں۔ انھوں نے خود بہت کچھ دولت پیدا کی ہے اور مجھے یقین ہے کہ میرے ممنون بنانیکو ضرور وہ میری ہر ایک بجا خواہش کی تعمیل کر سگئے۔ اس پر خاصہ تراش نے کہا "چلو۔ بس ٹھیک ہو۔ معاملہ ٹھیک ہے۔ اچھا تو اب میں بھی جانور دہلی لڑائی کا کچھ انتظام کر دوں گا۔ اگر مست ہاتھی نہیں ہیں۔ نہ سہی۔ شیر اور گیندے وغیرہ تو موجود ہیں"۔ پھر کھیل میں مصروف ہو کے مجھے کہا کہ ہماری طرف سے تم شاکر کرتے جانا۔ "اُس کپتان صاحب پھر نشانہ مارینگے۔ اور بازی ہوگئی۔ اچھا بھئی۔ تمہارے پچاس روپیے کا میں پندرہ روپے کھیل ختم ہو چکا تو میں بالظہان تمام اپنی قیام گاہ پر واپس آیا۔ دوسرے دن جبکو میرے دوست آگئے۔ اور میں جانور دہلی لڑائی کی بابت سن گئے سنے دربار شاہی گیا۔ اُس وقت حسب معمول خاصہ تراش بادشاہ سلامت کے بال ستوار رہا تھا اور اُسے باتیں بھی کرتا جاتا تھا۔ ایک دفعہ ذرا سکوت کر کے اُس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ "جا پناہ نے بہت دنوں سے جانور دہلی لڑائی کا تاشہ ملاحظہ نہیں فرمایا"۔ بادشاہ

نے فرمایا کہ ”ہاں بہت دنوں سے اتفاق نہیں ہوا۔ میں اس لڑائی سے اگلیا گیا ہوں۔ میری دانست میں ابھل کوئی مست ہاتھی بھی لڑائی کے قابل موجود نہیں ہوگا“ اس پر خاصہ تراش نے عرض کیا کہ ”خداوند نعمت! ہیں تو۔ مجھے آج صبح ہی کو خبر ملی ہو کہ مست ہاتھی موجود ہیں“ پھر بادشاہ نے فرمایا کہ ”کیوں کیا تم ہاتھیوں کی لڑائی کی سیر دیکھنا چاہتے ہو؟“ اس پر خاصہ تراش نے عرض کیا۔ ”قبلہ عالم! جو حضور کی مرضی“ مگر بالفعل سسرآر کلکتہ کے ایک بڑے دولت مند تاجر دہلی اور آگرے وغیرہ کی سیر کرتے ہوئے یہاں وارد ہوئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ اچھی طرح گلشن کی سیر دیکھ سکوں اور یہاں کی یاد دہلی کے جائیں“ بادشاہ سلامت فرمانے لگے۔ ”بیشک بیشک! یہ تو ضرور ہونا چاہیے۔ اور میرے نزدیک تم نے کلکتہ یا انگلستان میں کچھ کام بھی لے سکو گے“ اس پر اس خود غرض نے عرض کیا کہ ”جا پناہ تو اڑتی چیزیاں کے پرگنتے اور بول کی بات تاڑ جاتے ہیں“ غرض کہ سب ملے ہو گیا کہ دوسرے دن ایک بجے چاند گرج میں جانور دہلی لڑائی ہوئی سب ملے ہو چکا۔ تو میں اپنے دوست کے پاس یہ مژدہ سنانے واپس آیا۔ اور میں نے اُسے کہا کہ ”ذرا آپ خاصہ تراش صاحب سے تپاک کے ساتھ بیٹے گا۔ کیونکہ انھیں نے تھامے واسطے یہ سب باتیں ملے کی ہیں“ وہ کہنے لگے۔ ”بیشک۔ میں اُسے بہت تپاک سے ملوگا۔ کیونکہ جس حال میں بادشاہ کے منظور نظر ہیں انہیں بھی تو بھلا ایسے شخص سے کون ایسا ہوگا جو تو واضح و کرم سے پیش نہ آئیگا میں ضرور بہت اخلاق تو انھیں سے ملوگا“ واضح ہو کہ سسرآر میں ایک صاحب بننے کا مادہ پہلے ہی سے بہت کچھ موجود تھا۔

وقت معینہ پر چوہدار حاضر ہوا اور اُسکے ہمراہ ہم قبل اسکے کہ ہم تپاک خانے جا کر بیٹوں کو دیکھیں ”گلشن کے شیروں“ کے دیکھنے کو چلے گئے۔ ان شیروں کی بابت میں تھوڑا بہت بعد کو لکھوگا۔ اس مقام پر یہ ذکر چھڑ کے اپنے سلسلہ سخن کو قطع نہ کرونگا۔ اور بیٹوں کی بابت تو مجھے آگے چلے بہت کچھ لکھنا ہی ہے۔ غیر۔ تو اس چوہدار کے ساتھ ہلوگ سیر کو چلے۔ چوہدار کی چوبیس عصاے موسیٰ کی طرح عجب تھیں۔ کہ جس سے ہر طلسم فوت جاتا تھا اور ہم ہر ایک مقام پر بے روک ٹوک چلے جاتے تھے۔ یوان شاہی۔ و فائر سرکاری۔ سپرگرن۔ توپ خانہ۔ امام باڑہ (جسکو یادری میر صاحب نے غایت تقدس سے مسلمانوں کا عبادت خانہ تحریر کیا ہے) ساجد۔ باغات کا ٹھنڈیا (یعنی جنرل مارٹین صفا کی کوٹھی) قش خانہ۔ اور رمنہ ہر جگہ اُسکی کیسان تاثیر ظاہر ہوتی تھی۔

دوسرے دن صبح کو ہلوگ چاند گرج سوار ہو گئے۔ کیونکہ اسی مقام پر ہاتھیوں کی لڑائی کا سب سامان کیا گیا تھا۔ یہ مقام شہر سے تیس میل کے فاصلے پر دریائے گوتمی کے اُس پار تھا اور یہیں معمولاً جانور دہلی

لڑائی ہوتی تھی۔ یہاں ایک چھوٹی سی عمارت ڈاک جنگلہ کے قطع کی بنی ہوئی تھی۔ اور اُسکے گرد اگر وہاں پیدا دیے اونچا اونچا احاطہ کچا ہوا تھا۔ یہاں پہنچنے میں نے اپنے دوست کو ایک چوہدار کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اُسکے ہزار شیشی حصہ عمارت میں بیٹھنے نہایت آسانی کے ساتھ سامنے کے صحن میں جو لڑائی ہوگی اُس کا تماشا بخوبی دیکھ سکیں۔ میں اسوجہ سے اُسکے ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتا تھا کہ میرا فرض منصبی یہ تھا کہ اوپر کی منزل میں جا پناہ کی حضوری میں حاضر رہوں۔

جب ڈسکے اور نقائے کی آواز میرے کان میں آئی اُسوقت میں اپنے دوست کو نیچے چھوڑ کے جیل کھڑا ہوا۔ کیونکہ یہ علامت بادشاہ کی تشریف آوری کی تھی۔ اور سوا بادشاہ یا بادشاہ بیگم کی ساری اور سبکی سواروں کے ساتھ ذبوت نقارہ ہونیں سکتا تھا (بالا خانے پر آکے میں اپنی جا سے معینہ پکھڑا ہو گیا۔ اتنے میں بادشاہ سلامت تشریف لائے اور تخت پر بیٹھن ہو گئے۔ اور اُنکے پس پشت خواص میں گلس رانی کرنے لگیں۔ ہلوگ اپنے اپنے موقع صحن سے اس طرح کھڑے ہو گئے کہ کوئی نہ پر ہتھکا ہوا تھا اور کبھی کا تھ گوشہ تخت سے ٹکا ہوا تھا۔ بادشاہ سلامت نے میری طرف دیکھا اور پوچھا کہ ”کیوں جی! وہ کلکتہ والے سسر آتھا ہے ہاں ٹھہرے ہوے ہیں“ میں نے جواب دیا ”جی۔ پیر و مرشد“ ارشاد ہوا ”اُسوقت کہاں ہیں“ میں نے عرض کیا ”خداوند۔ اُنکو نیچے کے درجے میں ایسے موقع سے بٹھا دیا کہ جہاں سے وہ لڑائی کی سیر بخوبی دیکھ سکتے ہیں“ پھر پوچھا کہ ”تم اُنکو یہاں کیوں نہ بٹھائے“ میں نے عرض کیا ”حضور مجھے اسکا کچھ خیال نہ رہا کہ جا پناہ اُنھیں حضوری میں باریاب ہونے کی عزت بخشیں گے“ بادشاہ نے فرمایا۔ ”لا حول ولا قوۃ۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔ اچی اُنکو یہاں بٹھاؤ۔ وہاں سے کہیں خاک دیکھ سکیں گے“

اگر میں جرأت کرتا کہ بلا صریح حکم شاہی اپنے دوست کو اپنے ساتھ لیے جاتا تو یقیناً اُن جہاں سے ”کوہ دور باش“ ضرور سننا پڑتی۔ اب یہ حکم پاکے فوراً میں نیچے اُترا اور میں نے اُنسے کہا کہ ”چلو نہیں جا پناہ یا دفرماتے ہیں“ وہ بولے کہ بادشاہ کی یاد فرمائی کا تو میں شکر گزار ہوں۔ مگر مجھے یہیں رہنے دو تو بہتر ہے“ میں نے کہا ”نہیں جی۔ تم کو ضرور چلنا چاہیے۔ نہ جاؤ گے تو بڑی توہین فرمان شاہی کی ہوگی“ وہ یہ کہتے ہوئے اُٹھے کہ ”بھئی آدمی ایسے ہیں جن پر چھپر بھاڑ کے عزت و عظمت برستی ہے“ اور جلدی جلدی نیچے پر چڑھنے لگے۔ میں نے اُنھیں روکا اور کہا ”ٹھہرو۔ ٹھہرو۔ اتنی تیزی نہ دکھاؤ“ پھر مجھے خیال ہوا ادریں نے کہا ”اے تم تو خالی ہاتھ بادشاہ کی حضوری میں جاتے ہو۔ کچھ اشرفیاں تو زور دیکھا کو بیٹو“ اُنھوں نے کہا ”مجھے تو یہ بات ہونا نہیں ہے۔ کہ خانی بادشاہ کی زیارت کے واسطے اپنی کچھ

اشرفیوں کا خون کروں۔ میں نے سمجھایا کہ "بھئی" بہ صحت ایک رسم ہے۔ کچھ بادشاہ اشرفیاں لے تھوڑی  
 لیں گے۔ وہ تو اپنی سرودھری یا گرم ہوشی کو سر کی جھٹ یا ہاتھوں سے اشرفیوں کو چھو لینے سے ظاہر کر دیتے  
 چلو۔ بس۔ ہند قبول ہو جائیگی۔ پھر انکو اشرفیوں پر اختیار ہو گا اپنی جیب میں رکھ لینا " میں نے جلدی سے  
 اشرفیاں کہیں سے مستعار لگائیں اور انکو دیں۔ وہ اشرفیاں لیکے اسطرچہ چڑھے کہ کھلی ہتیلی پر ایک سفید  
 رومال نہ کیا ہوا رکھا تھا اس پر اشرفیاں دھری تھیں۔ اسی انداز سے وہ حضور میں بار یا پ ہوئے۔  
 بادشاہ نے پہلے انکو بہت غور سے دیکھا۔ پھر ایک ہاتھ اٹھائے ہاتھ کے نیچے رکھ کے دوسرے ہاتھ کی  
 انگلیوں سے اشرفیوں کو چھو لیا۔ یہ گویا بڑی عزت افزائی اور گرم ہوشی کی دلیل تھی۔ اور میرے دوست  
 کو اس اعزاز خاص پر فخر کرنا چاہیے تھا۔ بچانے اسکے وہ کچھ دکھلائے گئے۔ جسکی توجیہ انھوں نے  
 بعد کو مجھ سے یہ کی کہ "بادشاہ نے جو اسطور سے اشرفیاں چھوئیں تو میں سمجھا کہ وہ ان اشرفیوں کو ملیں گے  
 اور میں نے یہ قصد کیا کہ اپنی ہتیلی بند کروں تاکہ وہ اشرفیاں نہ بچا سکیں۔ کیونکہ ہندوستان کا کوئی اعتبار  
 نہیں جو "لیکن بادشاہ نے فوراً اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور انکو اطمینان ہو گیا اور جلدی سے انھوں نے اشرفیوں  
 جیب میں پونجا دیں۔

اسکے بعد اشارہ کیا گیا اور دونوں طرف سے پیلان کو ہ پیکر چھوئے ہوئے بڑھے۔ ایک معمولی  
 لڑائی ہاتھ بندی تھی۔ جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک نے دوسرے کو جھکا دیا۔ اس میں کچھ جدت نہ تھی۔ تاہم میرے  
 دوست نے اُسے بہت حیرت کی نگاہ سے دیکھا اور انکو عجیب حظ حاصل ہوا۔ انکی اس حیرت و تعجب پر  
 بادشاہ سلامت بھی بہت مخطوط ہوئے۔ لڑائی کے ختم ہونے سے پیغمبر پیشتیر بادشاہ اُنسے اس قدر  
 بے تکلف ہو گئے تھے کہ انکو تخت پر لپٹے پہلو میں بیٹھ جائیکا حکم ہوا۔ مگر انھوں نے لحاظ اسکے کہ ہم سب  
 کھڑے ہوئے تھے۔ بیٹھنے کو ایک حرکت بجا اور نامناسب سمجھا اور عرض کیا کہ "میں بہت آرام سے  
 کھڑا ہوں۔ کچھ تکلیف نہیں جو " یہ حرکت انکی غایت درجہ اُجڑپنے کی تھی۔ کیونکہ بادشاہ نے یہ خاص  
 عزت افزائی انکی کی تھی اور اگر کوئی اور موقع ہوتا تو ایسے داب دربار کے خلاف جواب پر بادشاہ کو  
 غصہ آ جاتا اور اپنے سانسے کال دینے کا حکم صادر فرماتے مگر اتنا غنیمت ہوا کہ بادشاہ اسوقت عالم  
 سرخوشی میں تھے لہذا وہ اس بے تکلفی پر ہنس پڑے اور بیٹھنے کو واسطے دوبارہ اصرار فرماتے گئے  
 اسوقت میرے دوست نے گجرا کے میری طرف دیکھا۔ کیونکہ بادشاہ کے ہنسنے سے وہ یہ ضرور سمجھے  
 کہ لاعلمی سے کوئی حرکت خلاف ادب سرزد ہو گئی ہے۔ میں نے اُنسے اشارہ کیا کہ بیٹھ بھی جاؤ۔ چنانچہ  
 وہ فوراً تخت کے ایک گوشے پر تکلیف و تکلف سے بیٹھ گئے۔ اُنکے بیٹھنے ہی خواص میں جو بادشاہ

وہ فوراً تخت کے ایک گوشے پر ٹھیکہ و تخت سے بیٹھ گئے۔ اُسکے بیٹھتے ہی خواہشیں جو بادشاہ کے پس پشت گس رانی کر رہی تھیں۔ اب بادشاہ اور اُسکے ہمجان و دونوں کی پشت پر گس رانی کرنے لگیں کیونکہ دہار کا یہ معینہ آئین تھا۔

آخر کار ہاتھیوں کی لڑائی ہو چکی۔ سب لوگ اٹھکے اپنے اپنے ہاتھیوں پاس چوسٹے۔ میں بادشاہ کو گاڑی پر سوار کرانے چلا گیا۔ بادشاہ نے گاڑی پر سوار ہوتے وقت مجھے فرمایا کہ آج ہم ایسے ہی کھاتے۔ تم اپنے دوست کو اپنے ساتھ لیتے آنا۔ جیوت انھوں نے یہ ارشاد فرمایا تھا اسوقت وہ اپنے منظور نظر کے شانے پر سہارا دیے کھڑے ہوئے تھے۔

جب میں پشترار کے ساتھ ہاتھی پر سوار ہو لیا۔ تو میں نے اُسکے کہا کہ ”یار چے۔ تم بٹے خوش نصیب ہو آج تم کو چاہنا کے ساتھ خاصہ خوش کرنا ہوگا“ انھوں نے جھجھکا کے کہا ”میری کھیتی آئی ہے بادشاہ کے ساتھ کھانا کھانے سے تو ہزار درجہ میں اسکو بہتر سمجھتا ہوں کہ اکیلے یا تمھارے ساتھ کھاؤں“ میں نے کہا کہ ”غضب کرتے ہو۔ کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ تم تو بادشاہ کے منظور نظر میں چلے ہو۔ یہ عزت افزائی کیا کچھ کم تھی کہ انھوں نے تم کو اپنے برابر بیٹھنے کا حکم دیا“ وہ بولے ”وہ اچھی عزت افزائی تھی۔ میں باز آیا ایسے اعزاز سے۔ مجھے ایسے بیٹھنے سے کھڑے رہنا گوارا تھا تخت کے بارہ دار کنا سے نے مجھے بہت حیرین رکھا“

باوجودیکہ بظاہر میرے دوست اس اعزاز کی ہجو کر رہے تھے اور ناخوش معلوم ہوتے تھے مگر دل ہی دل میں وہ اس پر خوش بھی تھے کہ ایک ہی دفعہ کی ملاقات میں بادشاہ کو دلپراگنی صحبت کا اچھا نقش ہوا۔ میں نے اُنکو بہت ہی آسانی سے بادشاہی دعوت قبول کر لینے پر راضی کر لیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اُنکو خود یہ خیال پیدا ہوا کہ قدرت نے اُنکو بادشاہ کی مصاحبت کیو اسطے زیادہ موزوں بنایا ہے نہ تاجرانہ زندگی بسر کرنیکو۔ کیونکہ ایسے ہی کسی خیال کیوجہ سے انھوں نے دعوت میں جلتے وقت اپنا بناؤ چناؤ بہت دیر تک کیا اور مہول سے کمین زیادہ بن سنور کے چلے۔

جب ہلوگ بادشاہ کے پیچھے پیچھے کھانے کیسے میں داخل ہوئے۔ اُسوقت معلوم ہوا کہ بادشاہ کا یہ منشاء ہے کہ وہ اپنے پہلو ہی میں میرے دوست کو جگہ دینگے چنانچہ انھوں نے اپنے ماترے صاحب سے مخاطب ہو کر فرمایا ”ما مرچی۔ یقین تو کہ تم سداً آکر میرے پاس بیٹھنے کو جگہ دو گے“ اس پر اسٹر صاحب نے فوراً اُسکے واسطے جگہ خالی کر دی۔ میرے دوست پیمان اعزاز بخشش کی ایسی بھرمار ہو رہی تھی کہ ہر جدید عزت افزائی کو وہ نہایت سہولت و رغبت سے قبول کرتے تھے چنانچہ



وہ اس انداز سے کہ کسی پر جانے بیٹھتے جیسے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُنکی تمام عمر خفا سے کی میز پر بادشاہ کے پہلوں بیٹھے گزری ہو۔

جب لکھنؤ باری باری سے آنے لگے ورثہ داروں کی بون پر توں لکھنؤ کی تو بادشاہ سلامت کا غیظ خاطر شکستہ ہوا۔ حجاب و تکلف کے پردے اُٹھ گئے۔ بادشاہ نے میرے دوست سے مخاطب ہو کر فرمایا: ہمارے ایک بڑے جگری دوست آجکل انگلستان میں ہیں۔ تم وہیں جاتے ہو نا؟ واضح ہو کہ یہ جگری دوست ایک انگریز تھے جو سابق میں رزیدنٹ اودھ گئے تھے اور اُن سے بادشاہ سلامت سے بڑی بے تکلفانہ دوستی ہو گئی تھی۔ تہ ان صاحب کا نام مسٹر اسمتھ فرض کیے لیتا ہوں کیونکہ یہ نام بھی ان پر زب دیا ہو۔ اسمتھ صاحب کی بیوی کی صورت بہت نہ بہ فریب تھی۔ اور مشہور یہ ہے کہ بادشاہ بہ نسبت مسٹر اسمتھ کے مسٹر اسمتھ کے زیادہ گرویدہ تھے۔ چونکہ یہ واقعات میرے زمانہ اور دور لکھنؤ سے پیشہ سے ہیں اور میں کو کچھ لکھتا ہوں وہی لکھتا ہوں جو زبانزد عوام و خواص ہے۔ مشہور ہے کہ جب اسمتھ صاحب لکھنؤ سے علیحدہ ہوئے تب اُن کے پاس بچپن کا لکھ روپہ تھا۔ اور یہ معتبر رقم مسٹر صاحب کے نام سے کہنی کے کاغذات زیریں جمع تھی۔ یہ بھی مشہور ہے کہ سلیک بابت تحقیقات بھی لکھنؤ اور کچل گورنمنٹ نے بہت اخفا کے ساتھ کارروائی تحقیقات مکمل کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسمتھ صاحب مازمت سے مستعفی ہو کر انگلستان پہلے گئے۔

پھر بادشاہ سلامت نے فرمایا کہ "میرے بڑے گھرے دوست اس وقت انگلستان میں ہیں اور تم دیر رہ جاتے ہو۔ یہ کہتے وقت بادشاہ کی آواز میں ایک درو سا پایا جاتا تھا۔ یہ کلمہ کچھ تو اندرونِ حجابِ طبیعت کے اشتغال اور کچھ شاپین کے اثر سے تھی۔ اس پر مسٹر اسمتھ نے کسی قدر جرات کر کے سوال کیا کہ "منظور انگلستان میں ایسا کون ہے جسے مشہور کی دوستی کا اعزاز حاصل ہوا ہو؟" بادشاہ بولے "وہ ۱۸۰۱ء۔ ۱۸۰۲ء۔ آپ کو کچھ خبر بھی ہے۔ وہاں میرے دوست اسمتھ صاحب ہیں جو سابق میں میان رزیدنٹ تھے میرے دوست فوراً پکار اُٹھے کہ "اے وہ مسٹر اسمتھ! آغا۔ میں انھیں خوب اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ کیونکہ میں ایک زمانے میں ان کا مختار و کارکن بچکا ہوں" بادشاہ نے خوش ہو کر فرمایا "میرے اچھے دوست میرے بڑے اچھے دوست تم کہتے ہو کہ تم اُن سے بخوبی واقف ہو۔ میں تو اُن سے بہت جنت کرتا تھا اور یہ غیر۔ اب کیا ہو۔ معاذ اللہ۔ معاذ اللہ۔ میرا دل بیتاب ہے۔ ہاں۔ صاحبو۔ فرما لیتے اس بچہ گلاس بھرو۔ خوب بھرو۔ لباب بھرو۔ اور مسٹر اسمتھ کا جام صحت دین۔ سچی نوش کرو۔"

سبحون نے غٹ غٹ جام صحت نوش کیا۔ بعد اسکے پھر بادشاہ نے ارشاد فرمایا "اچھا ہے"

اب پھر اپنے اپنے جام بھرو۔ چھلکتے ہوئے بھرو۔ باللب بھرو۔ اور ستر اسمتھ کا جام صحت دو بار پیو۔  
 پھر دو دورے ہو گئے اور شاہین کی بوتل پر بوتل یا روٹکے حلق کے نیچے اڑ گئی۔ اب بادشاہ باطل است  
 ہو رہے تھے۔ اور کچھ توجہ بات کی، شتعالک اور کچھ شاہین نے آپے سے باہر کر دیا تھا۔ بادشاہ نے  
 میرے دوست سے پوچھی۔ کیوں جی۔ انگشتان میں تم ستر اسمتھ سے بھی لوگے کہ نہیں؟ ستر آرنے  
 عرض کیا کہ میں اُن سے ضرور ہی ملو گا۔ کیونکہ مجھے اُن سے کچھ خاص کام بھی ہو گا۔ تب بادشاہ نے اپنی نہایت  
 خوبصورت اور صرغ ٹھہری جو ایک اعلیٰ ویسے کے کاریگر کی بنائی ہوئی تھی، ورنہ ہزار فرسٹ رانک  
 (سکاڈر افسل) کو شہر پیرس سے خرید ہو کے آئی تھی۔ مع زنجیر مع اپنے گلے سے اُٹار کے  
 اپنے دست مبارک سے ستر آرنے کے گھے میں پھنسا دی اور بھٹکا بھٹکا کے فرمایا کہ "جی دیکھو ایک فیملین کا  
 ایسا نظمی وعدہ۔ مجھے کہہ کر یہ گھڑی ستر زنجیر بھتہ تم بھتہ صاحب کی ہم صاحبہ لے گئے ہیں پناہ دو گے  
 اس طرح سے پناہنا جیسے میں نے تمہارے گلے میں پناہ لی ہے۔ دیکھو وعدے کا خیال رکھنا" ستر آرنے  
 جواب دیا کہ "حضور میں یحیث ایک فیملین کے اپنی زبان دیتا ہوں کہ میں اسکو اسی طرح اسمتھ صاحب  
 کی ہم کے گلے میں پناہ دو گا بشرطیکہ انھوں نے منظور کیا" بادشاہ نے فرمایا کہ تم اُن سے کہنا کہ یہ ستر  
 نشانی ہے۔ وہ بے تحاشہ منظور کر لیں گی پھر خاصہ تراش سے مخاطب ہو کے فرمایا کہ خان جاو۔ حکم دیدو  
 کہ ہمارے دوست ستر آرنے کے واسطے ایک خلعت۔ گرد لیکو گراں ہر خلعت ہو۔ معہ پانچ سو شرفیوں کے فوراً  
 لائیں۔ پانچ قبیل حکمران ہی فوراً ایک خلعت جس میں دو نہایت بیش قیمت کشمیری شالیں اور ایک دامن لکڑی  
 تھا آیا۔ اور خود بادشاہ نے اپنے دست مبارک سے اور خاصہ تراش کی اعانت سے اُسکو اپنے ستر  
 دوست ستر آرنے کے کندھے پر ڈال دیا۔ جلی گرمی سے میناب ہو کے ستر آرنے پسینہ پسینہ ہو گئے اور جی پی  
 جی میں اپنی عزت افزائی پر اسقدر خوش تھے کہ باجیس کھلی جاتی تھیں۔  
 یہ خوش فہمیاں صبح تک ہوتی رہیں۔ بادشاہ سلامت صرف ستر اسمتھ اور اُنکی ہم صاحبہ کا ذکر کر  
 ایسے ایسے عنوان سے فرماتے رہے جسکی تفصیل لکھنا مناسب دیکھتی تھیں۔

جلسہ برفاست ہوا۔ بادشاہ کو لوگ سہارا دیئے حرم سرا میں لیچے۔ چلتے چلتے وہ بڑے  
 تپاک اور گر جوشی کے ساتھ ستر آرنے سے جو ہنوز مغل تھے رخصت ہوئے۔ اب میں اپنے دوست کے  
 ساتھ بالکھو میں سوار ہو کے نیچے برآمدے میں آیا۔ جہاں ہماری گائیاں اتھار میں ہو رہی تھیں گوٹاں  
 زیادہ نہ تھا مگر زمین بڑے چوڑے چوڑے کرنا پڑتے تھے۔

دوسرے دن جبکو کھانے سے پیشتر وہ اب کے ایک خدمت نے اشرافیہ قبیل لاکر بندہ پرکھا

گئی ہوئی پانچ سو ترنیاں تھیں۔ کہنے لگا کہ تھوڑا چاہنا ہو جو غلعت مسٹر صاحب دیا ہو۔ یہی کسی کے ساتھ کی اشرفیاء میں پہنڈ  
 تو مسٹر آروکان اشرفیوں کے لینے میں تامل اور ہزار ہوا کہ واپس کر دی جائیں مگر میں نے انکو بھلا یا کہ اس کو بڑھکے اور  
 کیا غلطی ہو سکتی ہو۔ غرض کہ بہت گفت و شنید کے بعد وہ راضی ہو گئے کہ اس رقم کو قبول کریں جتنے بولے آٹھ سو  
 پاؤں یا پنی جیب میں داخل فرمائیں۔ کیونکہ یہ بات آداب دربار میں داخل تھی کہ عطیات شاہی فوراً قبول کر لینا چاہی  
 نہ قبول کر نہیں۔ وہ یہ تحقیق شاہی کے یہ مطلب نکلتا ہو کہ یہ رقم مقدار میں کم ہو۔ جس سے معنا ایک طرحی حرص بھی  
 ترشح مونی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد بادشاہی ہر کارہ میرے لیے فوراً حاضری دربار کا حکم دیکر آیا میں جہت  
 بہت حائر ہوا۔ مجھے دیکھتے ہی بادشاہ نے فرمایا کہ میں تمہارے دوست سے ملے بہت محفوظ ہوا۔ انھوں نے  
 تو مجھے اپنا گرویدہ کر لیا ہو اسے کہو کہ اگر وہ یہاں کیا ہو گا۔ اگر اس کے میری ملازمت قبول کر لینگے تو میرے بہت بڑے  
 دوست ہو جائیں گے۔ اب یہ خاصہ تراش صاحب کے بہت تشویش لاحق ہو گئی اور جیب میں واپس جانے لگا تو وہ مجھ دروازے  
 پر ٹاڑا رو پوچھنے لگے کہ کیوں جی بھلا اتنا خیال کیا ہو مسٹر آرتھر شینگے کہ نہیں؟ میں نے کہا میں ٹھیک طور سے  
 کچھ نہیں کر سکتا۔ ان یہ بات ضرور ہو کہ بادشاہ کی عنایات حیدر دہلی انداز سے وہ خوش تو بہت معلوم ہوتے ہیں۔  
 مکان پہنچنے میں سے اپنی دوست کو شاہی پیام سنایا۔ مگر اسکو سکے انھوں نے بہت کچھ اپنا اطمینان ظاہر  
 کیا اور کہا کہ میں مصمم غم کر چکا ہوں اور اس سے شے نہیں کر سکتا۔ چنانچہ اسی شب کو وہ گھنٹو سو روانہ ہو گئے۔ یہ ہو کہ  
 ایک آوارہ وطن کیلئے جب وطن اور بالخصوص ملکستان جیسے وطن کو مقابلہ میں لطافت و عنایات شاہی کی کچھ وقعت نہیں سکتی  
 غالباً ناظرین کو کتاب ہدایہ خیال کرینگے کہ ہزار ہا روپیہ اور صد ہا اشرفیوں کی داد و دہش ادنیٰ درجے کے  
 منظور نظر اشخاص پر اور قریب قریب دس ہزار ہا روپے اور اسے خاصہ تراش کے حساب کی میانی اور زینت  
 انداز کی فضا و فرجی و اسراف سے بادشاہ کا خزانہ بہت جلد خالی ہو گیا ہو گا۔ بلاشبہ یہ خیال صحیح ہو کہ ملک آؤ  
 کی آمدنی ہر سال نام نہاد پندرہ لاکھ نہ لگتا تھی اور اس میں جملہ اخراجات فیج و دہرا و شلمی والے کیے جاتے تھے لیکن ساتھ  
 ہی اسکے یہ خیال رکھنا چاہیو کہ نصیر الدین حیدر کے والد غازی الدین حیدر بادشاہ نے خزانہ بھرا پڑا چھوڑا  
 تھا اور اسے نصیر الدین حیدر نے اپنی داد و دہش اور اسراف سے بالکل خالی کر دیا۔ یہ بات بھی تھی کہ معمولی  
 آمدنی ملک کے علاوہ کثرت سے مضطربان اور جرنلے برابر ہوا کرتے تھے۔ اور اس میں اتنی رقم آجایا کرتی  
 تھی جو بادشاہی انعامات و عطیات کو مجرا دیکھ بھی کھینچ رہتی تھی۔ ماوراء اسکے اکثر اہل خاندان شاہی کی  
 دولتیں بادشاہ کے ہاتھ لگتی تھیں اور باوجودیکہ آمدنی کے آخری سبب سے تھے پھر بھی نصیر الدین حیدر کے  
 عمل سلطنت کے ختم ہونے سے ایک یا دو برس پیشہ دربار گھنٹو سو روپیہ کی کمی کی باہر طرف سے چل پکار رہی ہوئی تھی  
 لہٰذا آپ کیوں نہ سمجھائے۔ آپ کا توشہ ہر روز نظر آ رہا ہو گا۔ یہ کہے کیا بھرا تھا۔ جبکہ کامیاب تھا۔

# باب ششم

عبارات نفیسہ

تھر شاہی یعنی فرخ بخش کی نسبت اگرچہ میں تھوڑا بہت لکھ چکا ہوں مگر ابھی اُس کے متعلق کچھ اور بھی لکھنا باقی ہے۔ اُسکی دست اور گنجائش۔ اُس کے متعدد قطعے اور ہر قطعے میں اچھے خاصے صحن۔ جس کے کالا پ یا آراستہ حوضیں۔ اُس کے مختلف ہانچے اور چمن۔ اور اُس کے لائے لائے مکانات شاگردیش کی ایک نظر دیکھ لینے سے صرف اُسکی بے دریغ شوکت اور اوپری اوپر کی حالت کا اندازہ ہو سکتا ہو لیکن اُس کے دروں دروازوں کی بھاری بھاری پردے اُسکی دیواروں پر گرگاہ یعنی طبع کاری اور رنگ آمیزی اُسکی زرق برق آرائش و تزیین اُس کے ذخیرہ خاواوات و عمارات مسنت۔ اُس کے نظریہ و گریوے لے جاؤ۔ فالوس۔ کنول۔ مزنگ کو دیکھنے معلوم ہوتا ہے کہ قصر شاہی کے اندر کیا کچھ ہے۔ اور کن مخصوص چیزوں سے اُسکی اصلی نمود ہے۔

اسی کو مٹی میں وہ کمرہ بھی تھا جس میں تخت شاہی رکھا تھا اور اُسکی کیفیت خاص طور سے بیان کرنا ضروری ہے۔ تقلید یورپ کے محض خطے نصیر الدین حیدر کے وقت میں جب طبع قصر شاہی کے اور حصے میں اپنا رنگ دکھایا تھا اسی طرح اس کمرے کی دیواروں پر چھپاٹے ہوئے شمع رنگ کے زلفی پردے پڑے تھے جو بجائے خود بہت فریبندہ و دلچسپ تھے۔ دیواروں پر ادھر ادھر کی طرح جو کھڑکیاں تھیں اُن سے بہت پاک و پاکیزہ ہلکی ہلکی روشنی پھیلتی تھی کہ جس سے شاہی دربار کا جہوت و بالا ہوا جاتا تھا۔ انھیں پردوں کی پچ بیچ میں شاہان اودھر کی چند قد آدم تصویریں بھی دکھائی دیتی تھیں۔ یہ تصویریں کسی طرح بُری نہیں کی جاسکتی تھیں۔ اور بادری پر صاحب نے بہت نصفانہ بات کہی ہے کہ غازی الدین حیدر راول شاہ اودھر کی تصویریں مصور نے کھینچی ہو وہ اگر لندن یا پیرس جاتا تو وہاں بھی نام و نمود پیدا کرتا۔ اس وسیع دالان کے ایک سرے پر جو در بلند تھا تخت شاہی رکھا ہوا تھا۔ اور وہ بہت ہی گرائی ہوا تھا۔ وہ بالکل ایک چوڑے کی قطع کا تھا، وسعت میں دو کمرے فرس سے چند فٹ بلند اور اُس کے سامنے کی طرف چار دروازے تھے کہ اُس پر ہوتا تھا۔ باقی تین طرف سونے کا کھڑا لگا تھا۔ اس چوڑے کی دیوار میں عروس چاندی کی تھیں اور ان پر افراط جہرات جڑے ہوئے تھے۔ سابق شاہ اودھر یا نوابان اودھر کی عادت یہ تھی کہ اسی چوڑے پر ایک اعلیٰ درجے کا مسند پھول کے مشرقی لوگوں کی طرح زانو توڑے (جیسے ہمارے ملک میں درزی بیٹھے ہیں) بیٹھتے تھے۔ لیکن نصیر الدین حیدر کا یوں دین مذاق بھلا اُس کو کیونکر گوارا کر سکتا تھا انھوں نے ایک پیش بہالو نفیس کرسی جو سونے اور ہاتھی دانت کی بنی تھی بجائے مسند کے اسی تخت پر رکھ رکھی تھی

اس تخت پر ایک مہل شامیادہ بنا ہوا تھا جسکی چوبیس اندر سے لکڑی کی تختیں اور اوپر سونے کے خول چڑے ہوئے تھے۔ اس شامیادہ اور شامیانے کی چوبیس گراں بہا جواہرات، حساب چڑے ہوئے تھے۔ اسی شامیانے میں سامنے کے منج پر ایک بہت ہی بڑا زرد جڑا ہوا تھا جسکے بات کہا جاتا ہے کہ دنیا میں اسکا ثانی نہیں ہو کرے کے دروں کی طرح اس شامیانے کے پرے بھی ارخوانی رنگ کے نہایت نفیس کاشانی مہل کے تھے خیر سہری زرد دوزی کام بنا ہوا تھا اور گرد موتیوں کی جھلر لٹکی ہوئی تھی۔ تخت کے داہنے جانب پہلو میں ایک سہری لمع کی کرسی صاحب رزیدنٹ کیواسطے ہمیشہ رکھی رکھتی تھی۔ دربار عام کے مواقع پر یا کسی خاص مجلس شور سے میں کل جماعت اور وہ انگریز حکام جنہیں رزیدنٹ صاحب پیش کرنا چاہتے تھے حضور شاہ میں بار بار یہ ہوتا تھا۔ یہ لوگ ہاتھوں میں اس طرح نذریں لیکے چلتے تھے جس طرح میں بیان کر چکا ہوں۔ اور جب کرے میں داخل ہوتے تھے تو سر نیاز جھکائے اور بہت جھک جھک کے تسلیں بجا لاتے حاضر ہوتے تھے پھر جسکے حال پر بادشاہ مہربان ہوتے تھے اسکی نذر اپنے ہاتھ سے چھو لیتے تھے اور جب کچھ کتاب ظاہر کرنا منظور ہوتا تھا اسکو دربار سے وشارہ کر دیتے تھے۔ بعد اس کے نواب اپنے وزیر اعظم نذریں لیکر تخت کے باب کنارے پر رکھتے جاتے تھے اور درباری لوگ نذریں پیش کر کے کچھلے پکچھلے سہٹ جاتے تھے اور اگر انگریز ہوتے تھے تو تخت کے داہنی جانب اور ہندوستانی ہوتے تو بائیں جانب مودب کھڑے ہو جاتے تھے۔ جب سب نذریں گزر چکی تھیں۔ تب بادشاہ ایک ہار صاحب رزیدنٹ کو گلے میں بٹاتے تھے۔ اسہر صاحب رزیدنٹ ایک ہار بادشاہ کو بٹا دیتے تھے۔ ان مراسم کے ادا ہو چکے پر بادشاہ اور صاحب رزیدنٹ دونوں اٹھتے اس کرے کے وسط میں آکے کھڑے ہو جاتے تھے اور جن لوگوں کو خود بادشاہ سرفراز فرمانا چاہتے تھے یا صاحب رزیدنٹ کی خواہش ہوتی تھی کہ سرفراز فرمائے جائیں انھیں اپنا سے جاتے تھے۔ یہ اکثر سہری گوٹے کے بنے ہوتے تھے۔ ہم ملازمان خانی کو اکثر یہ ہار عطا ہوا کرتے تھے اور ہلوگ بعد کو انھیں دربار کے ہندوستانی جوہری کے ہاتھ پہنچا دلاتے تھے۔ انکی قیمت پانچ روپے سے لیکر پچیس روپے تک ہوتی تھی۔ اور انکی تقسیم کے بعد دربار فراست ہوتا تھا اور بادشاہ کرے کے دو دروازے تک صاحب رزیدنٹ کی مشالیت کو آکر سٹے تھے۔ اور رخصت کی وقت انکے ہاتھ میں تھوڑا عطر گلاب پٹکا کے فراتے تھے خدا کا نام لے کر بعد صحبت تمام بادشاہ اپنے حج کے کرے میں تشریف لاتے تھے اس کرے میں ہم ملازمان خانی ناشے کی میز پر انکی تشریف آوری کے منتظر ہوتے تھے۔ یہاں آتے ہی تاتے وہ بہت ہی بے تکلفی اور دلگلی سے تاج اور تہہ شاہی اتار کے پھینک دیتے تھے اور اٹھتے جھٹانے لگتے تھے۔ اور پھر

کرسی پر پہنچ کر فرماتے تھے یہ ان یار و تازہ جنازہ کو بنو۔ خدیجہ نے بڑا فضل کیا کہ جلد فرست ہو گئی۔  
 فوہ! پیاس کے مارے میں تو جاں بلب ہو رہا ہوں۔ معاذ اللہ۔ یہ سارے تکلفات مجھے تو تھکا کر ڈالیں  
 بلحاظ فن تعمیر کے بادشاہ کا امام باڑہ جو شاہ نجف کے نام سے مشہور ہے لکھنؤ کی نہایت نفیس عمارتوں میں  
 اول درجے کی عمارت ہو۔ امام باڑہ اس عمارت کو کہتے ہیں جو شیعہ مسلمان محرم کی عبادت گاہ کی عمارت  
 بناتے ہیں جسکا ذکر آگے چلے کسی باب میں مفصل کر دینگا۔ اکثر ذی مقدور خاندان اپنا اپنا امام باڑہ  
 جدا جدا تعمیر کراتے ہیں اور اکثر صاحب تعمیر اُسی میں دفن بھی ہوتے ہیں۔

قدیم امام باڑہ شاہی لکھنؤ میں رومی دروازے کے متصل واقع ہو۔ یہ دروازہ اُس دروازے  
 کی نقل بنا ہوا جسکی وجہ سے سلطان پور کی کوآب عالی کا لقب ملا ہو۔ امام باڑہ اور رومی دروازہ دونوں  
 تعمیر میں بہت عمدہ بنی ہیں اور ایک عمارت دوسری عمارت پر موزوں ہو۔ امام باڑے میں ساتنے کی طرح  
 دو بڑے بڑے وسیع صحن ہیں۔ جن پر عمدہ تراشے ہوئے پتھر کا فرش ہو۔ اور اندرونی صحن بیرونی  
 صحن سے چند فٹ بلند ہو۔ اس امام باڑے کی وضع کو پادری ہیر صاحب نے مشرقی گاتھک کی قطع  
 کا قرار دیا ہو۔ اس عمارت میں اونچے۔ نیچے گنبد ہندوؤں کے مندر وں شوالوں کے قطع کے ہیں اور  
 بلند مینارے مسلمانوں کی مسجدوں کے ایسے بنے ہوئے ہیں۔ بحالت مجموعی یہ عمارت نہایت مرتفع و بڑی  
 شان دار اور متناسب ہو۔ اس عمارت میں بیچ کا دالان طولاً ۱۵ فٹ اور عرضاً ۱۵ فٹ سے زائد ہو  
 اسکی آراستگی کی شان و شوکت کو اسی بات سے قیاس کرنا چاہیے کہ ایک سنجیدہ خیالی نامہ نگار جس نے یقیناً  
 بچتر خود اُسے دیکھا تھا نے لکھا ہو کہ وہ دھکے بڑے سیر چشم اور ولولہ الغم نواب وزیر یعنی آصف الدولہ  
 نے اس امام باڑے کو دس لاکھ پاؤنڈ کے جھاڑنا نوس اور آئینوں سے سجایا تھا۔

اب میرا کانسٹنٹینیا یعنی جنرل مارٹن صاحب کی کوٹھی کے حالات بیان کرتا ہوں۔ عمارتوں کا سلسلہ  
 نامتناہی جسکے دیکھنے سے اُسکے بانی کے تلون طبع اور جدت پسندی آشکارا ہو۔ جنرل مارٹن صاحب  
 فرانسیسی کا تعمیر کیا ہوا ہو۔ گزشتہ صدی کے خاتمے پر یہ حضرت کہنہ کی فوج میں ایک معمولی سپاہی کی  
 حیثیت سے داخل ہوئے۔ بعد چندے اُنکے خدمات نواب او دھکی فوج میں منتقل ہو گئے یہاں پہونچے  
 درجہ بدرجہ ترقی کرتے کرتے وہ جنرل فوج ہو گئے۔ اسی ترقی مراتب کیساتھ ساتھ انھوں نے دولت  
 فرماں حاصل کر لی چونکہ مرغ بازی میں بڑے ہو شیار تھے اور بہ کمال رکھتے تھے اس لیے نواب  
 سعادت علی شاہ کو ان سے بازی دینے کا بہت شوق تھا۔

جنرل مارٹن صاحب نے ایک لاکھ پاؤنڈ کی ایک جائداد اپنے مولود مقام لیاٹس میں تقسیم  
 ہو چکی تھی۔ یہ ایک مدرسہ قائم کرنے کی غرض سے چھوڑی۔ اور اتنی ہی مقدار کی ایک اور  
 جائداد اسی طرح کی ایک اسکول کی کلکتہ میں قائم کر کے غرض سے چھوڑی۔ اور پھر قریب قریب اتنی  
 ہی جائداد اور چھوڑی کہ جس کو لکھنؤ میں بھی ویسا ہی مدرسہ قائم کیا جائے۔ انہیں سے ہر ایک مدرسہ کا  
 نام لارڈ مارٹن رکھا گیا۔ کیونکہ اُس کے بانی کی یہی ہرابت تھی۔ اور یہ سب مدرسے بخوبی چل رہے ہیں اور انکی  
 بدولت بہت فیض جاری ہو گا۔ سنشیا جیسے وہ خود رہتے تھے اُسکو انھوں نے سرائے یا کاروانسرایے  
 کی واسطے چھوڑا تھا۔ انہیں نے سنا ہو کہ اس عمارت کا نام انھوں نے اپنی پہلی مشوقہ کے نام پر رکھا تھا۔  
 جنکو وہ اپنے وطن فرانس میں چھوڑ آئے تھے اور جنھوں نے انکی ترقی دولت و ثروت سے پیشتر  
 دنیا کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ اس خیال سے کہ مرنے کے بعد کس نواب انکی کوٹھی ضبط کر لیں۔

جنرل صاحب نے یہ وصیت کر دی تھی کہ میں اسی کوٹھی میں دفن کیا جاؤں۔ چنانچہ وہ اسی میں دفن کیے  
 گئے۔ کیونکہ وہ بخوبی سمجھتے تھے کہ مسلمان چاہے کتنا ہی ظالم کیوں نہ ہو قبر کی بزرگداشت مزدور کرتا ہے جو  
 سیاح اس عمارت کو دیکھنے جاتے ہیں انکو جنرل صاحب کی قبر ایک زیر زمین تو خانے میں دکھائی جاتی ہو  
 اور ایک تابوت بنا ہو جسے دو رنگین صورتیں سپاہیوں کی اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور اسی تابوت پر جنرل  
 صاحب کا ایک بت سنگ مرمر کا تراشا ہوا رکھا ہو۔ یہ ساری دستکاری اور نقاشی نہایت اعلیٰ درجے  
 کے مذاق سلیم کو ظاہر کر رہی ہو۔

جنرل صاحب کے مرنے پر انکی کوٹھی کا اسباب آرائش نیلام ہوا تھا جسکو کمپنی (ایسٹ انڈیا کمپنی)  
 کے ایجنٹوں نے نواب گورنر جنرل کی کلکتہ والی کوٹھی کی آرائشی کے واسطے خرید کر لیا تھا۔ چونکہ کمپنی کے  
 مقابلے کی وجہ سے بادشاہ نے اس نیلام میں بولی نہیں بولی تھی اسوجہ سے کمپنی کو یہ سارا سامان بالکل اونے  
 پونے مل گیا تھا۔ اور کمپنی کو اس تاجرانہ چال پر پٹاناڑ تھا۔ شاید ایسی چال کی تو کوئی معمولی دست فروش  
 سوداگر بھی نہ کرتا۔

یہ جو کمایا ہو کہ کانسٹنٹینا کی عمارت بہت وسیع اور بے کان ہو حقیقت میں بچ کمایا ہو۔ مجھ کو اس  
 مقام کو بعض حصص کو دیکھنے کو واسطے کے باغات یاد آئے۔ بالخصوص اُس مقام پر جان ایک نرسلیب کی قطع عالی  
 گنہ ہوا۔ اُس کے گرد خوبصورتی و خوشبو سے دشتوں کو جھٹکے ہوئے ہیں۔ لیکن اگرچہ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہو  
 کہ ان پائچ بیچ نظر کے محل کر نیچے واسطے زریطہ مرنے کیا گیا ہو گا تاہم جو کچھ سامنے نظر آتا ہو وہ بحالت  
 عمومی بے جوڑ اور پھیل سا ہوتا ہو۔ کیونکہ اس عمارت کے صحن اور نور سے تو یورپ میں ہیں مگر گنبد اور مینار

ایشیائی وضع قطع کے ہیں کمرد کی شان تو کچھ یوں نہیں ہو لیکن برآمدے اور دریچے بالکل ہندوستانی ہیں لکھنؤ کی مسجدیں اور بازاریں دیگر مشرقی شہر ونگی بازاروں اور مسجدوں سے کچھ ایسے زیادہ مختلف الوضع نہیں ہیں جکی تصحیح کی زیادہ حاجت ہو۔ البتہ بازاروں میں سب سے نرالی ادا جو وہ اسی قدر ہی کراٹھیں بکثرت مسلح لوگ سپاہیانہ منہش کے ساتھ چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ کہ یہ بات کہیں اور پائی نہیں جاتی۔ معمولی طور سے یہاں کے رئیس اور امیر جب شرک پر نکلتے ہیں تو انکے ساتھ کچھ ہتھیار ضرور ہوتے ہیں۔ اور جقدر جو شخص امیر عالی مرتبہ ہوتا ہو اسی قدر ہمارے ہوں کی تعداد اسکے جلیوں زیادہ ہوتی ہو۔ اور شہر کے نشیبی حصہ میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہو کہ گلیوں میں انھیں سپاہیوں کیوجہ سے دھکے کھانا ایک ادنیٰ سی لڑائی پر ہو جاتا ہو جب کبھی اس قسم کی ہنگامہ آرائی ہوتی ہو تو اہل تو انکو شور و غل سے دور و در تک خبر پہنچ جاتی ہے جس سے صلح جو یا بزدلے لوگ اسوقت اپنی گھروں سے باہر نہیں نکلتے اور اس گلی کا رخ نہیں کرتے جہاں سوغل اٹھتا ہو البتہ شوریدہ سر رٹے بھڑٹے والے لوگ ہر طرف سے اُمنڈا تے ہیں۔ اور اسطورہ اکثر اوقات بہت سخت خرنریزی ہو جابیا کرتی ہے یہی حالت اسوقت تھی جب ۱۸۵۷ء میں لکھنؤ میں تھا اور اخبارات سے معلوم ہوتا ہو کہ اب بھی ۱۵۵۷ء میں لکھنؤ کی یہی حالت ہو۔

لکھنؤ کے اول درجے کے مکانات کی ایک خصوصیت خاص ذکر کرنے سے رہگی۔ یعنی یہ کہ اکثر ان عمارتوں میں زیر زمین بہت مکانیت ہوتی ہے۔ اور جب گرمیوں کے موسم میں آفتاب کی تمازت اور موسمی حرارت بہت بڑھ جاتی ہو تو لوگ جان بچانے کو انھیں تہ خانوں میں جا کے چھپتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہو کہ ایک حصہ دنیا میں لوگ شدت سردی کو محفوظ رہنے کے واسطے تہ خانوں میں پناہ لیتے ہیں اور ایک حصے میں شدت گرمی سے محفوظ رہنے کے واسطے۔ یا اس سرے یا اس سرے۔

تھرا ہی میں بھی ایک تہ خانہ تھا۔ جسکی سطح صحن کی سطح سے بھی نیچی تھی۔ اور ہم یوں زمین دربار کو نزدیک یہ زیر زمین کمرے بہت ہی بند بند تھے۔ اسکی ہوا سے جی گھبراتا اور دم گھٹنے لگتا تھا۔ میں تو اوپر کے کمرے کے۔ جلتی بھتی گرام گرم ہوں کہ چھیدوں کو اس تہ خانے کے بند کنیت اور دم گھٹنے والی ہوا پر طرے ترجیح دیتا جسمیں قبلہ عالم اور جہاں پناہ جا کے پناہ لیا کرتے تھے۔ چھب لڑی خوش قسمتی تھی کہ ان تہ خانوں میں بادشاہ نے ہکو بہت کم یا دفرمایا۔ کیونکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود بادشاہ سلامت کو بھی وہ زیادہ پسند نہیں ہیں۔ سچ یہ ہو کہ جو وقت وہ محل میں تشریف رکھتے تھے اور سلسلے کے ساتھ متواتر چکے جھلے جاتے تھے تو اگر جو گرمی کتنی ہی شدید کیوں نہ



آپ نے یادہ موثر نمونی تھی و جب کبھی تہ خانے میں تشریف بھی لیجاتے تھے تو اسے ایک نشین کی بات  
 سمجھ لے کیونکہ روسا اور دھکا عام فشن تھا کہ ایک غمخوار موسم میں وہ لوگ تہ خانوں ہی میں بسر کرتے  
 تھے اور چونکہ ایسے فشن جلسے بادشاہ کو نہ زیادہ آرام ملتا تھا نہ مضر حاصل ہوتا تھا انکی پابندی وہت  
 کم فرات تھے۔ لہذا سال میں بہت ہی کم دن ایسے ہوتے تھے جن میں وہ تہ خانے کو آ پاؤ کرتے تھے۔  
 لکھنؤ میں فقرا و مساکین کی کثرت بھی یہاں کی حقیقتات میں سے ہو۔ لیکن چونکہ اس بارے میں  
 اکثر حضرات خامہ فرسائی کر چکے ہیں اسلئے یہ مضمون پامان ہو گیا ہو۔ اور اسپر زیادہ لکھنے کو جی نہیں  
 چاہتا جن لوگوں نے ملک اعلیٰ کے شہروں میں سیاحت کی ہو انکو تو لکھنؤ میں یہ حالت کوئی نئی نہ  
 معلوم ہوگی اور چونکہ فی زمانہ فرانس۔ وریسے رہاؤں اور انکی کاسفر کرنا کوئی کرامات نہیں ہے۔  
 اور بہت ہی تھوڑی مدت میں آدمی سب کچھ دیکھ لیتا ہو۔ اسوجہ سے لکھنؤ میں بیک مگو کا جو زور ہی  
 اسپر زیادہ خامہ فرسائی نہ کر دیا۔ بعض لوگوں کی رائے ہو کہ دنیا میں سب کہیں سے زیادہ ادو دھ میں  
 بوڑھیاں و دیوڑہ گری کرتی نظر آتی ہیں۔ میرے نزدیک یہ رائے صحیح ہو اگرچہ میں انکی توجہ نہیں کر سکتا  
 لکھنؤ کے ہر گلی کو چے میں کچھ نہ کچھ مرد یا عورتیں جن میں بعضے جوان ہونگے بعضے نہایت ضعیف و نحیف  
 بوڑھے بھی۔ اور انہیں سے اکثر تو بیمار۔ روگی ہونگے۔ اکثر کی صورتیں بگڑی ہوئی بدقوار گہت  
 زدہ اور نہایت زار و زار حالت میں نظر آئینگے۔ انہیں سے بعض تو پیادے صدائیں لگاتے۔ جگر خراش  
 کلمات منہ سے نکالتے۔ جرم اور سلوک کی آوازیں بلند کرتے ہونگے۔ بعض ٹھہر ٹھہر کے لاکھنے کراہتے  
 در داہجڑاے دل سے رونا کیو لگاتے ہونگے چونکہ یہ عام دستور ہو گیا ہو کہ جب کسی بڑے رئیس  
 کی سواری نکلتی ہو۔ یا جب کوئی مذہبی تہوار آ پڑتا ہو یا کسی کے گھر میں کوئی تقریب منائی جاتی ہو  
 اسوقت بہت بہت سارے وسیع خیرات میں تقسیم کیا جاتا ہو اسوجہ سے یہ دیوڑہ گری کا کاروبار بہت  
 چمکا ہوا ہو۔ اور اپاہجوں کی تعداد برابر بڑھتی چلی جاتی ہو۔ ہندوستانی میں اگر کوئی بغیر ہاتھ پاؤں  
 ہلائے کسی کو کچھ مل سکتا ہو تو وہ اس کے انتظار میں حیرت انگیز طور پر صبر و تحمل سے کام لیتا ہو۔ سچ تو یہ ہو  
 کہ صبر و تحمل کے ساتھ انتظار کرنے کی صفت منطقہ حارہ میں خوب بھولی پھلی ہو۔ ایک یورپین سیاح  
 چاہے کیسا ہی جماندہ اور سرد و گرم چنیدہ کیوں ہو اس کے لکھنؤ کے بیک منگوں کی یہ خاص ادا ضرور  
 ہی سمجھ کر دیگی کہ جعفر مرد و غیر میں وہ سب ہتھیار بند ہیں اور انہیں سے بعض تو بہت میاکی کو ٹھٹھے  
 غزانے ہتھیار باندھتے اور جھیک مانتے ہیں گویا کہ انکو اپنی اس حرکت پر ذرا غیرت بھی نہیں معلوم  
 ہوتی۔ غیرت تو درکنار وہ تو اپنی ہوا داسے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ گویا یہ پیشہ باعث فخر و ناز ہو۔ یہ میاکی غیرت

اُدھال تلوار سے مسلح ہوتے ہیں کسی مالدار کو دیکھ کے فوراً ہاتھ پھیلا دیتے ہیں اور دعا دینے لگتے ہیں یہی آفتاب دولت اور اقبال ہم غریبوں پر ہمیشہ سایہ گستر رہے۔ کچھ نام امد بھی ملے۔ بس اتنا کہ دیتے سے اپنے نزدیک وہ دن بھر کی مزدوری پانچے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اگر کہیں کسی نے اُنکی طرف سے بے اعتنائی کے ساتھ منہ پھیر لیا تو بالکل سادگی اور بے تکلفی سے مادر و خواہر کی منغلات گالیاں سناتے لگتے ہیں جسکے ترجمے کی مجھے جرات نہیں رہتی۔

یہ کہ گفتوں میں بھیک مانگنے کا پیشہ دیوب نہیں سمجھا جاتا یہ اُس اکڑوں سے ثابت ہے جو یہاں کے نظر کرتے رہتے ہیں۔ اور نیز اس بات سے بھی کہ جب کبھی کسی امیر کے گھر لڑکا پیدا ہوتا ہی یا اُس کے بیٹی بیٹی کی شادی ہوتی ہو اس وقت وہ نہایت تہ دلی کے ساتھ حساب لگاتے ہیں کہ اب کی تو فوراً اتنا روپیہ ملے گا۔ اُن لوگوں کو اس قسم کی تقریبات کے اخراجات کا رتی رتی حال معلوم ہوتا ہو۔ اور وہ فوراً اپنا حق اسی حساب سے سمجھ لیتے ہیں۔ میں نے ایک نامی فقیر کا حال سنا ہو کہ اُسکے پاس اُسکا اپنا ہاتھی تھا جس پر سوار ہو کے روزانہ وہ شہر کا چکر لگاتا تھا اور اپنے سر پر پتوں سے تحصیل وصول کیا کرتا تھا۔

## باب ہفتم

آدم خوار

ایک روز میں گھٹو کی ایک نفیس شرک پر نگھی پر سوار جا رہا تھا۔ میرے ساتھ ایک دوست بھی گنجی میں تھے۔ ہم دونوں دیلے گومتی کے قریب سے محلات شاہی کے ایک محل کو جا رہے تھے اُسکے بڑے محلے مجھے اس بات پر بہت حیرت ہوئی کہ اس شرک پر سنا ما سا ہو۔ بڑی دور تک نظر کرنے سے کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ اور اگر اتفاقاً کہیں کوئی نظر بھی پڑا تو اس حالت میں کہ جس شرک پر ہم جا رہے تھے اُس سے کتر کے بھاگا جلا جا رہا ہو۔ جب کسی مقام پر کوئی ایسا حکمران ہوتا جو زمین ملکوں کے ساتھ جفا کاری ہوتی ہو اور جیسے اصولی کا پابند نہیں ہوتا جن سے طبیعت کی روک تھام ہو سکے تو وہاں ایسے تعجب خیز واقعات اکثر پیش آتے رہتے ہیں جنکو اگر کوئی تازہ ولایت انگریز دیکھے تو دم بخود رہ جائے۔ لیکن چونکہ ہم ایسی چیزوں کے دیکھنے کے خوگر ہو رہے تھے لہذا ہمکو چند ان استعجاب نہوا۔ اور آپس میں خیال دوڑانے لگے کہ معلوم ہوتا ہو کسی کو نہ ملے قتل ہوئی ہو یا عبرت کا نیا نمونہ پیش کیا گیا ہو۔ بس یہی کچھ ہوگا۔ اور کوئی بات نہیں۔

بالآخر چلتے چلتے چٹک پر پونچے۔ دیکھا کہ ایک خون آلودہ لاش بڑی بڑی جس کی صورت پہچان نہیں پڑتی۔ البتہ اتنا معلوم ہوتا تھا کہ ہے کسی انسان کی لاش۔ ہمنے اُس کے دیکھنے کو بھی روک لی۔ دیکھا کہ ایک غریب ہندوستانی عورت کی لاش ہو۔ لیکن ایسی طرح نقشہ بگڑا ہو کر دیکھے دیکھی نہیں جاتی۔ سارا بدن زخموں سے چور تھا۔ کپڑے پیچھے ہو گئے تھے۔ اور چہرے کو کسی نے دانتوں سے اس بے دردی سے نوچا تھا کہ سوا گشت کے نوٹھروں کے اوکچہ نظر نہ آتا تھا۔ سر کے بال بولنے بال جنگی جو بی بندوبستی تھی بچ چمکے ساری شرک پر خون میں تھرے پڑے تھے۔ یہ ماں لاش در دا گلیز اور مہیب تھا کہ آنکھ بھر کے دیکھا نہ جاتا تھا۔ بظاہر لاش میں کچھ بھی دم در و نہ تھا۔ بالکل بیجان تھی۔ ہر لوگ ذرا نہ ٹھہرے اور فوراً آگے بڑھے۔ جہاں تک آگے بڑھتے جاتے تھے ہو کا عالم تھا کہ ہاتھ کسی طرف کافی چڑیا تک نہ تھی۔ کوئی سانس بھی نہ لیتا تھا۔ تھوڑی دور گئے جل کے ایک نوجوان آدمی کی لاش دکھائی دی۔ یہ بھی جھنسہ سی طرح چور چور تھی اور ویسی ہی خون آلود۔ یہ نقش کیس قدر سرک کے ایک کنارے کی جانب تھی۔ اسی جگہ سے قریب ایک مکان تھا جسکی بھت پر ایک بادشاہی سپاہی کھڑا ہوا نظر پڑا جو غور سے اسی شرک پر چاروں طرف نظر ڈال رہا تھا۔ اُس سے پوچھا کہ سکیوں جی۔ یہ معاملہ کیا ہو؟ اُسے جواب دیا کہ آدم خوار چھوٹ گیا ہو۔ واللہ دیکھو وہ پھر اُسی طرف پلٹا ہو۔ صاحب۔ آپ اپنی جان بچائیے۔ آج یہ آدم خوار بہت ہی خوشخوار ہو رہا ہو۔ میں نے پہلے بھی سنا تھا کہ بادشاہی سوار وغیرہ سے ایک شخص کا گھوڑا بنام آدم خوار مشہور تھا کیونکہ وہ کئی آدمیوں کو ہلاک کر چکا تھا۔

اُس سپاہی نے بھت پرستہ ہکو پھرا اور کہا اور صاحب۔ صاحب۔ دیکھئے وہ آ رہا ہو۔ اور میری چلا آتا ہے اپنی جان بچائیے۔ ہمنے دور سے دیکھا کہ ایک بڑا قد آور۔ کیت گھوڑا دوڑتا ہوا ہماری طرف رخ کیے آ رہا ہو منہ میں ایک بچہ دبا ہوا ہو اور وہ اُسے بڑی بے رحمی سے جھنجھوٹتا جاتا چلا آتا ہو۔ جیسے ہی اُس نے لکھی کو دیکھا لڑکے کو شرک پر دے پٹکا اور نہایت تیزی سے ہماری طرف چھٹپا۔ ابھی ہم سے وہ در افاصلے پر تھا۔ ہمنے موقع غنیمت سمجھ کے فوراً اپنی گھوڑی کی اس پیھری۔ ہمارا گھوڑا خوف کی وجہ سے بے قابو ہو رہا تھا مگر ہمنے اُسے دوڑایا اور سر پٹ بھگا یا بھاگتے بھاگتے ہلوگ ایک احاطہ زہنی مین داخل ہو گئے۔ جس میں آہنی بھانک لگا ہوا تھا۔ اسطرح سے ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ گور سے تھے۔ ہکو یوں جی چھوڑ کے بھاگتے دیکھا کہ اُس آدم خوار نے بڑی زور شور سے تعاقب کیا۔ اُسکے فعل بندھ ہوئے سمون کے ٹاپوئی آواز برابر

سرگ پرہم سن رہے تھے۔ جیسو ہی ہلوگ احاطے میں داخل ہوئے ساتھی صاحب گہی سے بھانڈ  
 بڑی خوش ہستی سے بھاٹک میں آہنی زنجیر بھی تھی۔ قلابے بھی تھے۔ انھوں نے فوراً ہی بھاٹک  
 بند کر کے اپنی حفاظت کا اطمینان تو کر لیا۔ بھاٹک کی سنگنی کے بند ہونے کا کھٹکا ہوا ہی تھا کہ آدم  
 خوار زور زور سے ٹاپیں مارتا ہوا ہونچکيا۔ اسوقت اسکی ہدیت یہ تھی کہ سر پر تمام خون کی چھلیں  
 تھیں منہ سے تازہ خون ٹپک رہا تھا اور اس کے شکار کے بڑیوں کی خراش یا دم مرگ کی کشاکش سے  
 چہرہ کئی مقام پر چھلکيا تھا۔ اب وہ یہاں پہونچکے کھڑا ہو گیا اور لگا آگھیں بھاٹ پھانڈ کے لوہے کے  
 کھڑے کو دیکھنے۔ اسوقت اسکی صورت نہایت خوفناک اور بھیاٹک تھی۔ کان کھڑے کیو ہوئے۔  
 نتھنے پھٹکے ہوئے خونخوار دیرے نکالے ہوئے یہ معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی دیو جو کہ غیظ و غضب کی  
 مجسم صورت بن گیا ہو۔ اس کے ہنسنے کی ہمت ناگ آواز سے ہمارا گھوڑا اسطرح کانپ رہا تھا جیسے جارا چڑا ہوا  
 آدم خوار یا کھڑے کے اندر دیکھ دیکھ کے چاروں طرف کاوے لگتا تھا اور بڑھایا ہوا تھا کہ سید طرح اندر بڑھ  
 اور ہم لوگوں کو شکار کرے مگر کیسے طر راستہ نہ ملتا تھا۔ آخر مجبور ہو کے ایک مرتبہ گھوم پڑا نعل بند سے ہوئے  
 سموں سے کھڑے کی سلاخوں کو کھڑکھڑایا پھر رلٹھا کے دم سیدھی اور کان کھڑے کے ایک باریک عراب  
 پر جو کھڑے میں تھی کھڑا ہو گیا۔ اسی جگہ پر چند سپاہیوں نے جو گھات میں لگے ہوئے تھے موقع پانے نہایت چالاک  
 سے اسکی اٹھی ہونی گردن میں پھندا ڈال کے کھینچا۔ اور جب وہ نیں پر گر پڑا تو سیوں میں جگڑنے کے نشان  
 اس کے صطبل میں لینگے۔ ناظرین پوچھیں گے کہ اس عورت فوجواں اور بچے کا کیا حشر ہوا؟ یہ کو صبح معلوم نہیں  
 لیکن یقیناً ہی ہوا کہ اگر کالے جاب و انتخاب لاشوں کو اٹھائے گئے اور زیر زمین دفن کر آئے ہونگے اور ہونا کیا تھا  
 اسی روز ڈنر کے وقت میں نے جرات کر کے یہ سارا ماجرا بادشاہ سلامت سے عرض کیا۔ بادشاہ  
 سلامت نے فرمایا ”ہاں بھئی۔ ہاں ہنسنے بھی اکثر اس آدم خوار گھوڑے کا تذکرہ مٹا ہی۔ کیوں جی یہ تو  
 بڑا خونخوار ہی“ میں نے عرض کیا کہ سزا و مذلت بشیر سے بھی زیادہ“ بادشاہ نے فرمایا۔ بشیر سے  
 بھی زیادہ؟ اچھا تو لاؤ بشیر سے لڑائیں۔ دیکھیں یہ ہمارے ہو یا سے کیونکر مقابل کرتا ہو اور کون  
 جیتتا ہو؟ بھوریا نام ایک شیر تھا جسے بادشاہ بہت عزیز رکھتے تھے۔ چونکہ یہ شیر دامن کوہ ہالیہ کے  
 ایک موضع بھوریا سے بکڑا یا تھا اسلئے اسکا بھی نام بھوریا ہو گیا تھا۔ بادشاہ اسکو کسی شیر یا بھی  
 سے کبھی نہیں لڑاتے تھے اور جب لڑاتے تھے تو ایسے جانوروں سے جنہر وہ باسانی نفع پاسکے۔  
 دوسرے دن صبح کے ناشتہ کے بعد ہلوگ چاند گنج پہونچے۔ اور وہاں ایک صحن کے گرد کے  
 مکانات میں ٹھہرے یہ صحن قریب ساٹھ فٹ مربع تھا جسکے گرد چاروں طرف دو منتر مکانات بنی ہوئے تھے

جسمین اوپر کی منزل میں برآمدے تھے اور بچے کے درجے میں غلام گردش و غلام گردش کے سامنے موٹے  
میلے بانسوں کے ٹکڑے ٹھہرے ایک احاطہ کھینچ دیا گیا تھا جسکی وجہ سے عمن کی قطع ایک بڑے پتھر سے  
کی ایسی ہو گئی تھی۔ آدم خوار کھڑے کو ایک چھوٹی ٹٹوانی دکھا کے احاطے میں داخل کر دیا۔

حسب معمول بادشاہ سلامت اوپر کی منزل میں سربراہ ہوئے اور خواہموں نے دستور کے  
مطابق گیس رانی شروع کر دی۔ ہلوگ بھی چپ و راست برآمدہ پر چھکے ہوئے کھڑے ہو گئے۔ اس  
مقام سے ہر شخص اس احاطے کے سیر تفریح کر سکتا تھا۔ اور مستعدیات کو اس تماشے میں بہت دلچسپی تھی  
آخر کو بادشاہ سلامت نے غم دیا اور بچہ کو کھڑا لاکے غلام گردش میں رکھا گیا۔ بانسوں کے ٹکڑے  
کا دروازہ جو اس غرض سے بنا رکھا گیا تھا کھولا گیا اور کھڑے کی کھڑکی بھی کھولی گئی اور زمین  
سے بھو ریا میدان میں اپنی دم چار طرف ہلاتا ہوا اور آدم خوار اور اسکی ہدم ٹٹوانی کو غیظ و غضب  
سے گھورتا ہوا آگودا۔ تمام ہندوستان میں جو ایسے زیادہ خوبصورت اور حسین شیر نظر آتا دشتوار سپہ  
اسکی جگہ ارحال حسیہ قیس و دھاریاں نبی تعین احاطے میں چھوٹی ٹٹوانی کی رنگت کے مقابلے  
میں بہت نظر فریب معلوم ہوتی تھی بلکہ آدم خوار کی بکنی جانی کمال کے مقابلے میں بھی بھو ریا کی رنگت  
کی پناہ بہت کھل رہی تھی

ایک دن پیشتر شیر بن کا پاسا رکھا گیا تھا۔ اور کھانا پانی اسلئے نہیں دیا گیا تھا کہ بھوک کے تاثر  
وہ حریف سے درمیدان ہوئے مقابلہ کر سکے۔ کھڑے سے چلتے ہی آہستہ گھوڑوں کی طرف غور سے دیکھا  
اور آہستہ آہستہ سیم پاؤں اٹکی طرف چلا۔ آدم خوار نے بھی اپنی آنکھیں اسی کی آنکھوں سے ملائے رکھیں اور  
ایک لمحہ یعنی نظر اوجھڑے نہ پھری۔ وہ بالیناں تمام اپنا سر جھکائے۔ ایک قدم آگے بڑھائے کھڑا تھا  
اور حقوڑا بہت آگے بھی بڑھ رہا تھا اور گویا جملے کا منتظر ہی تھا۔ لیکن کھڑے ہوئے اور چلنے والوں  
حالتوں میں اسکی نظر اوجھڑے ہی رہی۔ بیجاری ٹٹوانی کا یہ حال تھا کہ اسے خوف کے زندگی سے باہر  
نظر نہ کھڑے رہی تھی اور ایک گوشہ میں تنہا کی منظر کھڑی تھی۔ ایک لمبی سی زخم مار کے بھو ریا ٹٹوانی  
کو چھاپ بیٹھا۔ بیجاری ٹٹوانی ایک ہی طانچے کی ضرب سے پشت بزم رسید ہو گئی اور اسکی گردن زین  
بھو ریا کے دانت پرست ہو گئے۔ اور اب وہ لگا خون چوسنے۔

بادشاہ نے باقاعدہ مل کے یہ انگریزی میں فرمایا کہ ”دیکھنا۔ اب بھو ریا اور بھی جلا دہو جائے گا۔  
خون منہ میں لگ گیا ہونا یورپ میں مصدا میں نے ان میں ہاں ملائی۔ اور خواہموں نے اگرچہ زبان نہیں  
تھی مگر بادشاہ کو خوش دیکھنے لگیں۔ تماشے سے نظر ہیر کے آپس میں جھٹکیں کیں اور گوشت پختہ

کے اشارہ کے ایک نے دوسرے کی تائید کی۔

چار پانچ منٹ تک تو بھوریا ٹھٹھانی کا خون چوستا رہا۔ لیکن اس حال میں بھی اسکی ٹھٹھانی آدم خوار ہی کی جانب مگی تھی اور بجائے خود آدم خوار بھی اطمینان سے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ اُسکے تہہ درشت پریشانی یا بدحوالی کہیں نام کو ظاہر نہ ہوتی تھی۔ ایک آدم مرتبہ ہنسنے کی آواز یا کنوٹھوٹکا چڑھا ہونا دم کا کھڑا ہونا یا حریف کو فوں نشان کا ہوں سے دیکھنا یہی ثابت کر رہا تھا کہ وہ اطمینان کے ساتھ سچے کا منتظر اور عاجز کی جبر کی دینے پر مستعد ہو آخرا کہ بھوریا خون پینے سے موہ گیا اور ٹھٹھانی کا سارا خون اُسکے پیٹ میں چومچ گیا۔ اب وہ اپنے پیچھے لاش پر سے اٹھنے کے اور ایک ادھر بار بھریری لیکے بدن چلتے ہوئے احاطے کا اسطرح چکر کاٹنے لگا جیسے چوبے کی تار میں ملی آہستہ آہستہ چلتی ہو۔ اُسکے بڑے بڑے پیچیزم زمین پر اسطرح آہستہ آہستہ سنبل سنبل کے پڑتے تھے کہ ذرا چاپ سنانی نہیں دیتی تھی۔ آہستگی سے قدم اٹھاتا تھا اور آہستگی سے زمین پر پڑتا تھا۔ لابی پیچھے نہایت سہولیت سے بھی آگے بڑھتی تھی اور آگے کے بازوؤں کے اوپر بھرائی تھی۔ کبھی پچھلے پاؤں کی طرف سمٹ جاتی تھی۔ ازجملہ ڈھالی کھالی اور اُدھر اُدھر اسطرح ٹھٹھاتی تھی گو یا بدن کے اوپر کوئی جھول ڈال دی گئی ہو جسے ہڈی چڑے سے کچھ اتصال ہی نہیں عجیب سماں تھا جو عمر بھر یاد رہیگا۔ بادشاہ اور انکی خوامیں تو اس تماشے میں زیادہ مصروف نہ تھے مگر یوں بن مصاحبت کا یہ حال تھا کہ ٹھٹھانی کی ہوتی تھی جنبش پر نگاہ ڈالنے اور ہر صدا پر کان لگائے تھے۔ شیر کے چلنے پھرنے کو دیکھنے اُسکے قدم بقدم آدم خوار بھی من کے وسط میں کچھ پکڑ کاٹنے لگا۔ اسکی تیور ویسے ہی تھی۔ سرگردن کان اور دم سب اُسی طرح تھے۔ اور شیر اگرچہ اس قدر قوت و قدرت رکھتا تھا مگر ابھی تک ملی کی سی چال چل رہا تھا۔ اُسوقت ایسا سناٹا چھایا ہوا تھا کہ سوا آدم خوار کی ٹاپوں کی آواز کے اور کسی طرف سے کوئی صدا سنانی نہ دیتی تھی۔ ہر طرف لوگ دم بخود اور منتظر کھڑے تھے۔ کوئی سانس تک نہ لیتا تھا۔

دفنہ بجلی کی طرح شیر اپنے حریف پر آ پڑا جسکے واسطے آدم خوار بھی طیار کھڑا تھا۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ بھوریانے یہ تاک لگائی تھی کہ وہ اپنے حریف کے سر یا گردن پر قبضہ کرے مگر آدم خوار نے اُسکو ایسا موقع ہی نہ دیا۔ اُسنے بڑی جیتی اور چالاکی سے اپنا بدن جھالیا اور ایسی ترکیب کی کہ شیر اُسکے پچھلے پاؤں پر آ پڑا۔ اور اُسکے پیچھے پھاڑی کے پھجوں میں گھس گئے۔ شیر نے ہر چند کوشش کی کہ اپنی پچھلے پھجوں سے آدم خوار کے اگلے پاؤں دبا کے اور چھاپ پیچھے مگر آدم خوار نے پیچھے سے اپنی ٹانگوں کو اٹھا کر اس زور سے دو لٹی بھاڑی کہ دم کے ہم میں شیر ماروں شانے چت نہیں ہر اگر۔

اور اگر تو ایسی خرابی سے کہ آدھا جسم بانٹوں کے ٹھاٹھ پر تھا اور آدھا زمین پر۔ گردہ۔ راجہ سلیملا اور بہت تیزی و تندہی سے دانت پستیا ہوا جبے پاؤں چلا۔ اور اس طرح مستعد جنگ ہو گیا۔ جیسے کچھ نہ ہوئی نہ تھا۔ آدم خوار بھی مثل سابق اپنی جگہ پر کھڑا رہا اور کسی قدر تحارت آمیز آواز سے ہنہانا مارا۔ البتہ اب اس کے پچھلے چٹوں پر شیر کی خراش تھی اور خون جاری تھا۔

بادشاہ سلامت نے ایک پور میں مصاحب سے جو ان کے قریب ہی تھا فرمایا کہ: "بھوریا اب بھی اپنے حریف کی جان لگاؤ اس مصاحب نے عرض کیا بد معنور۔ بیشک؟

بھوریا اب پھر بلی کی چال چلنے لگا۔ اس کا منہ حریف کی جانب تھا۔ قدم آہستہ آہستہ اٹھنے اور آہستہ سے زمین پر پڑتے تھے اور کھال اس طرح بدن پر جمول رہی تھی۔ آدم خوار بھی تھکے چھلائے۔ کان اٹھائے۔ نگاہ دشمن کی اداؤں پر جمائے۔ گردن ہموار کی۔ کنوٹیاں چڑھائے۔ مثل سابق اپنے اگلے دھڑ کو سیٹھے اور ایک قدم زرا آگے بڑھائے کھڑا تھا اور منتظر تھا کہ حریف کب حملہ کرتا ہو۔ اٹھ دھڑل منٹ تک بھوریا برابر جگر لگاتا رہا۔ اور آدم خوار اس کے سب کرشمے دیکھ لیا مگر اپنی جگہ سے نہ ہلا۔ البتہ کبھی کبھی غصے میں ہنسا لیتا تھا۔ بھوریا نے دو ایک بار اپنی جڑ سے کھول کے ادھر ادھر نظر میں جو خون بھرا تھا اسے زبان سے چاٹ لیا۔ پھر ٹوٹانی کی لاش کے پاس گیا اس خیال سے کہ شاید ابھی کچھ خون اس کے جسم میں باقی ہو۔ پھر ادھر سے مڑا اور چکر کاٹنے لگا۔ آخر کار۔ جلے کا وقت آگیا اور ٹوٹانی کی لاش کے پاس ہی سے اس تیزی و سرعت کے ساتھ چلا کہ ہم سارے تماشائی دفعتہ بھمک گئے بلکہ بعض ملازمان شاہی کے منہ سے چیخ کی آواز نکل گئی۔ لیکن بھوریا نہ غریبانہ ڈھکا۔ بلکہ یہ معلوم ہوا کہ جیسے کسی ہرتی قوت نے اسے دفعتہ ہوا میں اٹھال دیا۔ آدم خوار کو اس کی اس فوری جست سے کچھ بھی انتشار نہیں ہوا۔ اس نے ابکی بار اپنا سر پہلے سے بھی زیادہ نیچا کر لیا اور یہ معلوم ہوا کہ اس کا کچھلا دھڑ خود بخود حریف کے بدن کے نیچے سا گیا۔ پھر بھوریا کے پیچے آدم خوار کے پچھلے چٹوں میں گر گئے۔ بلکہ اس ترسہ شیر کا سر گھوڑے کی دم سے بھی آگے نکلا گیا اور اس کے پچھلے پیچے آدم خوار کے چٹے میں ڈل گئے۔ تھوڑی دیر تو اس کی ہی کوشش رہی کہ اپنا بدن سنبھالے اور اپنے شکار کو چاروں پنجوں سے قابو میں کرے کیونکہ برابر وہ اپنے پیٹ سے آدم خوار کی پیٹھ پر زور لگا رہا تھا۔ لیکن پھر اس سفاک آدم خوار نے اپنی پچھلی دولتی جھاڑی اور جڑ سے زناٹے سے جھاڑی جیٹی کہ اس کے نعل بندے سم ٹپے زور سے بھوریا کے جڑوں کے اوپر سے اور دفعتہ وہ چاروں شانہ چت زمین پر دراز ہو گیا۔

بعد چندے وہ اس طرح پر بانٹوں کے ٹھاٹھ کے برابر برابر دوڑنے لگا جس سے ظاہر ہوا کہ

اب وہ حکمران نہیں جانتا بلکہ جگانا چاہتا ہو۔ اُسکے جڑے کی بڑی بالکل ٹوٹ گئی تھی۔ اسوجھ سے وہ دم دباے بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ اور در دکی وجہ سے بیتاب ہو رہا تھا۔ آدم خوار سے قتل سابق بنور ویکھ رہا تھا جس سے پایا جاتا تھا کہ اچھی اسکا دھلے کا خوف ہو۔ لیکس بیچارے بھور یا میں اب سکت نہ رہی تھی اور اب وہ اسی نکریں تھا کہ کس طرح جان بچا کے بھاگ سکتے۔ اسی عرصے میں نیچے کی منزل میں جو لوگ تماشائی تھے انہیں سے کتنی شخص نے کہا کہ ”معلوم ہوتا ہو کہ بھور یا کا جڑا ٹوٹ گیا ہے۔“ یہ آواز اوپر پہنچی اور خود بادشاہ نے سنی اور ہم لوگوں کی جانب مخاطب ہو کر اُنھوں نے فرمایا کہ ”کیا بھور یا کا جڑا ٹوٹ گیا؟ تو اُسے میدان سے بٹا ہی لینا چاہیے نا۔ ہم لوگوں نے جو اہم غرض کیا کہ خداوند نعمت جیسا ارشاد ہو چنانچہ اشارہ کر دیا گیا اور کھڑا لاکے کھول دیا گیا۔ اور بادلوں کا ٹھاٹھ بھی بٹا دیا گیا۔ یہ دیکھ کر بھور یا فوراً اپنے کمرے میں گھسا اور اُسکے ایک کونے میں دب کر رہا۔

بھور یا نے میدان خالی کر دیا تو آدم خوار اپنی ظفر بانی پر ہنسنے اور ٹاپیں مارنے لگا پہلے وہ ٹوٹا کی لاش کی طرف متوجہ ہوا۔ اُسے سو گھا۔ اور اپنے بالوں سے اٹھلکے اُسے پھینک دیا۔ اور پھر ٹھاٹھ کے اوپر اُدھر گشت کرنے لگا۔ اس خواہش سے کہ کسی نوکر چاکر پر حملہ کرے اس وقت اُسکا خون نہایت جوش میں تھا اور انسان یا شیر جو اُسکے سامنے آ جاتا ضرور وہ اُسپر حملہ کر بیٹھتا۔ اُسکے اس بیچ و تاب کھانی کی ہیئت کو دیکھ کر بادشاہ سلامت نے کسی ہندوستانی ملازم سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ ”اُسکے مقابلے کے واسطے اور شیر منگا نا چاہیے۔“ اور پھر انگریزی میں ہم لوگوں سے یوں مخاطب ہو کر ”خدا اس سے بچھے۔ مجھے اس سے بھور یا کی چوٹ کا بدلہ لینا پڑا اہم لوگوں نے مسکرا کے دست بستہ عرض کیا کہ ”واقعی حضور بہت صحیح ارشاد فرماتے ہیں۔“ اور سر تسلیم خم کر کے دوسرے ٹھانڈے کا انتظار کرنے لگے۔ بادشاہ نے فرمایا کہ ”آدم خوار نے بڑے زور سے دولہی رسید کی ہو۔“ اُس کے جواب میں ہم میں سے ایک صاحب بول اُٹھے کہ ”حضور ایسی ویسی دولہی نہیں تھی۔ میں نے خود بھور یا کے جڑے کی ہڈی پر اسکی ضرب سنی ہو۔“ اتنے میں شیر و کاحفاظ و گھبان اُگیا اور اُس نے عرض کرنا بھیجا کہ اگر حکم ہو تو حاضر خدمت ہوں۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ ”اچھا آنے دو۔“ اچھا حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ خداوند نعمت ابھی صرف دو گھنٹے گزرے ہیں کہ سب شیر و کاحفاظ کھلا یا گیا ہو۔ لیکن اُنہیں سے جو سب اچھا ہو وہ تھوڑی دیر میں حضور کے سامنے حاضر کیا جائیگا۔ بادشاہ نے ہم پر ہم ہو کے فرمایا ”کیوں بے باقی۔ دو گھنٹہ پیشین گوئی واجب کھلا دیا گیا۔ بیچارہ محافظ سہم گیا۔ قریح کا پنے لگا اور تسلیں کر کے عرض کرنے لگا کہ خداوند نعمت اُنکے راج کھلا دیکھا ہو ہی وقت معمول تھا۔“



بادشاہ نے ٹھٹھ میں فرمایا کہ ”اچھا اگر اس شیر نے آدم خوار پر حملہ نہ کیا تو تجھی کو آدم خوار کے مقابلے میں جانا ہوگا۔“ تھوڑی دیر بعد برآمدے کے نیچے ایک کتھر لایا گیا۔ لوگ غور سے شیر کو دیکھنے لگے لیکن سچا پر اسے محافظ کی جان ہی نکلی جاتی تھی کہ جو بات بادشاہ سلامت کی زبان سے نکلی ہو وہ ہو کر سچا ہو رہا ہے۔ کتھر کے ٹکڑے کھانے کے بعد ہی بادشاہ نے شراب لایا کھا حکم دیدیا تھا چنانچہ شراب اٹھائی اور دو درجنے لگا۔ چونکہ شراب بہت میں ملا کہ سر کیگی تھی لہذا اُسکے پینے سے دلکھ بہت سرور ہوا۔ گرمی دور ہوئی۔ انتشار حواس کا فورہ ہوا۔

اس مقام پر گرمی بہت تھی اور ہم پوریں لوگ تو قیاب ہو رہے تھے۔ بادشاہ سلامت اپنے منے میں تھے۔ اُنکی خواہشیں مور کے پردوں کے بجاری بجاری موبجیل پے ہوئے گرمی کو پاس نہیں آنے دیتی تھیں۔ سچ تو یہ کہ چونکہ بکس ساں تھا کہ یہ پیکچرہ خورتیں جنکی کھائیوں میں مرصع کنگن اور کڑے اور بازو پر نوڑتیں اور بھوج بند ہر جنبش میں نئی آواز کھا رہی تھی اپنے شلے تک بہ ہند خوبصورت ہاتھوں میں موبجیل اونٹنکھیاں پے ہوئے نہایت نزاکت کے ساتھ بادشاہ سلامت کی گس رانی کر رہی تھیں اور چہرہ مبارک پاس احتیاط کے ساتھ سرد ہوا پہنچاتی تھیں کہ کسی چیز کی آواز نہ ہو اور بادشاہ کی نظر حجاب میں نہ پڑے۔

القصہ شیر کا کتھر آیا اور ٹھاٹھ کے دروازے سے ملا کہ کتھر کی کھولی گئی اور شیر نہایت آہستگی کے ساتھ نکلا۔ پہلے اُسے احاطے کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پھر تھوڑی دیر گزشتے وہ کتھر کے دروازے کے باہر کھڑا رہا اور آگے بڑھنے میں پس دیش کرنے لگا۔ ایک نیزے کی نوک چھائی گئی اور آگے بڑھنے کا اشارہ کیا گیا۔ اب وہ احاطے میں پہنچ گیا اور درگد گھومنے لگا۔ اب کتھر کے دروازہ بند ہو گیا اور ٹھاٹھ پر ستورہ جامد پے گئے۔ شیر نے اطمینان کے ساتھ اپنے حریف پر نظر ڈالی۔ تھوڑی دیر تک دیکھتا رہا۔ پھر ٹوٹائی کی لاش کی طرف بڑھا اور اسکی گردن میں منہ لگا کے دو ایک قطرہ خون سے حرص بھجائی۔ پھر نظر اٹھائی اور آدم خوار کو بخوبی دیکھا۔ وہ اپنی حفاظت پر مستعد کھڑا تھا۔

یہ شیر جھوڑے قد میں طویل تھا مگر اسکے جسم پر ایسی خوشنما دھاریاں تھیں اور نہ ویسی سبک خرامی اور نازک اندامی اسکے جسم میں آئی تھی۔ یہ شیر اپنے جسم کی فرہی اور تومندی سے بالکل برتر تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ مگر ہر کتھر سے اسوقت وہ مجبوراً کھیلے خوبصورت اور کھیلے۔ پھر تیسرا نہ معلوم ہوا۔ بہر حال اب اسوقت احاطے میں پہنچے پہلی جیت اُسے اسہان پر تھی کہ کتھر سے کھانے کی حرص کیا ہو اور کیا کام لینا منظور ہو۔ کیونکہ وہ ٹوٹائی کی لاش پر چھٹا اور اپنے مشتبہ دوست

آدم خوار کی طرف ایک ہوشیار سپاہی کی طرح دیکھتا رہا۔ پھر ٹری تیزی و تندہی کے ساتھ اپنے جبروں۔  
یہ جبروں اور پورے بدن کی طاقت سے اس جسم بھاری کی چیرھاٹ کرنے لگا کہ اگر آدم خوار اپنی حالت پر  
ذرا بھی غور کرتا تو بہت کچھ سمجھ جاتا۔

یہ دیکھ کر بادشاہ نے غصہ ہو کر فرمایا کہ مٹو اتنی کی لاش کو وہاں سے ہٹا دو۔ یہ کیا طاقت  
تم لوگوں نے کی کہ اسے اتنا دباں پڑا رہنے دیا؟ یہ تمہیں حکم شاہی دو ایک دہکتی ہوئی لوسے کی  
سلاخوں سے لوگوں نے شیر کو لاش کی طرف سے ہٹایا اور لاش کی گردن میں پھنسا ڈال کے فوراً اُٹھ  
ٹھا ٹھکے باہر کھینچ لیا۔ اس حرکت سے شیر کیس قدر جھنجھلا یا اور صحن ہی میں لیٹ کے اپنے ہونٹ چاٹنے  
اور براہ راست والے آدمیوں کو دیکھ کے غرائے لگا۔ اسکی نگاہ کبھی آدمیوں پر پڑتی تھی۔ کبھی آدم خوار پر جو  
جسے کے انتظار میں کھڑا ہوا سب رنگ دیکھ رہا تھا۔ جب شیر اس طرح لیٹا ہوا تھا اس کے قریب کوں  
جاسکتا اور رٹنے پر ابھار سکتا تھا۔ ناچار گرم گرم سلاخوں سے لوگوں نے اسے اٹھانا چاہا مگر سلاخیں  
ایسی چبھتی تھیں کہ شیر تنگ ہو بیچ نہ نکلتی تھیں۔ تب ایک بڑا انبانیزہ لاسے اس سے شیر کو گودا  
جسکی وجہ سے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور نیزے کو پاؤں کے اسی کے سہارے سے ٹٹا ٹھکڑیٹ جھپٹا اور ٹٹا ٹھکڑ  
زور سے ہلانے لگا۔ اگر ایسے وقت میں وہ ٹٹا ٹھکڑ سے باہر نکل پڑتا تو بڑی مصیبت کا سامنا ہو جاتا  
مگر لوگوں نے گرم سلاخوں سے اسے دوردفع کر دیا۔ غرض کہ جتنے رکوششیں لوگوں نے کیں  
سب رائیگاں گئیں اور شیر نے ایک بار بھی آدم خوار پر حملہ نہ کیا۔ گرم سلاخوں سے بدن بھی داغا اور  
جلایا۔ نیزے سے بھی مارے ہر طرح پر جھنجھلاہٹ بھی پیدا کی۔ غصہ بھی دلایا۔ مگر ہر مرتبہ اسکا غصہ ٹٹا ٹھکڑ  
کے بانسو پر اترتا تھا۔ یا آدمیوں پر کیونکہ ہر ایک کو شش کا یہی انجام ہوتا تھا کہ یا تو وہ ٹٹا ٹھکڑ پر زور  
آزمائی کرنے لگتا تھا یا آدمیوں کی طرف غم کے جھپٹتا تھا۔ مگر آدم خوار کی طرف وہ رخ ہی نہ کرتا تھا اور  
بجائے خود آدم خوار کو بھی شیر یا خود حملہ کر سکی کوئی تحریک نہ پیدا ہوتی تھی۔

جب اس مقصد میں ناکامی ہوئی تو مجھے خوف پیدا ہوا کہ کہیں بادشاہ سلامت اس پرچہ  
محافظ کو آدم خوار کے مقابلے کیلئے نہیں مکن بادشاہ اپنی دھمکی کو بھول گئے تھے اور انہوں نے پہلے کے  
فرمایا کہ ”داعمی۔ آدم خوار بڑا ایسا درویش شیر کو اس کے سامنے سے ہٹا لو۔ اور تین مارے بھیجے لاؤ۔“ کہیں  
آدم خوار نے کیونکر پہنچا ہو؟

ارے مجھ سے جو قوت قصہ پاک ہو جاتے ہیں اسوقت اتنے زیادہ خطرناک کوئی جانور نہیں ہوتا  
حالانکہ حیثیت ظاہری سے وہ بالکل برقع بعد لیل ہوتے ہیں۔ لیکن میں نے خود دیکھا ہے کہ اگر اس

عظیم الجثہ ہاتھی کو بھی وہ سینک مار مار کے بھگا دیتے ہیں۔  
گھٹا گھٹ کرے بانس کھسکے گئے۔ کٹھار کھا گیا اور شیر اُسیں اس تیزی و چالاکی سے داخل ہوا  
کہ جس تیزی و چالاکی سے نکلا بھی نہ تھا۔

اس درمیان میں پھر اے ارغوانی کا دو سبے تکلف چلنے لگا اور آخر کار تیس اسٹے بھینسے جن کی  
صورتیں نہایت بھدی بہ ہنم تھیں۔ ڈیل ڈول بہت سی جبریل ایک ایک کر کے احاطے میں داخل  
کیے گئے۔ ان بھینسوں نے عجیب بیہودگی کے ساتھ اپنا بھاری بھاری سر ذکو خواہ خواہ بالکے وسط احاطے  
کیطوڑ جھٹا شروع کر دیا۔ گھوڑے دیکھنے آدم خوار بھی ذرا چکر لایا اور آہستہ آہستہ پیچھے کھینکے لگا۔  
حالانکہ پہلے شیر سے لڑ چکنے کے بعد جب دوسرا شیر آیا تھا تو اس پر شائق آفریون یا گھبراہٹ کا نہوا تھا۔  
لیکن اب یہ ذرا وافی اور بھدلیل صورتیں۔ یہ چوڑی سپاٹ پیشانیوں۔ بے درختوں کے ٹہنوں کے  
ایسے سینک اور یہ پٹاٹیلے جسم دیکھ کر اس کے حواس جاتے رہے۔ اور اب اس کے قدم بھی گھبرا گھبرا کر  
پچھے چڑھ گئے۔ بار بار وہ ہنستا تھا لیکن اب کبھی ہنستا نہ تھا وہ تیزی و غیظ و غضب شکلا نہیں ہوتا تھا  
اب اسی ہزار اداسی اضطراب اور گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ اور یہ گھبراہٹ زیادہ تر اس وقت تھی کہ وہ بھینسوں  
کو دیکھ کر بالکل کبے تکان اور آہ بھر رہا تھا اور اس سے فدا نہیں کرتے۔ اور نہ اگر کچھ بھی اس کو کوئی  
بشرقتش بیش از حد کے ان کی حرکت سے ظاہر ہوجاتے تو وہ کمزوروں پر غصہ دکھانوالوں کی طرح نور  
انہر مٹا اور ہوتا تھا۔

یہ تینوں بھینسے ساتھ ہی ساتھ اپنی گردنیں خمی کیے کبھی ایک طرف جھکتے تھے کبھی دوسری طرف۔ کبھی  
زمین پر پھینکا مارتے تھے کبھی برآمدے پر جو آوی بیٹھے تھے انکو دیکھتے تھے کبھی غلام گردش کے ستونوں  
پر نگاہ جاتے تھے اور کبھی بلارا رہ آدم خوار پر نظر ڈالتے تھے لیکن یہ خیال اس کے دماغوں سے کوسوں دور  
تھا کہ انکو اس آدم خوار پر غلہ کرنا چاہیے۔ انکو اس طرح بوکھلایا ہوا اور بد حواس و کھلے آدم خوار سے نہ رہا گیا  
اور آخر کار اسے سبقت کی اور اس طرح چڑھاکہ کبھی تو نقصان کو پھلانگے پھلانگتا رہتا تھا کبھی زور سے ہنستا  
تھا اور کبھی زبان لال کے ساتھ ایک قدم آگے بڑھاتا تھا۔ یوں ہی رنتہ رنتہ کر کے وہ ان کے بالکل قریب آگیا۔ مگر  
با انہی بھینسوں نے اس کے ان حرکات پر کچھ توجہ نہ کی۔ اپنے اسی طرح آپس میں ملے جلے۔ سر و گلو جھنڈی تھی  
آگے بڑھتے رہے۔ اب تو آدم خوار نے اس قدر قریب ہو گیا کہ اس کا جسم ایک بھینسے کے جسم سے بالکل  
جڑ گیا۔ اور وہ ہنستا کہ اسی بو سے بھینسے لگا۔ اس نے بھینسے کی طرف گردن بھی بڑھائی مگر بھینسا خبر بھی  
نہ داخل مشور ہو کہ بہت محتاطی میں کپڑے بڑھاتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی اس سارے خلاص اور بیل

ملاپ کی کارروائی کئے آخر کار ایک اور نتیجہ پیدا کیا۔ جب آدم خوار خوب ہوسو گئے چکا اور بھینسوں کو دیکھ کر کچا کوزرا اچھڑک نہیں ہو تو بہت قریب آگے اطمینان کے ساتھ ایک بار کھڑا اور چالاکی سے ایک دو ہنسی جیسے زور سے اپنے پاس والے بھینسے کی رسید کی یہ حال دیکھ کر ایسا اچانک حلاف امیر اور سخت تھا کہ جی بھینسا تھوڑی دیر کے لیے جکر اگیا۔ اور اُس کے سامنے کچھ اس طرح سر ملانے لگے گویا دودیت اور کہتے ہیں کہ ہاں۔ یہ ہوئی ہے

بھینسوں کی حالت دیکھ کر بادشاہ سلامت بیباختہ ہنس پڑے اور بولے کہ بھینسی۔ اب تو آدم خواہ جان بخشی کا ستم ہی ہو۔ اسے ہٹالینا چاہیئے۔ چنانچہ فوراً اس حکم کی تعمیل کی گئی۔ پھندے ڈال گئے آدم خوار کچرا اگیا۔ اور اطمینان میں ہو سچا دیا گیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ اُسکو ابقیہ عمر نہایت امن میں سے بسر کرنا پڑی بادشاہ نے اسی وقت فرما دیا تھا کہ میں اس کے واسطے ایک آہنی کھڑا بنوا دوں گا۔ اور اُسکی پرورش کا بھی سامان کر دوں گا۔ آبا جانی کے سر کی قسم یہ جڑا بنا دوں گا۔ غرض کہ اُس کے واسطے ایک اتنا بڑا لوہے کا کھڑا بنوا دیا گیا کہ جلدن کے معمولی دھکے کے کمرے سے دو چند تھا۔ اُس میں یہ آدم خوار اپنی فتنہ منی پر نازاں نماشاہیوں کا نظارہ گاہ تھا اور جب کوئی تماشائی اُسے دیکھنے جاتا تو وہ بھادوی سے اُنکی طرف یا کھڑکی کی سلاخوں پر چوہے کے اکثر وجہی ادا دکھا دیتا تھا جس سے بھینسے بہ نفع پانی کھتی۔ میرے زمانہ ماضی تک یہ آدم خوار گھنٹنیں موجود تھا۔

## باب ہشتم

”باتیں ہاتھی پائیاں۔ باتیں ہاتھی پاؤں“

دربار شاہی میں یوں تو بڑے بڑے مقتدر حکام تھے۔ عائد سلطنت تھے لیکن ان سب میں جس قدر بادشاہ کی نظر عنایت اپنی برائے نام جہل فوج۔ راجہ جتا اور سنگ پرتھی اتنی کسی پر نہ تھی۔ میں نے ”دربارے نام“ اسوجہ سے کہا ہے کہ درحقیقت وہ میری جو فوج تھی وہ کسی شاعر قطار میں نہ تھی کیسے ہی فوج البتہ کار آمد اور لیٹا کرنے والی تھی مگر وہ صاحب ریڈنٹ کے تحت اقتدار و انتظام بھی باقی بادشاہی فوج اتنی تھی کہ ہاتھی پائیاں بھی تھیں سوار بھی تھے۔ تو چنانچہ بھی تھا اور مجموعی تعداد بھی چالیس چالیس ہزار تھی۔ اس لیے بادشاہی فوج میں بعض کی دریاں اور ساڑھ سو ساڑھ سو سو سو کی ایسی بھینسیں اور بعض کی اسی طرح کی ایسی کیسی کی فوج کی تھی۔ اور اس فوج کا سپہ سالار تو نواب کا بیٹا تھا اور جہل راجہ جتا اور سنگ پرتھی ہلوگوں کے آپس کے جلسے بادشاہی دعوے تو میں جتا اور سنگ پرتھی کو ب ”جہل“ ”جہل“ دیکھ کر پرتے

تھے اور نام بہت کم لیتے تھے۔ ان تجلی کی صحبت میں بادشاہ سلامت اپنی ہمبستی دہلی کے شوق کو خوب پورا کرتے تھے اور چونکہ ان کے سامنے بختاور سنگھ اور خاصہ تراش (جو جیسے خود اس فن میں طاق تھے) برابر جوڑ لڑا کرتے تھے لہذا ہر وقت ہمبستی مذاق و دلگی اور چٹل میں گزار کر قیامی اور اس طرح بھگڑ بازی ہو کر قیامی کہ اگر کوئی ہمبستی آدمی دیکھتا تو ہرگز یہ نہ سمجھتا کہ یہ ایک خود مختار بادشاہ کی صحبت حباب ہو بلکہ یہی خیال کرتا کہ کچھ نو عمر طالب علم ایک جا ہو گئے ہیں جنکو ہنسنے ہنسانے کی واسطے مختصری دیر کے لئے دوسرے سے چٹلی ملگئی ہو۔ خود بادشاہ سلامت اکثر اس لوگوں کو ترفیف دیتے تھے کہ جب کھول کے ہر قسم کا مذاق آپس میں کریں۔ اس سب سے کوئی ایسی ہودگی نہ تھی جو آپس کی بے تکلفی میں اٹھ رہتی ہو۔ اگرچہ اس قسم کے مذاق اس سب سے شریک ہوتے تھے مگر ہندوستانی مصاحبوں میں راجہ بختاور سنگھ اور یورپین مصاحبوں میں خاصہ تراش سب سے پیش پیش رہتے تھے۔ اور زیادہ تر انھیں کے دم سے یہ تمسخر آباد رہتی تھیں۔ بائیںد بختاور سنگھ ناکا۔ ہٹھن بھی نہ تھا۔ اُسکو اپنے اعزاز و منصب کا بہت کچھ لحاظ رہتا تھا اور حتی المقدور اپنے کو بہت سے فیہ رہتا تھا۔ اور یہی وجہ تھی کہ اگرچہ وہ بادشاہ کی ہر ایک خیف الحو کا فی میں شریک حال رہتا تھا پھر بھی بادشاہ کی نگاہ میں بہت موزن تھا اور ایک طرف تو اپنی ذوقی باتوں حاضر جوابی اور لطیفہ سنجی سے مذاق میں سب سے سر رہتا تھا اور دوسری طرف اپنی خوش دماغی اور تجربہ کاری و معاملہ فہمی کے جوہروں سے ہندوستانیوں کے طبقہ میں بہت عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا اور ہر شخص یہی سمجھتا تھا کہ وہ ہر سچ سے شایاں افسری ہو۔

بختاور سنگھ کو اگرچہ لوگ جنرل کے لقب سے مخاطب کرتے تھے مگر فی نفسہ اسکو پولیس کا افسر اعلیٰ کہنا زیادہ موزوں تھا۔ کیونکہ اُسکے ماتحت جمیعت سے جو کامیلے جاتے تھے وہ دہلی تھے جو گلشن ہیں پولیس سے لیے جاتے ہیں۔ جمیعت اکثر عائد دربار کی اردلی میں تعینات رہتی تھی۔ اور کراشر بادشاہی سواروں کی شان و شکوہ اور گرد و فرط حالے کے لیے جلو میں چلتی تھی اور چونکہ اکثر عائد دربار کا سا جٹائس سے رہا کرتا تھا اور اسی کے ذریعے سے اُنکے کام بنا کرتے تھے لہذا وہ لوگ اُسکی بہت عزت و توقیر کرتے تھے۔ مزید ہاں چونکہ وہ ہندوؤں کے سردار قوم لینے راجپوت خاندان سے تھا دولت و ثروت رکھتا تھا۔ اور بادشاہ کا منظور نظر تھا لہذا ہر شخص اسکو نہایت مہمیز و ممتاز مقرب بارگاہ اور ذی اقتدار سمجھتا تھا اگرچہ وہ بے زبرد علم کو اُسکی ترقی نہایت گورنمنٹ تھا لیکن بختاور سنگھ کا اسوت تک اس سنگ کی پروانہ تھی جب تک وہ بادشاہ کا مقرب اور خاصہ تراش کا دوست تھا اس اندر وہی کیفیت قلبی کے ساتھ بھی جب کبھی راجہ اندلیاب ملے تھے تو پڑے تپاک سے ملتے تھے سلام کرتے تھے مساوات کے طور پر اظہار ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کی

شاہ میں چڑے بڑے احرار نامی اور قدرتی الفاظ جیسا کہ ہندوستان کے درباریوں کا خاصہ ہی انہیں پر لاتے تھے اور کسی برتاف سے اپنے بھون کی کیفیت ظاہر نہیں ہونے دیتے تھے۔ با اینہم سلوک و مدارات نواب بہر مسلمان تھے اور بڑی پھر ہندو۔

ایک بار حوالی لکھنؤ کی ایک کوٹھی میں ہم لوگ سیر و شکار کے تماشے میں مصروف تھے۔ جانوروں کی آویزش و بیکار۔ چیر بھاڑ۔ ایک کے مارنے اور پالی باہر بھاگنے۔ ایک کے جیتنے اور نظر پانی کے نشہ میں جھونے کی سیر دیکھتے دیکھتے جب طبیعت اگتا گئی تو سب لوگ رہنے کی ایک کوٹھی میں چلے گئے۔ گھر ذرا عکس مشائیں کچھ منتقل کریں۔ اور جی بھلائیں۔ یہاں بہو بچکے ہم لوگوں نے ایک ایک بسکٹ کھا کھا کے شراب پینا شروع کر دی۔ بادشاہ سلامت بھی اس وقت سرور میں تھے۔ زور سے قہقہہ مارتے تھے اور بے تکلفی سے پچھلیں ہو رہی تھیں۔ راجہ تیار سنگھ بھی بادشاہ کو عالم سرخوشی میں دیکھ کر کشادہ مزاجی سے سخاوت کر رہے تھے اور بادشاہ بھی براہرہنس رہے تھے۔ تھوڑی دیر ہی صحت سری۔ ابلہ بدخاصیت ہونے کا وقت آگیا کیونکہ شام کے ناشتے کا وقت آ رہا تھا۔ ملازموں اور سواروں کو جلوس کی پکار بھی۔ باڈی گارڈ کے کپتان نے حسب معمول سہکوی کیا اور آ کے اطلاع دی کہ جلوس سواری طیارہ جو۔ بادشاہ نیچے سے اُٹھے۔ اس وقت وہ اپنی معمولی مرغوب طبع انگریزی پوشاک پہنے تھے۔ سر پر انگریزی ٹوپی تھی۔ کہ ایک بار انھوں نے اپنا سیدھا ہاتھ ٹوپی میں ڈال کے اُسے بلند کیا اور پھر ہاتھ اونچا کر کے ٹوپی کو اپنی اٹھلی پر پچانے لگے۔ اس وقت تک سب باتیں بدستور تھیں۔ کوئی آثار طوفان قہر سلطانی نہ پاہونے کے پائے نہیں جاتے تھے کیونکہ سابق میں اکثر اسی عموں سے ہم لوگوں کو اس کوٹھی سے نکلنے کا اتفاق ہو چکا تھا۔ اور یہ تو بادشاہ کی ایک معمولی عادت تھی کہ جب خوشی میں ہو تھے تو اپنی انگریزی ٹوپی کو ہاتھ میں لیکے اسی طرح بھایا کرتے تھے۔ بھلوگ اب بادشاہ کے قریب ہی قریب جا رہے تھے۔ میں اور بختا ورسنگہ بالکل ساتھ تھے۔ اور سب لوگ بادشاہ کے پیچھے پیچھے بلا سمنا سنا لے چلے دروازے سے نکل رہے تھے کیونکہ یہ موقع بالکل بے تکلفی کا تھا اور بادشاہ کی خوشی ہی تھی کہ ایسے مواقع پر آگے پیچھے چلنے کا لحاظ نہ ہو کرے اور بے تکلفی کے اوقات میں حفظ مراتب نہ رکھا جائے۔ ٹوپی کو اٹھلی پر پچاتے پچاتے دھنستہ بادشاہ کا اٹھوٹا مسیبن گھس گیا۔ اور باہر نکل آیا۔ حالانکہ بادشاہ کے استعمال کیو اسٹے جو چیز آتی تھی اعلیٰ اور پیش قیمت آتی تھی مگر بات تو یہ تھی کہ یہ ٹوپی کچھ معمولی بازار میں ہوئی تھی یا یہ بات تھی کہ بادشاہ اکثر اس طرح ٹوپی سے شغل کرتے رہتے تھے۔ لہذا گرفتہ استعمال سے گھس گیا کے اُسے اوپری حصے میں سونچ ہو گیا تھا۔ بہر حال کچھ ایسا ہی نہ۔

پڑا کہ اٹکا اٹکو تھا ٹوپی کے پار ہو گیا۔ اس ادا پر بادشاہ کو ہنسی آگئی اور ہنستے ہوئے انھوں نے ہلائی طرف رخ کیا۔ جس سے غالباً اٹکا یہ پایا تھا کہ اٹکے خوش کرنے کو ہلوگ بھی ہنس پڑیں۔ ہلوگ تو ابوار ہی تھے۔ اٹکی مرضی پائے سب لوگ کھلکھلا کے ہنس پڑے۔ اس وقت بجا اور سنگھ نے ہنسی ہنسی میں جال کے کہا کہ مدح و ترانہ میں سوراخ ہو گیا۔ یہ فقرہ بے وقار شاہے سوچے کچھ ہنسی میں اٹکی زبان سے سے نکل گیا تھا۔ لیکن بد قسمتی سے بادشاہ کو بہت ناگوار لگا گیا۔ چونکہ بادشاہ کو تخت و تاج بہت مصیبت سے ملا تھا لہذا وہ اس باب میں بہت ہی ذکی الجس تھے۔ اور کوئی ایسی بات سُن ہی نہ سکتے تھے جس میں کوئی اشارہ کنایہ تخت و تاج کی جانب ہو۔

اس مقام پر مجھے بطور حوالہ مقصد یہ کہہ دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ رفیع الدین حیدر کو تلج سلطنت محض کہینی کی بدولت ملا تھا۔ کیونکہ اٹکے باب اور دیگر اہل خاندان کسی طرح روا دار نہ تھے کہ اٹکو تخت شاہی نصیب ہو۔ اُن سبکی صلح اور کوشش ہی تھی کہ اٹکے بھائی تخت نشین ہوں۔ اور اگر کہینی اور اُسے رزنیٹ کا قدم در میان میں نہ ہوتا تو رفیع الدین حیدر کو تلج شاہی کبھی نصیب نہ ہوتا۔ بہر تقدیر بات بگڑنے والی ہی تھی کہ بختیار سنگھ کے منہ سے یہ جملہ نکلا اور رفیع الدین حیدر کے دل پر زر سا لگ گیا۔ رو نہ اور کوئی موقع ہوتا یا کسی دوسرے عنوان سے یہی بات کہی جاتی تو بادشاہ خود اُس پر ہنس دیتے۔ خیال بھی نہ کرتے۔ لیکن یک طرفہ خدا ہائے کسی کج فہمی کی اتنی سی بات سننے ہی اٹکے چہرے کی رنگت متغیر ہو گئی اور ابھی دو گھنٹہ پیشتر جو سرد و انبساط تھا سب تشریف لے گیا۔ اُسے غصے کے منہ تھمانے لگا اور آنکھیں سرخ ہو گئیں میں چونکہ اٹکے قریب ہی تھا لہذا وہ میری طرف مخاطب ہوئے اور فرمائے گئے "تجئے اس کو نہ کہ۔ دنا باز کی باتیں نہیں؟" یہ فقرہ انھوں نے نہایت غیظ و غضب کی حالت میں اور نیلی سلی آنکھیں دکھائے فرمایا تھا۔ مجھ کو وہ جس طرح ہنسی میں آندھی تھے اسی طرح غصہ و رنج میں بھی۔ اور بچہ بادشاہ ہی تھے جنکی بابت حکمران کا عقولہ ہو کہ "مگر ہے بسلائے بر خند و گاہے بد شنائے خلعت و ہند"

میں نے عرض کیا کہ وہی حضور۔ میں اتنا ہی کہنے پایا تھا کہ بادشاہ نے ہاڈی گاڑ دے کہ پستان سے پکار کے فرمایا مہم مردود کو فوراً زیر حراست کر لو۔ اور پھر روش الدولہ وزیر اعظم سے ارشاد فرمایا کہ درویش۔ جاؤ۔ اور اسکا سر قلم کر ڈالو۔

یہ بڑا نازک وقت تھا۔ کیونکہ بادشاہ کو بدست منتارا ملازماں کہینی اپنی رعایا کی قتل و بربست کا اختیار کامل تھا اور اسیں دست اندازی کی مجال کیونکہ نہ تھی۔ اور اٹکی یہ طاقت تھی کہ اگر کوئی شخص اُس کا حقہ فرود کرنے کے لیے کچھ ماحلت کرتا تو اٹکو اور بھی غصہ بڑھ جاتا تھا۔

کپتان باڈی گا۔ پور و وزیر اعظم نورزبانہ ریگہ کے پاس آئے۔ وہ بیچارہ اس وقت نہ تھا کہ  
باتھ باڈیٹ۔ سکوت و خاموشی کے کہ کہ میں نہایت ترساں و لرزاں کھڑا تھا۔ یہ کہہ کر آئے کتب  
بھی دو ایک حرف نہ بولا۔ وزیر اعظم صاحب نے راگ چڑھایا اور بتا دیا کہ اس وقت وہ انداز  
رہیت تھے مگر اس وقت وہ اپنی خدمت مفروضہ سے کسی طرح کی کار نہیں کر رہے تھے۔ یہ کہہ کر  
کہا۔ جاننا کہ انھیں ارشاد نہیں ہوتا۔

جو لوگ ہندوستانی رہا۔ انھیں نہ کرتے تھے انھیں ایک ضدی و خرد مختار۔ جیسا کہ شاہ بادشاہ  
کے ہمہ گیر کسی درباری کے کہ موج و زوال کی کیفیت ہرگز عجیب نہیں معلوم ہوتی اور ان کی انھیں  
ایسے فوری الفاظ بات کے کہ کچھ نہ کہہ دیں ہر جاتے ہیں۔

نواب کے اس کہنے پر کپتان صاحب نے بہتر اور سنگ کا ہاتھ بڑھایا اور کہا کہ وہ سب تو سنگ کی برابری  
اور میری حراست میں ہیں اور یہ کہہ کر وہ اس کا ہاتھ لیکن چلتے چلاتے انھوں نے جو یو پیٹ کو دیکھا  
ایسی نظر سے دیکھا جسکے معنی تھے کہ حق المذہب۔ اس بیچارے کے حق میں معلوم سمی نہ پیش کرنا۔ اور  
مجھے جو ممکن ہوگا میں تو حاضر رہی کر دینگے۔

پھر آواز نکلتی تھی سے ہٹ چکا تو بادشاہ نے نہایت غصے میں آکر اپنی ٹوپی کو زمین پر پھینک دیا  
اور پاؤں سے روند ڈالا۔ ابھی اٹھا جوش فروزا تھا اور چہرہ کارنگ ہنر دگرگوں تھا۔ پھر نہایت شکستہ  
لگا ہوا سر پر حجاب مخاطب ہو کر فرمایا کہ کیوں جی یہ بناؤ۔ اگر کوئی شخص شاہ انگلستان سے ایسی گستاخی  
کرتا ہو تو وہ کیا کرتے ہیں یہ یہ کہہ کر پھر ایک بار اعلان نے اپنا پاؤں زمین پر دے مارا۔

میں نے عرض کیا کہ وہ اندامت ایسے ہی بادشاہ میں شاہ انگلستان مجرم کو اسی صورت سے  
گرفتار کر لیتے ہیں جیسے حضور نے کیا۔ اور پھر بعد تحقیقات جو فیصلہ اس کے حق میں مناسب معلوم ہوتا ہو وہی  
نفاذ کرتے ہیں۔ اس پر بادشاہ نے چلا کر فرمایا کہ میں بھی یہی کر دینگا۔ اب وہ سر قلم کر لیا اور اٹھ بھول گئے  
تھے جو جوش غضب میں بے اختیار منہ سے نکل گیا تھا اور یہ دوسرا حکم ذرا کسب قدر جوش فرو ہونے پر  
زبان سے نکلا تھا۔ یہ ارشاد فرما کر آہستہ آہستہ وہ دروازے کی جانب بڑے تو میں سلام کر کے اور  
یہ عرض کر کے آگے بڑھا کہ حضور کے ارشاد عالی و روشن الدوا کو اطلاع دیدوں۔

روشن الدولہ وغیرہ گھوڑوں پر سوار ہو کے چلے گئے تھے۔ اور اس قریب سے جا رہے تھے کہ آگے  
آگے کپتان باڈی گا۔ آگے پیچھے دوسو آدمی کی حفاظت میں راجہ بنجا اور شاہ اور ان کے پیچھے روشن  
الدولہ میں نے بلند آواز سے انکو شاہی حکم سنایا۔ اور مجھے خیال ہوتا ہو کہ اسے بے روشن الدولہ نے کہا کہ



مجھے بادشاہ سلامت کی ذات عالی سے رحم اور غفور تقصیر ہی کی امید تھی۔ مگر دل کا حال تو خدا ہی جانے کہ کیا گزری ہوگی مگر اتنا ضرور ہو کہ چونکہ بہت سے لوگ گرد و پیش تھے لہذا میرے اور لوگوں کے سناٹے کو اٹھانے کے لیے باؤز بند پر ہر محل جواب دیا تھا۔ یقیناً بنو ورسنگہ نے بھی میرا پیغام سنا ہوگا۔ کیونکہ میں نے اسی خیال سے اردو زبان میں پجارسے بادشاہ کا حکم سنایا تھا کہ وہ بھی سن سکھے لیکن اُس نے اتنا بھی نہ کیا کہ کچھ پیر کے میری جانب دیکھ ہی لیتا اور مجھے اتنا مطلع کرتا کہ میری بات اُسکے کان میں پڑ گئی۔ غالباً اُسے احتیاط کو دخل دیا ہو گا کیونکہ درباری لوگ ایسی احتیاطوں کے عادی ہوتے ہیں۔

جب بادشاہ سلامت باقی پرہیزگار ہوئے تو خاصہ تماشے سے مخاطب ہوئے۔ مگر بنو ورسنگہ کی موت آگئی ہو۔ اس زمین پر تو کوئی ایسی قوت نہیں جو اُسکی موت کو ٹال سکے۔ شام ہونے سے پہلے ہی پہلے اُسکا مرقن سے جدا ہوا کہ کسی جہاں تھی کہ اسوقت زبان بٹاتا اور کہتا کہ ایسا خود بہر یونین لوگ اتنا ضرور خیال کرتے تھے کہ اگر صاحب زرچٹ کو مداخلت کی ترغیب دیا جائے تو یقیناً بنو ورسنگہ کی جانب پر جو جانیگی۔ چاہے جاندا اور جیگا ضبط ہو جائے۔

رستے سے جہاں یہ واقعہ پیش آیا تھا دیاے گوشتی تک چند میل کا فاصلہ تھا۔ اور باقی گھوڑوں اور ہارس سب کے واسطے ایک جگہ سے جا کر ایک بڑی کشتی کی قطع کا تھا، ہر وقت طیار رہتا تھا، اسی پل کے ذریعے سے چند منٹ میں ہلوگ دیا اس بار اتر آئے اور ٹھوکی آباوی میں پھونکا۔

یہ جھوٹا کابل ہمیشہ صرف بادشاہ اور اُنکے ہمراہیان کے غبور کی غرض سے کبھی اس کنارے اور کبھی اُس کنارے رہتا تھا۔ اگرچہ وہ بہت چھوٹا اور کچھ پرناہ قطع تھا لیکن بادشاہ سلامت کے مخصوص تھا اس لیے لوگ اُسے بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اس پل کے علاوہ دیا براہ ایک پل کشتیوں کا اور اور بھی عام لوگوں کے واسطے بنا تھا۔ اگرچہ یہ بھی بہت کم قیمت اور ذہنیت تھا لیکن گڑبگاہ خاص نام ہونے کی وجہ سے بہت بکرا آمد اور باعث آرام تھا۔ دوپہر کے وقت ہمیشہ اُس بن کا دور میانی چند دو ایک گھنٹے کے واسطے کھول دیا جاتا تھا تاکہ مال کی نادیں اور کشتیاں نکل سکیں۔ باقی ہر وقت بندھا رہتا تھا۔

دروہت پر پہونچکے بادشاہ کا غیظ و غضب دھما ہوا گیا تھا۔ اس پر ہوا گئے تھے۔ اب ہم سب لوگ اس کے منتظر تھے کہ دریافت کریں مجھ اور سنگہ کے معاملہ میں جاپناہ کا کمون خاطر کیا ہو چنانچہ ایک صاحب نے رخصت ہوتے وقت معقول عنوان سے یہ تذکرہ پھر بھی دیا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ ”بھئیہ“ وہ قتل نہیں کیا جانیگا۔ بادشاہ کے اس یقین دلانے پر ہلوگوں نے بھی اپنی مورقوں سے اطمینان ظاہر کیا۔ اگرچہ دلی ہی دل میں یہ کھلکا لگا ہوا تھا کہ اب ہم رخصت ہوتے ہیں۔ اب بادشاہ ہوں گے اور

ہندوستانی ملازمین اور یہ لوگ ہرگز نہ جتا درنگ کے بارے میں کلمہ خیر منہ سے نہ نکالیں گے۔ بختا درنگ ایک دو تہند آدمی تھا اگر وہ قتل کیا جائیگا اور اسکے مال و متاع کی ضبطی کی جائیگی۔ تو نہ درہو کاس دولت میں سے ان لوگوں کو بھی بہت کچھ ہاتھ لگے گا۔ انہیں وجہ سے یہ ہمیشہ کا بندھا ہوا دستور تھا کہ جب کبھی کسی مالدار آدمی پر اس قسم کا عتاب ہوتا تھا تو یہ لوگ اسکے قتل اور ضبطی جائداد کا مشورہ ہمیشہ دیا کرتے تھے۔

ہم لوگوں نے صلاح کر کے کپتان صاحب کو منتخب کیا کہ وہ جا کے صاحب رزیدنٹ کو اس معاملے کی اطلاع کرائیں اور دیکھیں وہ کیا کہنے لیا کرتے ہیں۔ صاحب رزیدنٹ نے انہیں مایوس کر دیا۔ کیونکہ یہ ایک ہندوستانی ملازم کی مزدور سرکشی کا معاملہ تھا اور وہ ملازم کیسی طرح کہنی سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا لہذا اس کے نزدیک براہمت کی کوئی وقعت نہ تھی۔

دروہل سے چلے جملوگ پہلے بختا درنگ سے ملے گئے۔ وہ ایک نہایت جندل مکان میں ڈال دیا تھا یہ مکان تو سداغی کے بیڑی سلسلے میں تھا اور بیشتر اس میں ایک ادنی درجے کا خدمتکار رہتا تھا۔ اب اس پر ہندوستانی مسند پر رہ رہتے تھے اور اندر وہ شخص مجوس تھا جسے واسطے ایسے ذلیل مکان میں رہنا بھی باعث توہین و مذلت تھا کیونکہ وہ اپنی ذات کی حفاظت بھی ایسا اعلیٰ درجہ اپنی قوم میں رکھتا تھا کہ ایسے مکان میں اُسے رکھنا اس کی کافی سزا تھی۔ خیر جب جملوگ اس مکان میں پہونچے تو جہے اس پر نفییب معتبہ قمر سداغی کی حالت ایسی دیکھی کہ چہرہ بے اختیار رو دینے کو جی پاتا تھا۔

وہ اس مکان میں ایک معمولی چار پائی پٹ پٹا ہوا تھا۔ جو بانوں سے بنی ہوئی تھی اور چہرہ چٹائی یا بھونٹا رکھا باش کھڑی تھی۔ پس اس چار پائی کے سوا اور کوئی ساز و سامان اس مکان میں نہ تھا۔ ہننے دریافت کیا تو خادم ہو اکو اب نے کپتان سے بادشاہی حکم پہونچا یا اور کپتان نے حسب الحکم پرانہ مقام پہونچے مگر رسیدہ راجہ کی بددو باش کا کیا۔ مکان کی تو یہ مبتذل حالت تھی اب ذرا اکین کی حالت بھی سننا چاہیے۔

اس معتبہ سردار کی سامی پوشاک اُتر والی گئی تھی۔ اب نہ اس کے سر پر وہ زرتار اور مفرقہ پگڑی تھی نہ بگڑی بڑھ و دست پہنچ مرغ۔ نہ بدینہ زرافت کی قبا۔ نہ قبا پر کشمیری شال کا ٹپکا۔ پوشاک کے ساتھ ہتھیار بھی گئے تھے۔ اور اس کے پاس نہ تلوار تھی نہ پٹنجے کی جوڑی۔ وہ جسم جوہر بڑیا۔ زری ذر زلفت سب دقت آشتار رہتا تھا اب معمولی مزدوروں کی سی ایک غرق اس کی سر پوش تھی۔ اور

باقی سارا بدن منگا تھا جس پر چار پائی کے بانوں کے نشان اتنے بنے تھے کہ گھٹے ہوئے نظر آتے تھے۔ جس وقت ہلکے مکان میں داخل ہوئے اس وقت یہ تم رسیدہ اسی چار پائی پر جمینی سے کروٹیں مار رہا تھا۔

جب جہانگوں نے اس سے کچھ بات بات کی تو اس نے کہا کہ میں نے تو کوئی ایسی بری بات نہیں کہی تھی میرے منہ سے جو کچھ نکلا بھی تھا وہ بالکل سبکھے بوجھ کے تھا اس لئے میں ایسی باتیں زبان سے نکالتا تھا کہ جو میرے دل میں اور بادشاہ کو تو یہ بھی طرح معلوم ہے کہ جب ان کے والد اور دیگر اہل خاندان کے ساتھ ہوتا ہے تو مجھ سے محرم و مکر کرنے کے لیے کوششیں کر رہے ہیں ان سب باتوں میں اندر بھی اتنا دھماکا ہے جو میری زبان کو ضرور ہی جانگسٹ کی آواز کی صورت میں نکلتی ہے جو ناگوار تھا۔ کیونکہ دشمن اور دشمنی کے خلاف میں نہیں چاہتا کہ لوگ میرے خلاف کیا کہے تو میں نے یہ بھی جان لیا کہ اگر آپ بڑے صاحب سے نہیں کہیں گے تو وہ سب اہل خاندان کو بے وفائی سے سب سے لے کر میں میں رہے ہوں اس وقت یہ بڑے اہل تکلف و عصیت پر پشت کر سکتا ہوں میں موت کی سختی سے جھیل رہا ہوں لیکن میری بیویاں بچے و سب اہل اس آپ جو صاحب فراموش ہو کر تو کسی مصیبت کی برداشت نہ ہو گی جنہیں معلوم میرے دل میں میری بیویاں پر کیا حشر ہوا ہے میری بیویوں نے تو اپنے رشتہ داروں کے سوا کسی غیر شخص کا کبھی منہ بھی نہیں دیکھا ہو اور کچھ بھی بالکل نادان ہیں۔ دنیا کو جانتے کچھ نہیں کہ کیا بلایا ہو۔ صاحب آپ لوگ اپنی مہربانی سے مجھے وعدہ کیجئے کہ ان کے حق میں کلمہ خیر زبان سے نہ نکالے گا۔

یہ بیان ایسا پر تاثیر اور جگہ جگہ پر غراش تھا کہ ہلوگوں کے قلوب پر نہایت اثر ہوا اور ہمیں سے اکثر کی آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے۔ حالانکہ ہلوگوں اس خود مختار سلطنت اور اس کے دربار کے ظالمانہ ویرانہ تھا دیکھنے سننے کے عادی ہو گئے تھے اور صبح سے شام تک ایسی سفاکی کی باتیں اور غریبوں کی آہ و زاری سنتے تھے دل تپ رہا ہو چکے تھے لیکن پھر بھی اس تم رسیدہ شخص کی مصیبت اور اس کے شاعرانہ زبان کو شکر نہ بڑا کر سکتے۔ جہاں تک ہمارے اسکان میں تھا ہم نے دل نہ ہی اور دلجوئی کے کلمات کہے اور تسکین دی کہ ہم کسی کوشش میں دیکھ نہ کر سکتے ہماری ہمدردی سودہ بھی مطمئن ہوا اور اسے کہا کہ ۱۲ اور تو جو کچھ میرے پاس تھا سب تجھے عین لیا گیا ہے مگر ایک میٹل بھا جا رہی ہے چھپا رکھا ہے۔ یہ کہنے اس نے ایک انگوٹھی نکالی جسے نہایت قیمتی زمر و جواہر تھا اور جسے وہ ہمیشہ پہن رہا تھا۔ یہ انگوٹھی اس نے ہماری جماعت کے ایک صاحب کے حوالے کی اور کہا کہ اگر میرے اہل خاندان محتاج ہو جائیں۔ اور صرف منہ بلی جائے اور بلائیں جائے اور ان کی جائیں بیچ جائیں تو اس وقت ان کے کفاف کے واسطے آپ یہ انگوٹھی بیچ دیا کرو

صاحب آپ لوگ ان بیچاروں کے حق میں کوشش کر کے مظالم اور بے حرمتی سے انکو بچالیں گے۔ بڑے عورتیں اور یتیم بچے آپ لوگوں کے حق میں دعا کریں گے۔

ہر لوگ اس مکان میں دیر تک نہ ٹھہر سکے۔ اور چلتے چلتے پہنچے اسکو تشکیں دی کہ جسقدر کوشش ہم سے ممکن ہوگی ہم اسیں ہرگز پہلو تہی نہ کریں گے۔ لیکن اسکو اپنی جاں بخشی سے قطعاً یابوسی ہوگئی تھی کیونکہ اُس نے اپنے کانوں سے بادشاہ کو حکم نقل دینے سنا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ میرے قتل میں بیچارہ ہو رہی ہو وہ اسوجہ سے ہو کہ مارنے سے پہلے سخت ایذا میں اور تکلیفیں دے لینا مقصود ہو کیونکہ مجھ سے خود بار بار دیکھا تھا کہ ادنیٰ ادنیٰ تفسیر پر سخت مظالم کیے گئے تھے۔

موعودہ تحقیقات کا وقت شام کو قرار دے دیا گیا تھا۔ اور بہ تحقیقات جلاوٹ حسب معمول بادشاہ کے جلسے کی میز پر حاضر ہوا ہے تھے۔ اس دربار میں جسقدر وقت باقی رہا تھا وہ ہم لوگوں نے اپنے اپنے کھڑوں پر گزارا۔ جو میں سے ہر شخص کے دل میں یہی حسرتناک سہاں اور رگڑنا تھا کہ یہ سب واقعات جو صبح سے شام تک پیش آئے تھے انھیں ہر شخص غور و غوض کرتا رہا۔

جب شام کو ہلوگ کھانا کھانے سے قبل ایک نفل کے کمرے میں جمع ہوئے اسوقت پتھان صاحب نے رزیڈنٹ کی گفتگو کا تذکرہ کر کے کہا کہ وہ خدا ہی کو معلوم ہو کہ کیا انجام ہونا ہو میں تو خدا سے چاہتا تھا کہ میں اس خدمت پر نہ ہوتا۔ کوئی اور کام میرے سپرد ہو جاتا تو کچھ اور بھی سنا۔ بیچارے بھٹاؤ کا بہار و خیف باپ محمد اس کے عیال و اطفال گرفتار ہوا ہے ہیں اور اسی طرح ذات سے قید خانے میں جمع ہوں کر دیے گئے ہیں۔

اسی عرصے میں ایک چوہانے آکر ہلوگوں سے کہا کہ ندادہ گینٹھ کے بعد جا پناہ آپ لوگوں کو یاد فرمائیں گے۔ تب ہلوگوں نے یہی صلاح ٹھہرائی کہ چلو سب ملکر اس غریب خاندان کو مجموعی حیثیت سے دیکھ آئیں۔ اور کچھ تشکیں و تسلی ممکن ہو وے آئیں۔ کیونکہ یقین تو ہے کہ صاحب رزیڈنٹ ان لوگوں کو بچالیں گے۔ یہ حرکت بہا۔ جی صرف رحم اور ہمدردی پر مبنی تھی اور ہرگز کچھ بھی تشدد دیکھنا منظور نہ تھا۔ چنانچہ ہلوگ معین میں گئے جہاں یہ سب تباہی زدہ لوگ قہد کیے گئے تھے۔

اگرچہ میں نے اپنے وسیع تجربے میں بہت سے جگر خراش اور درد انگیز حالات و معاملات دیکھے ہیں۔ بہتیرے گرفتارانِ رنج و محن کی داستانیں سنی ہیں لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ میرے دل پر حبسا اثر ان عورتوں اور بچوں کے دکھ درد کو دیکھنے ہوا ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ بچاؤ سنگھ کی طرح ان لوگوں سے بھی سلوک کیا گیا تھا یعنی اُن کے زیور اور پوشاک اُنار کے ایک ایک ذیل قسم کی چادر سبکو ستر بونشی

کے واسطے دیدی گئی تھی۔ اسی کو اوڑھے پہنے یہ لوگ پڑے تھے۔ جان کا خوف بڑا ہوتا ہو۔  
یہ سب اپنی زندگیوں سے مایوس۔ جانیں مبتلی پرلے ہوئے بھڑیلوں کی طرح کلپتے اور ایک دوسرے  
سے جٹے جاتے تھے۔ بھادرسنگ کا باپ جسکے جسم پر ٹھہریاں پڑی تھیں اور دہلا پے سے سائے  
جسم کی بڑیاں ڈھانچے کی طرح نظر آ رہی تھیں اور صورت ہی سے معلوم ہوتا تھا کہ قبر میں پاؤں اٹکائے  
ہے اپنے بیٹے اور اسکے اہل و عیال کی معیتوں پر پھوٹ پھوٹ کے رورہا تھا۔ جوان اور نازنین  
عورتیں جنگل عرس ناز برداری میں غزری تھیں جو ہمیشہ عیش و عشرت ہی میں بسر کرتی رہی تھیں  
اور جن کی صورتوں تک غیر مردوں کی نظریں نہ پونہی تھیں ایک دوسرے سے بیٹی ہوئی ایک گوشہ  
میں دیکھی پڑی تھیں اور اپنے بچوں کو اپنے کنبے سے ٹکائے تھیں اور ستم یہ تھا کہ بے تیرا بڑا ہی  
جوادھرا دھن میں ٹھکیا ہوا تھا۔ ہاں بچا دیوں کو کھورہنے تھے اور اپنے آواز سے کس رہتے تھے۔ ان  
عورتوں میں سے ایک کو بھنے دیکھا کہ اپنے بچے کو اپنی چھاتی سے لگائے ہوا اور اپنے نزدیک اس آخری  
وقت ہر مادی کا حق ادا کر سکے دل کو تسکین دے رہی ہو۔ ایک اور عورت کو دیکھا کہ خاموشی کے عالم میں  
بیٹی گردن کیے اور ناف پر سر کے ہونے سرت واں دہ کی دیدی بنی ہوئی ہو۔ ان دونوں عورتوں کے  
بدن کی خوبصورتی اور مدول پن کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ جو بڑا ایسا ٹائیک۔ بھیا ہوا تھا کہ کسی نقاش  
یا مصور کی تاب و طاقت نہیں کہ ایسے تناسب اعضا کا نقشہ اُتار سکے چہرہ کا کھلا کھلا گندمی رنگ  
اور اس پر سادگی کے ساتھ ملے کاٹے بالوں کی لٹوں کا بکھرا ہوا ایک ایسا دلکش ساں تھا جس کی نسبت  
اور انہیں ہو سکتی۔ انھوں نے تعداد بالوں کی لٹیں کھو کر انکو پریشان کر دیا تھا کہ شان و سینیہ  
چھپ جاسے اور دل کا غم چہرے کے ماتم سے بخوبی آشکارا ہو سکے۔

جب ان معیت زدہ گھوڑے معلوم ہوا کہ ہلوگ بھادرسنگ کے خیر طلب ہیں اور انکی تسکین دہل رہی  
کی غرض سے آئے ہیں تب انکا وہ خوف دور ہو گیا جو بھوکو آئے دیکھنے والی ہو گیا تھا۔ جسکی معیت  
سے وہ ایک دوسرے سے چڑھی جاتی تھیں اور اب انکے دونوں منت گزارا و احسانندی کو جذبہ  
کا جوش پیدا ہو گیا۔ اور یہی دلی جذبات انکی صورتوں سے بھی آشکارا ہونے لگے۔ جیسے ہی ہم لوگ  
انکے پاس پہنچے بیچارہ عورتیں اور بچے ہاتھ قدم بچہ گر پڑے۔ اور رو رو کے بھادرسنگ کی جانب عیشیہ  
جیسے سخی کے خواہان ہوئے۔ ہم لوگوں کے سامنے خوف زدہ حالت میں فوطہ عالم سے اٹھ کر اٹھ کر اٹھ کر  
اور ہم بٹلے کے ساتھ آگھوٹے آگھوٹے بنا ایک ایسا درد انگیز عالم تھا کہ بے اختیار لکھجھکھکھ کو آتا تھا اور ہم  
معلوم ہوتا تھا۔ یا ائمہ انکی یہ منت سماجت اور گریہ و زاری اپنی حفاظت کی غرض سے ہرگز نہ مٹھی بلکہ اس

لکھنؤ کی جاں بری کے واسطے مٹی جسکے ایک بے جا باغیچہ اور ان سب کو گرفتار کیا گیا تھا۔ یہ جو کہ اگر کبھی ہندوستان بجات بائیکاٹ اپنی عورتوں کی محبت اور محاسن اخلاق کی وجہ سے بجات بائیکاٹ کیونکہ ہندوستانی زنانہ خانوں سے بڑھ کر کسی مذہب سے مذہب تو ہم کی عورتوں میں بھی یہ نیک مٹی ہے۔ یہ پاکدامنی یہ حصمت اور یہ جو ہر شرارت نظر نہیں آسکتے۔ اہل یورپ کو ہندوستان کے سچے درجے کی عورتیں دیکھنے کو ملتی ہیں اور وہ انھیں کی حالت پر دو دہرہ دیکھ کر تعجب کرتے ہیں۔ لیکن یہ قیاس و سیما ہی غلط ہے جیسے کوئی غیر قوم کا آدمی لندن جانے اور وہاں گھٹان لگیوں میں سرشام جو شوخ جیاک اور بد راہ عورتیں گپاس کی روشنی میں نظر آتی ہیں انکو دیکھنے نام طور سے انگلستان کی عورتوں کے اخلاق کی بابت رائے قائم کرے۔ ہم لوگوں نے ان بوٹھے اور جوان عورتوں کو دم دلا سا دیا۔ گرہ بٹھکے سے نکال دیا اور پورا وعدہ کیا کہ اگر کبھی رہائی کے بارے میں اسے جو کچھ سنیں گے ان کی ضرورت درپیش ہوگی۔ اس تسلی دینے کی غرض یہ جو یہ مٹی کہ صاحب ریڈیٹ نے نواب کو ملانے کہ دیا تھا کہ اگر کسی جم کا جو جم جو تو بخیر اور سنگد ہوا اس کے اہل و عیال بیکٹا ہمنس ہیں اور ان لوگوں کا قتل عام یا انہیں جوتا شدہ داو غلام ہرگز نہ ہونے پائے۔ بیشک کمپنی بادشاہ کو اپنی سلطنت میں کود گئے قتل کی بہانہ دے سکتی ہے لیکن ہنسی کی اور جرمی کے ساتھ کسی پورے خاندان کی قتل و خونریزی یا معصوم عورتوں اور بچوں کے قتل و شوق جو وہ بھانا بنیکوہم گزروا نہ رکھے گی۔ اوجھا کہ کمپنی نے مظالم شاہی کی یہ پورے اہل یورپ کے کاغذ انکار ہے۔ پورے بچے مٹی تو وہ کیا دیکھیں گے کہ آخر کمپنی کی گورنمنٹ ہندوستان سے اٹھ جائے گی کہ یہی ہو گا انسانوں پر ایسے مظالم کا تماشہ دیکھو کہ یہی جو اور چوں بھی نہیں کرتی۔

ہلوگ اس مقام پر یہ نیک نہ ٹھہر سکتے بلکہ بدلتے رہے اور ان کے بادشاہ کے یہ فرمانیہ کے وقت ہلوگ وہاں موجود نہ ہو تو وہ دریافت فرمائیں گے کہ یہ لوگ کہاں گئے اور جب انکو یہ معلوم ہو گا کہ ہلوگ ایک بدخواہ کو نہ ملے اور اس کے اہل خاندان کی تسکین و تسلی کر رہی ہیں تو وہ اور زیادہ ہر جم جو جائیں گے۔ علاوہ اسکے خود ہلوگوں کو اب اور بھی اس سخت جہل کے پچھلی فکر طائفی مٹی لہذا وہاں سے اٹھ آجی مناسب معلوم ہوا۔

صاحب ریڈیٹ نے جو کچھ اس بارے میں کیا تھا اسے میں لکھ چکا ہوں۔ اگرچہ انھوں نے صرف بختا و سنگہ کے بال بچوں کے بارے میں اپنے خیالات ظاہر کیے تھے۔ مگر انکا اصلی مقصد یہی تھا کہ بختا و سنگہ کی جاں بخشی ہو جائے۔ کیونکہ انھوں نے نواب سے بھی طرح پر ورمہ کا کہ یہ کہہ دیا تھا کہ دسٹو نواب بختا و سنگہ کے بلیکنا خاندان پر اگر کچھ بھی تشدد کیا گیا تو میں اور کمپنی دونوں ملکر اسکا ذمہ دار تصور

کرینگے اور روشن الدولہ یا خاصہ تراش کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ صاحب رڈیٹ سے بھاؤ سکے۔ اس کیجئے  
 اس درشام کو جب جلسہ شوریٰ جمع ہوا تو ان دونوں نے ہم زبان ہو کر بہت اصرار کے ساتھ بادشاہ سے  
 رحم اور عفو تقصیر کی استدعا کی۔ اور آخر کار بیچ ہو کے بادشاہ نے فرمایا کہ "اچھا" اس کو رنگ کی جاں بخشی  
 کیجئے لڑا سکی جائے اور فوراً ضبط کر لیجئے اور وہ ایک کٹہر میں ہمیشہ کے لیے محسوس کر کے کھنڈ سے شہر  
 بدر کر دیا جائے۔ یہ حکم نہ اصرار ہو گیا اور نوپ کو اس کی تعمیل سپرد ہوئی۔

اس زمانے میں شمالی حصہ ملک داود علیہ السلام کا ایک رئیس کھنڈ آیا ہوا تھا اور وہ دوسرے دن صبح کو  
 کھنڈ سے اپنے مستقر انکسوت جائیداد آیا تھا۔ اس لیے یہ صلح قرار پائی کہ یہی رئیس اپنی ساتھ ہتھیار لے کر وہاں ایک  
 دائم محبس بنوایا جاتے لیکن بادشاہ نے اتنی ہی سزا پر اکتفا نہ کی۔ اور فرمایا کہ دو ہفتہ درنگ کی جائے  
 اس طرح پر بننا چاہیے کہ جہیز پہنچے کسی راجہ کی بیوی جو اس کی پوشاک اور ہتھیار منگائے اور پھر فوراً  
 اس کی تعمیل کی گئی۔

ہندو کا یہ خیال ہو کہ اگر کسی شخص کی بیگماری کی توہین کیجاتی ہو تو اس کے پیغمبر ہوتے ہیں کہ تو یا اس  
 بیگماری یا ہنسنے والے کی ذات کی توہین کی گئی چنانچہ اسی خیال کے بموجب ایک مہتمم بلایا گیا اور وہ بادشاہ  
 کے سامنے حاضر کیا گیا۔ اس مہتمم نے ہم سب لوگوں کے سامنے اس کی بیگماری کے ناپاک کرڈالا۔ تب جا کر بادشاہ  
 کو اطمینان ہوا مہتمم نے اس خدمت کو بہت خوشی غرضی سر انجام دیا کیونکہ اس کی بیوی ہوتی چیز اس کے لیے  
 بے نہیں رہتا تھا چنانچہ یہ بیگماری اور پوشاک اسی کو مل گئی۔ اور اس کے زین و فرزند کے لیے یہ آبرو کا  
 سامان ہمیشہ کے واسطے ہو گیا۔ پھر تلوار پیش ہوئی اور ایک نو ہار بلایا گیا۔ اور اس نے اس تلوار کو اپنے  
 پر زے کر ڈالا۔ اب طینچہ کی جوڑی کا نمونہ کیا۔ اس پر تلوار ہتھوڑا مارنے کی ہتھوڑا ہی اس کے دل میں لے کر  
 گزرا کہ کہیں نال بھری تو نہیں ہو۔ وہ رک گیا اور جب اس نے دیکھا تو دونوں ہتھوڑے بھرے ہوئے ہیں۔ بادشاہ  
 اس کے کہنے ہی سے مطلب سمجھ گئے تھے۔ پوچھنے لگے کہ کیا ہتھوڑے بھرے ہیں۔ اور اس نے دست بستہ  
 عرض کیا وہ جاں بخشی ہو تو فوری عرض کرے۔ خداوند ملت۔ دونوں کی نالیں بھری ہوئی ہیں۔ اس پر  
 بادشاہ سلامت بول اٹھے یہاں چارین آچھتے ہی سے کہ رہا تھا کہ یہ کو رنگ اول درجے کا بدخواہ تھا یہ  
 کہنے ۵۰ ہونگوں کی طرف متوجہ ہوئے اور بولے۔ کیسے صاحب لوگ۔ آپ کیا فرماتے ہیں۔ دیکھئے ظالم کے  
 دونوں ہتھوڑے بھرے تھے۔ اب بتائیے کہ اس کا روالی کے سچے سمجھے ہوئے میں بھی کچھ شک ہو۔ اسپریشٹ  
 صاحب نے عرض کیا کہ خداوند ملت۔ وہ تو حضور کی فوج کا جنرل تھا۔ اور اس کا یہی فرض تھا کہ حضور کی ہر اسی  
 میں تپ رہو تو اپنے ساز و سامان سے لیں رہو۔ اور ہتھوڑے بھرے رکھے مبادا کوئی وقت آجڑا تو اس وقت

کیا وہ سمجھ دیکھا کرتا! بادشاہ نے جواب دیا: درخانہ! آپ نے تو خوب بات بنائی خدا جانتا ہو بہت کمی۔ بھیا  
تھہر واپس دیکھتا ہوں کہ اور لوگوں کی کیا رائے اسباب سے ہو۔ کپتان صاحب کو بڑا۔ کہو فوراً حاضر ہوں۔  
اب یہ وقت پھر بہت نازک اڑتا تھا اور بچا ہے بختا و سنگھ کی موت و زلیست کا تصفیہ ترازو کی ڈنڈی  
پر رکھ دیا گیا۔ کو ذرا سی بول سے جودہ چاہے جھک جائے۔

ہر لوگوں کو حکم ہو گیا کہ خبردار کپتان صاحب کے آنے کے وقت کسی طرح پر اشارہ نہ کرنا یہ کوئی بات اُن سے  
نہ کی جاسکے۔ اگرچہ ہلوگوں کو اتنا خیال ضرور تھا کہ کپتان صاحب خود ہر طرح پر بختا و سنگھ کے ہی خواہ تھے تاہم  
اندیشہ تھا کہ اگر انکی زبان سے ایک حرف بھی خلاف نکل گیا تو پھر اُس بچا ہے کی جان کا خلا ہی حاطہ ہو۔ کپتان  
صاحب آئے سلام کر کے آگے بڑھے۔ بادشاہ سلامت بول اُٹھے کہ دیکھو کپتان یہ بتاؤ کہ کیا راجہ بختا و سنگھ  
(جواب نہ راجہ باقی نہا ہو نہ سنگھ) کا یہ فرض منصبی تھا کہ وہ جب ہمارے ساتھ رہو تو پھر سے ہوسے پستول باندھنا  
اب اس وقت ہلوگ دم بخود بیٹھے تھے۔ بیدار جاکے کشاکش سے ہر شخص بہت بنا بیٹھا تھا اور کپتان صاحب کے  
جواب پر سب کے کان لگے ہوئے تھے۔ کیونکہ اسی جواب پر گویا اُس بچا ہے کے جان منعلق تھی۔ لیکن اس وقت  
کی حالت نے کپتان کو اصل معاملہ کی حقیقت سمجھا دی تھی۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ راجہ بختا و سنگھ کے ہاتھ میں کھڑا  
ہو۔ بادشاہ بھی ساکت ہیں۔ پستول میز پر دھے ہوئے ہیں۔ اور ہر لوگوں کے چروں سے تشویش  
نظر ہر جہتی۔ ان تمام قرائن پر نظر رکھنے انھوں نے بیاضہ جواب دیا کہ: خداوند قدرت! بیشک کماؤر اچھٹ  
(سید سالار عسکر) یا جنرل افواج شاہی کا یہ فرض منصبی ہے کہ وہ ہر وقت ہر شخص کے دفعہ کے واسطے مستعد  
رہیں تاکہ اگر اتفاقاً کوئی موقع پڑ جائے تو فوراً وہ اعدائے شاہی کو موت کے گھاٹ اتاریں۔ اگر وہ اپنی پستول  
بھرس نہ رکھیں گے تو انکے باندھنے کا حاصل ہی کیا ہوگا! جب بادشاہ نے یہ جواب سنا تو تسقید خفیف ہوئے  
مگر سچی بات تھی سننے والے نے اور غصہ مثلاً کو بولے تو یہ بولے کہ: اچھا! ان بیٹوں کو چھوڑنے کے خالی کر ڈالو اور  
پھر انکو پرزے پرزے کر کے ہوا میں اڑا دو۔

اُس شب کو معمولی طور پر کھانا ہوا۔ اُس صبح سوہ جات پر اسے زنی ہوئی اور اُس صبح ہی سید شاہ  
مذہبی رہی۔ راگ رنگ میں مبتلا ہو کے شخص مست الہمت اور نیکی فکر سے آزاد و فانی البال ہو گیا  
کسی کو اُن گرفتار ان رنج و محن کا خیال نہ گزر اچھٹ میں قید یا جلا وطنی کے حکم سننے کا انتظار کر رہے تھے اور  
کھانے پینے کے وقت کسی نے اس معاملے کا ذکر نہ کر بھی نہ کیا۔ بادشاہ سلامت بھی معمولی شگفتگی کے ساتھ  
بشاش بشاش شراب نوش جان فرماتے اور یہ تماشے میں جی بہلاتے رہے۔ وہی ہنسی دہلکی کی باتیں تھیں۔  
وہی تفریح زندہ دلی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ انکو اپنے کیے پر ذرہ برابر ندامت ہو نہ اُنکے دل میں اپنی غلطی پر کچھ



بھی افسوس و حسرت۔

دوسرے دن جبکو خود صاحب ریڈیٹ نے اگر نجات و رستگاری کے مصیبت زدہ خاندان کو دیکھا  
انکو اپنی ہمدردی کا یقین دلایا اور اس بات سے مطمئن کیا کہ اب وہ خود اُنکے پشت پناہ ہونگے  
اور انہیں کسی طرح کا جو ر و نقدی ہونے دیئے گئے۔ یہ لوگ بڑے صاحب کو بڑی رقت کے ساتھ دعا مانگے  
لگے حقیقت یہ ہے کہ صاحب ریڈیٹ کی تشکین و تسنی نے اُنکے زخم خوردہ دل و نہایت اچھا مہم رکھا اور  
اب انکو اتنا سہارا ہو گیا کہ کوئی ہمارا بھی پرسان حال ہے۔

اسی روز نجات و رستگاری کے لئے اہل ایمان کے قیدیوں کی طرح اُس رئیس کے ساتھ کر دیئے گئے جو جانی حصہ  
اور دعا کا رہنے والا تھا اور جسکا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ صرف نجات و رستگاری کے بڑے جنگلی جانور کے کھڑے میں بند تھا  
اور اُس پر کچھ اور بھی سختیاں ہوتی تھیں باقی اسکے دیگر اہل خاندان ہر قسم کے ظلم و نقدی سے نجات پانے لگے تھے  
اور گو نہ آرام سے تھے صاحب ریڈیٹ کی دست اندازی سے جو کچھ ہوتا تھا اسے ہر طبقہ کے ہندوستانی  
لوگ تابو غیبی سمجھتے تھے چنانچہ امیر غریب۔ شاہزادے اور سپاہی یکساں طور پر کہنی بھاد اور اسکا نام  
لینے ریڈیٹ سے ڈرتے رہتے تھے۔ ان لوگوں کے دلوں میں کہنی بھاد کے نام کی ہیبت و جلالت سمائی  
ہوئی تھی۔ اور جاہل سے جاہل ہندوستانی یہ خیال کرتا تھا کہ کہنی بھاد کوئی زبردست خطرناک۔ اور  
چالاک جانور ہو کہ بہت دور سے بیٹھا ہوا ہندوستان میں نیک و بد جو کچھ ہوتا ہے اسے دیکھ رہا ہے۔ نیز  
مقتدر محل جو تاکہ وہ نہ کیا بلکہ کوئی دیو ہو کہ آدمی فرشتہ ہو یا دیوتا ہو۔ بہر حال کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ اس  
قابل ضرور ہے کہ اس سے ڈرتے رہنا چاہیئے۔

بیچارہ نجات و رستگاری والا اُس کے تعلق جہاز کے بلکونہ کچھ حال بھر بہت معلوم ہو کہ اُنکے بعض اعضاء  
اسکی کفالت بہت اچھی طرح سے کر رہے ہیں اور وہ رئیس جسکی حراست میں وہ دیا گیا تھا کچھ اسی میں اپنے  
دراستے بہتری سمجھتے ہو کہ اُسے آسائش ہے۔ کچھ نکلن غالب یہ ہو کہ امر ہے بہتر وستان کے عام دستور کے  
مطابق اُسے اپنی دولت توڑی بہت کسی ایسے متعلم پر مھو نظر کرتی تھی جہاں وہ منبعلی و قرتی کی آفتوں سے  
بچی رہی۔ کیونکہ اُسکا پتہ کسی کو ملا ہی نہ گا۔ یہ سچ ہے کہ روشن الدولہ نے بڑی ہوشیاری سے ڈھونڈ ڈھونڈ  
کے جہاں جہاں اسکی جائداد کا پتہ چلا اُسے تصرف کیا اور اپنے نزدیک اُسے بالکل کھوکھل کر دیا  
تھا مگر انہیں جسوت نجات و رستگاری کو مقربان شاہی یا ملازمان ریڈیٹ کی کوشش و نذرانہ دینے  
کے واسطے روپے کی حاجت ہوتی تھی اُسے رہنے کہیں نہ کہیں سے مل ہی جاتا تھا۔

نجات و رستگاری کی داستان مکمل کر نیئے واسطے میں اُسکے پورے واقعات اسی مقام پر لکھے دیتا

ہوں جس سال بختا در سنگ قید اور جلا وطن کیا گیا ہو اسی سال ملک اور وہیں قحط عظیم پڑا۔ خصوصاً چاول کی پیداوار بہت کم ہوئی اور وہ غلہ بھی جو اس ملک کے عوام کی روزانہ خوش رہی بہت ہی کم پیدا ہوا۔ لہذا چھ گرونی جو گئی اور باہر سے کنگوں نے شہر میں آگے لوٹ مار شروع کر دی۔ ہر طرف بد دلی پھیل گئی۔ جاسا سترنگی ہونے لگی۔ لوگوں نے ڈکے کی چوٹ پکار پکار کے کننا شروع کر دیا کہ بیٹوں بقالوں نے بے وجہ غلے کا بھاؤ بڑھا دیا جو ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ اور امن عام میں بالکل ظلل پڑ گیا جب دغا سلامت کی سواری نکلتی تو اٹنے باغی کی ہوج میں غریبوں۔ فائدہ کشوں کی اتنی عرضیاں گرائی کی شکایت اور بیٹوں کے مظالم کی ہر طرف سے برستی تھیں کہ بوج بھر جاتا تھا۔ اور اگر کبھی گھڑے پر بکتے تھے تو قحطازد لوگ جھک جھک کے عرضیاں پیش کرتے اور اپنی تکلیف اور مصائب کی داستانیں سناتے تھے۔ بادشاہ سلامت جب ہر طرف سے شکایتیں سننے سننے بہت تنگ آگے تو انھوں نے باہر نکلا کم کر دیا۔

اب بختا در سنگ کی جلا وطنی کو پورا سال گزر چکا تھا۔ لیکن ہنوز امن قائم نہیں ہوا تھا عرضیاں اب بھی آ رہی تھیں اور خاندانوں کی تباہی و بربادی خلقت کی فائدہ کشی وجاں ملی کے افسانے سننے سننے بادشاہ کے کان تک گئے تھے۔ آخر کار ایک روز سردار بادشاہ نے فرمایا کہ حقیقت میں بڑا اندھیرا چھا ہوا ہے۔ میں نے لکھنؤ میں کبھی نہیں دیکھا کہ اتنے دنوں بے امنی بد دلی کا دورہ رہا ہو۔ نواب نے اس کے جواب میں کچھ گئی پیداوار کا دلکش شروع کیا۔ لیکن بادشاہ نے شغف نہ فرمایا اور روشن کیا بد دلی عورتوں کے ایسے ذکر طے بیان کر رہا ہے۔ میں سب باتوں سے واقف ہوں۔ ہونو۔ وال میں کچھ کا لاہو نیشنل کی خزانے کے سامنے ہیں۔ سال گذشتہ میں تو بہت اچھی پیداوار ہوئی تھی۔ گیوں ماسٹر صاحب۔ آپ اس بارے میں کیا کہتے ہیں۔

اس ماسٹر صاحب نے عرض کیا کہ خداوند نعمت میں تو یہ جانتا ہوں کہ بازار کا انتظام کچھ بگڑا ہوا ہے۔ اس کی گرائی کامل ہونا چاہیے۔ سارا غلہ شور فرو ہو جائیگا۔ بادشاہ نے فرمایا۔ داند ماسٹر صاحب میں آپ سے اتفاق رہا کرتا ہوں۔ اچھا ایک کام کیوں نہ کریں۔ آج شام کو ہم سب لوگ چلیں اور چیل کے خود تحقیقات کریں۔ بیس بیل کے چلنا چاہیے۔ جیسے خدفا رنڈا بھیجیں یہ لاگرتے تھے۔ میں خود بھی ساتھ چاؤنگا۔ میرا جانا بہت بھاری آمد ہوگا اور خالی از لطف بھی نہوگا۔ چونکہ بادشاہ سلامت اس بات کو دل میں ٹھان چکے تھے اس وجہ سے یہ سب کی قدرت نہ تھی کہ انکو باز رکھ سکتا۔ لہذا ہم سب کو بیس بدل کے جانا لازم ہوا۔ اس وقت کسی کو یہ وہم نہ آیا تھا کہ ہمارے اس طرح جانے سے کوئی بڑا کام نکلے گا۔ خود بادشاہ سلامت معمولی یوہن لہاس پھٹکے پٹنے پر تیار ہو گئے۔ روشن انداز سے بھی وہی وضع بتائی۔ دواؤں اور

مازم بھی اسی حیثیت سے ساتھ ہوئے اور اور صاحب لوگوں کو حکم ہوا کہ جدا جدا بازار میں بطور خود جائیں تاکہ کسی کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ بادشاہ کے ہمراہ ہیں۔ اور نہ کوئی شخص بادشاہ کو پہچان سکے۔ نواب اور کپتان نے ہر قسم کا انتظام اس غرض سے کر لیا تھا کہ کوئی اتفاقی سانحہ پیش نہ آئے پائے۔ بلکہ یہ بھی بندوبست کر لیا تھا کہ اگر کسی صورت سے کوئی واردات پیش آجائے تو اسکا امداد کر دیا جائے کیونکہ اس بات کا خطرہ ضرور تھا کہ خود بادشاہ کے اہل خاندان کو اگر اسکی اطلاع ہو جائیگی کہ جاپناہ اس طرح بیک بینی و دو گوش اور بھیس بدلے ہوئے بازار میں نکلے ہیں تو غالباً وہ کچھ فساد ضرور برپا کریں گے۔ و کچھ نہیں اگر ان لوگوں نے اٹنا ہی کر لیا کہ چند پر معاشوں کو بچھکے بادشاہ کے اوپر حملہ کر دیا تو انکا ہاتھ پکڑنے والا کون ہو گا ان خطرات پر نظر کر کے کپتان اور نواب نے اپنے سپاہیوں کو غفنی حکم دیا کہ معمولی لکھنؤ جاسیں لیکن مسلح یا بر ساتھ ساتھ نہ ہیں۔ چونکہ عموماً لوگ بازار میں ہتھیار بند رکھتے ہی ہیں۔ اسوجہ سے ان سپاہیوں کو دیکھنے کے لیے کو مفق شک و شبہ بھی نہوگا۔

یہ برگز خیال نہ کرنا چاہیے کہ اتنے آدمیوں کے ایک ساتھ چلنے سے کسی کو کوئی شبہ پیدا ہوگا۔ برگز نہیں کیونکہ شام کے وقت بازار میں آدمیوں کی اس قدریں چلی ہوتی ہیں کہ شانہ سے شانہ چھلتا ہو۔ اور بغیر حکم و کا دو قدم چلتا مشکل پڑ جاتا ہو۔ اور اسکی وجہ زیادہ تر یہی ہے کہ راستے تنگ ہیں اور انہیں آدمیوں کی بیل لگ جاتی ہو۔ خیر تو ایسی حالت میں بہت سے آدمیوں کی جماعت کا بغیر کسی شہر یا دوسو اس کے پیدا کیے بے تکلف نکل جانا آسان ہو

ہوٹل بازار میں پہونچے تیسیں۔ بڑن چراغوں کے چلنے کے سبب دھواں چھایا ہوا تھا۔ اور کثیف و بدبودا کپڑے پہنے ہوئے لوگوں کی آمد رفت کے سبب سارا راستہ گندہو رہا تھا۔ ایک طرف سے کھٹلے کے راجپوت اور چھان ڈھال تلوار سے اڑی بنے ہوئے۔ تیوریاں پڑھائے کہنیاں رتے اور شانے سے شانہ رگڑتے چلے گئے۔ ایک طرف سے لمبی دائرہ والے متقی پرہیزگار مسلمان ہلوگوں کی طرف اس نظر سے گھورتے محل گئے کہ ”بھلا یہ مقام صاحب لوگوں کے چلنے کے قابل ہے؟“ ایک طرف چھپرے برن کے ہندو و کاڈا مسکرا مسکرا کے ہماہی طرف دیکھتے اور اپنے سوسے کی خریداری کی درخواستیں چیکو چپے الفاظ میں کر رہے تھے۔ بالآخر ہلوگ ایک صراف کی دوکان کے قریب پہونچے۔ یہاں زرا راستہ نشادہ تھا۔ اور دیسی بھیڑ بھی نہ تھی۔ صراف کے سامنے رچو بن پیسوں اور پرہیزگار یوں کے ڈھیر تک الگ برتنوں میں لگے ہوئے تھے۔ اور بیچ دوکان میں صراف صاحب چار زانو بیٹھے ہوئے تھے۔ اور دوکان سے ملے ہوئے قوی ہیکل سپاہی کھڑے ہوئے صراف

بہنی مخالفت کر رہے تھے۔ راستے میں ایک خوشحال سوداگر کچھ اچھے کپڑے پہنے ہوئے صرف کی دوکان پر آیا۔ بڑے تھاک سے علیک سلیک کی۔ اور بولا ”ارمیاں۔ مادھو! کچھ مٹا بھی آج بیچ ایک اور چاول دالے کی کوٹھار لٹ گئی۔“ مادھو نے جواب دیا ”بڑا بد وقت آگیا ہو۔ بھائی بہت ہی بد وقت آگیا ہو، یہ لکے وہ دیر تک افسوس کے ظاہر کرنے کو اپنی گردن ہلاتا رہا پھر ہلوگوں کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ لے اُسے شاید یہ خیال کیا کہ ہلوگ اُس سے کچھ لینا چاہتے ہیں لہذا وہ ہمارے طرف متوجہ ہو گیا۔ بادشاہ سلامت اس سوال جواب کو سُننے جو کتا ہو چکے تھے۔ اور اب اُنکو منظور تھا کہ ذرا اور خیالات سنیں۔ چنانچہ وہ اس دوکان سے ذرا ہٹ کے ایک تونہ کی دوکان کے برابر کھڑے ہو گئے۔ اور اوپر ہی دیکھنے لگے ہلوگ بھی کچھ آگے بڑھنے لگے۔ اتوار دیکھنے لگے ایک نووار سوداگر نے پھر کہا کہ ”اجی ایسا بد وقت آگیا ہو کہ نفع سے مال جیسا پیش کیڑا گیا ہو، گھڑی تو یہی دھڑکا لگا رہتا ہو کہ کمین کرنی کو ٹھنڈے۔ ان دھڑکوں میں حریر و فروخت کا کیا ٹھیک۔“ مادھو نے جواب دیا ”ہاں جی۔ بیچ تو کتنے ہو۔ اتنا بڑا دھڑکا لگا رہتا ہو۔ نہ معلوم اب کیا کر رہے ہو گئی ہو۔ ورنہ آخر پہلے یہ بات کبھی نہ تھی۔“ پھر گردن ہلا کے اُسے کہا کہ ”اور اب خدا ہی رہی جو یہ حالت سنبھالے۔ کچھ امید نظر نہیں آتی۔“ اسی عرصے میں ایک گانہک آگیا اور وہ اس سے مخاطب ہو گیا ”کچھ حضور! اشرفیہ جو لیسہ کا پندرہ روپیہ۔ گیارہ آنے چار پائی کا بھجواؤ ہو۔ چار آنے اٹھ پائی دستور اور لوگ پورے پانچ آنے دستور بیٹے ہیں میں تو چار آنے اٹھ پائی لیتا ہوں۔“ پھر وہ اُسی شخص کی طرف مڑا اور بولا کہ ”ہاں۔ بابو صاحب! اب بڑا بد وقت ہو۔“ اسکے جواب میں بابو نے کہا کہ ”بھائی! سچی بات یہ ہے کہ ہر بختا ورسنگ کے زمانے میں یہ بات کبھی نہ تھی جب سے وہ گئے بس تب ہی ساری گر بڑھ چکی ہو۔ بھلا اُنکے وقت میں کیسی مجال تھی کہ اندھیر مچاتا۔ وہ بازار کا انتظام خوب کرتے تھے۔“ اسپر بادشاہ نے بھی کان کھڑے کیے اُنھوں نے اب اور بھی کان لگا کے سننا شروع کر دیا۔ اور اسی عرض سوز آگے بڑھ کر کچھ پھول کے کٹے رکھنے لگے۔ مادھو نے ہاؤ کو یہ جواب دیا ”بیچ کتنے ہو۔ بابو جی! اُنکا انتظام بڑا چوکس تھا۔ بازار تو اُنکے بندوبست سے سنبھلا رہتا تھا۔ تمہارا کتنا بالکل سچ ہو۔ یہ سارا انتظام اُنھیں کے دم کے ساتھ گیا۔ افسوس اتنا بڑا بد وقت آگیا ہو۔“

بابو صاحب تو اتنا شوشہ چھوڑے چلے پھرتے ہوئے۔ اُنکو جو کچھ کہنا تھا کہ گئے۔ مجھے اس وقت بھی اور اب بھی یہی خیال ہو کہ یہ شخص اسی غرض سے بازار بھیجا گیا تھا۔ اور غالباً بختا ورسنگ کے کسی عزیز یا دوست نے بادشاہ کے بازار بانیکی خبر سن کر یہ تدبیر کی ہو گی۔ کہ اسی ذریعے سے بادشاہ سلامت کو اس تباہی زدہ جنرل کی یاد آجائے چنانچہ اسکا یہ منصوبہ پورا ہو گیا۔

کیونکہ اب باو شاہ جو قصر شاہی میں داخل ہوئے تو کسی فکر میں ڈوبے ہوئے۔ اُنکے دماغ میں اب ایک نیا خیال پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ اسی طرح جیگا تھا جیسے اکثر لوگ جنگی طبیعتوں میں از خود ایجاد و اختراع کا مادہ نہیں ہوتا۔ اُنکے دماغوں میں دوسرے نئی کھجانی ہوتی یا تو غریب جم جایا کرتی ہو۔ اب اُنکو نجات و رستہ گاہ کا دوران باتو کا جو بازار میں سستی تھیں تصور بند ہو گیا۔ اور غریب بند ہو گیا۔

چنانچہ اس واقعے کے دو مہینے بعد راجہ بختاور سنگھ دربار میں اپنی خدمت سابقہ پر قہر آنے لگے۔ وہی خدمات و فرائض اُنکے سر پر ہوئے۔ وہی سرفرازی و نظرنایت اپنی ہو گئی۔ اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے عیس کوئی تفرقہ پڑا ہی نہ تھا۔ بختاور سنگھ کی سرفرازی کے بعد غلہ کی پیداوار بھی بافراط ہوئی۔ اور جس زمانہ میں میں نے لکھنؤ کو خیر آباد کہا تھا اس وقت تک راجہ بختاور سنگھ بہستور خیر آباد تھے اور باو شاہ کی نظرنایت کچھ اور زیادہ اپنی ہو گئی تھی۔

## باب نم

### حرم شاہی

اگرچہ حرم شاہی کے اندرونی مکانات اور وہاں کے رہنویوں کے طرز و انداز و دسے دیکھنے کا ہلکو کوئی موقع کبھی نہیں ملا۔ پھر بھی وہاں کے حالات سے سناٹے اتنے معلوم ہیں کہ جو کافی سمجھے جاسکتے ہیں سننے کا ذریعہ یہ تھا کہ اول تو یوں کہیں بیٹیاں اکثر اوقات حرم شاہی میں جایا کرتی تھیں اُن سے بہت کچھ حالات معلوم ہو جاتے تھے۔ باقی جزئی باتوں کی اطلاع خواجہ سراؤں سے ہو جاتی تھی۔ کیونکہ یہ لوگ تو بیگمات شاہی کی خدمتگاری کے واسطے مخصوص ہی تھے سچ سے شام تک کے حالات اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے۔ دوران لوگوں سے ہم کو اکثر سننے اور بات چیت کرنے کا اتفاق ہوتا تھا۔ پس اس طور پر اگرچہ بہت سی باتیں جیسے نجی بھی رہی ہوگی مگر ہم اکثر حالات کا نہایت صحیح علم بھی ہلکو ہو گیا۔ بہت کچھ وہاں کے حالات ہماری سمجھ میں بھی آ گئے۔ اور خلاصہ یہ کہ اگرچہ ہم نے ان مقامات کو براے العین مشاہدہ نہیں کیا لیکن دوسرے لوگوں کے ذریعے سے اس قدر واقفیت حاصل کر لی کہ محض حقل آرائی کرنا نہیں پڑتی ہے۔

حرم شاہی کے عجائبات و نوادر میں سب سے زیادہ جوجہ اہل یورپ کے کانوں کو غیر مانوس معلوم ہوگی وہ وہاں کے زمانہ سبیاہیوں کی حالت ہوگی۔ میں نے خود ان مردنا سپاہیوں کو اکثر زمانہ ڈیڑھ چار ٹیلے طلاء کرتے دیکھا ہے۔ مجھے خود ایک عورت تک اُنکے عورت ہونے کی خبر نہ تھی۔ اور بہت دن بعد پھر اُن کی اصلی جنسیت کا بصیرت کھلا۔ میں ہمیشہ ان زمانہ سپاہیوں کو ہی سمجھتا رہا کہ لپسٹ قد جوان مرد ہیں جو بڑے جیلے

ڈھیلے کرتے پہنے ہوئے ہیں۔ کیونکہ انکی ترکیب جسمانی میں بجز قد کی بستی اور سینے کے اُبھار کے اور کوئی ماہر الامتیا نہ تھا۔ اور چونکہ مجھے ولایت میں سپاہیوں کو ڈھیلے اور دی پہنو اور لٹا کو برکی طرح بھولی بھالی دیکھنے کی عادت سی ہو گئی تھی اسوجہ سے جب میں نے انکو دیکھا تو کوئی اچنبھا نہ ہوا۔ نہ انکی اصل حقیقت دریافت کر سکی ٹوہ ہوئی۔

یہ عورتیں اپنا لہنے لہنے بالوں کا جوڑا باندھ لیا کرتی اور پھر اُسے سر پر رکھے بگڑا سی سے چھپا لیتی تھیں۔ باقی در دی وہی ہوتی تھی جو معمولاً ہندوستانی سپاہی پہنتے ہیں۔ مردوں ہی کی طرح وہ تہیاب بھی اپنے جسموں پر سہائے ہوتی تھیں۔ ہاتھ میں سنگین چڑھی ہوئی بندوق۔ کمر میں پٹٹی۔ مشانے پر کار تو سونکھ پر تلا بعینہ وہی سپاہیانہ وضع جو احاطہ بنگال کی فوج کی ہوتی ہو۔

چونکہ ان عورتوں سے حرم شاہی کے پرہ چوکی کا کام متعلق تھا اسوجہ سے میں نے خود اُن کی مفلوں کو در دولت کے صحن میں پرے جاسے قواعد کرتے دیکھا تھا۔ ایک ہندوستانی افشار ہی فوج کا ہوتا تھا اور قوا سکھایا کرتا تھا۔ یہ عورتیں پوری طرح سے بندوق چھٹانے آگے بڑھنے بھیجے پٹنے۔ اوہراہر باقاعدہ گھومنے بندوق بھرنے۔ نشا نگلنے سنگین بڑھانے کے کام اُسی ترتیب اور قواعد کے ساتھ کرتی تھیں جیسے بارکوں میں ہوتے ہیں۔ یہ تو میں ٹھیک نہیں کہہ سکتا کہ وہ کبھی مرد سپاہیوں کے ساتھ میدان جنگ میں شریک ہونے کا مدد دیکھتی تھیں۔ غالباً نہیں دیکھتی تھیں۔ لیکن یہ ضرور کہ اُن کے اپنی چاعت میں سار جٹ اور کار پوریل وغیرہ تو ہوتے تھے۔ میرے یقین میں اُن کی چاعت میں انفری کا درجہ سار جٹ سے بڑھنے نہ پاتا تھا۔

ان عورتوں میں سے اکثر منکوحہ ہوا کرتی تھیں۔ اور اسوجہ سے کبھی کبھی دیندو دھینڈے کے واسطے ایسی عورتیں اپنی خدمت سے چند روزہ غلامی پر مجبور ہو جاتی تھیں لیکن جب تک ممکن ہوتا تھا وہ اپنا کام ضرور کیے جاتی تھیں۔ مجھے جسوقت تک یہ بھی نہیں کھلا تھا کہ یہ عورتیں سپاہی بنی میں میں نے کبھی اس بات پر غور بھی نہیں کیا کہ اُنکے قد و قامت اور احسانے جسم کا تا سب مردوں کا ایسا نہیں تھا۔ اور چونکہ میں نے اگلاستان میں ایسے سار جٹ بہت دیکھے تھے جنکے چہرے اور قد و قامت اُن عورتوں سے مشابہ تھے جسکی مدت وضع مل قریب ہو جاتی تھی۔ اس لیے کوئی حیرت اُنکو دیکھنے نہیں ہوئی نہ یہ کوئی نئی بات معلوم ہوئی۔ بادشاہ سلامت اکثر ان عورتوں کو دیکھنے غلط ہو ا کرتے تھے۔ اور اُنکو انعام و لادیا کرتے تھے جھکو یہ معلوم ہوا تھا کہ اس بارے میں قطعی احکام نافذ ہو گئے تھے لہذا نہ وضع حمل کے قریب آجاسے پر یہ عورتیں اپنی خدمت سے برائے چندے

عسکریہ و ہندو جایا کرتے۔ لیکن یہ احکام نہایت عمدہ تھے ساتھ بہت ہی سبب الفاظ میں ظہور کیا گئے تھے اور ان کے معبود ذہنی معانی ایک اور پر لیے میں میان کر دیے گئے تھے۔

ان زمانہ سپاہیوں کی محل دو کمپنیاں تھیں اور ان کے صفات اور قوت کا تعقیبہ ناظرین خوب کر سکتے ہیں۔ میرے زمانہ قیام لکھنؤ میں صرف ایک بار یہ اتفاق پیش آیا تھا کہ بادشاہ نے ان عورتوں کو اپنی ماں کے مقابلے میں لڑنے بٹرنے کو بھیجا تھا۔ میں بیشتر لکھ چکا ہوں کہ نصیر الدین حیدر کے باپ غازی الدین حیدر سابق شاہ اودھ نے یہ ٹھکان لی تھی کہ نصیر الدین حیدر ان کے قائم مقام ہونے پائیں۔ چنانچہ انھوں نے یہ کوشش کی تھی کہ انکو اپنے قبضے اور اختیار میں کر لیں۔ تاکہ اگر ضرورت پڑے تو اس بھارت کے شانے کیواسطے انکی جان ہی لے ڈالیں اور کسی طرح سخت نشین ہونے دیں۔ لیکن اسوقت نصیر الدین حیدر کی ماں بڑی جرأت و استقلال کے ساتھ اپنے بیٹے کی طرف سے لڑیں۔ انھوں نے اپنے سپاہیوں کو مسلح کر کے ذاتی مردانگی سے بہت اچھی مثال قائم کی اور اپنے ہر سپاہیوں میں بہت کچھ جوش بھی پیدا کر دیا چنانچہ بالآخر وہی فتح مند ہوئیں اور بادشاہ نے شکست کھائی۔ لیکن ایک سخت خونریزی ہوئی اور صاحب ریخت نے دریاں میں چڑے کشت و خون موتوں کر دیا۔ ان حالات پر نظر کر کے ہر شخص ہی خیال کر گیا کہ نصیر الدین حیدر نے اپنے عہد سلطنت میں اپنی ماں کے ان حقوق خدمت کو جو انھوں نے بیٹے کی بجائے بیسی کے عالم میں کھینچا اور جنگی بدولت انکو تحت شاہی نصیب ہوا تھا کبھی فراموش نہ کیا ہوگا۔ لیکن یہ خیال واقعات سے غلط ثابت ہو گیا۔ لیکن جو کارروائی غازی الدین حیدر نے نصیر الدین حیدر کے واسطے کرنا چاہی تھی بعینہ وہی کر دینی نصیر الدین حیدر نے اپنے بیٹے کے واسطے کرنا چاہی اور انکی بار بار غصہ و خشم صاحب ریخت نصیر الدین حیدر کی ماں اپنے اپنے پوتے کی حفاظت میں وہی جو ہر جماعت دکھائے جو نصیر الدین حیدر کے واسطے انکے باپ کے مقابلے میں دکھائے تھے۔ انھوں نے پوتے کو اپنی حفاظت میں لیا اور بادشاہ کو حوالہ کر دینے سے قطعی انکار کیا۔ نصیر الدین حیدر نے بہت کچھ غیظ و غضب دکھایا۔ مگر ہم صاحب ریخت کے بہت سے بہتوں نے انکو روک دیا اور بادشاہ نے اس کارروائی میں کچھ نہ کیا۔ انھوں نے اس حکم کی تعمیل سے انکار کر دیا تب بادشاہ نے اپنی بڑا فوج کو انکے اخراج کا حکم دیا۔ لیکن ہم کے ساتھیوں نے مقابلہ کر کے اس فوج کو ہٹا دیا۔ اسوقت کی لڑائی میں چند گولیاں میرے مکان کے اوپر اور بہت سے گولیاں تھیں بلکہ دو چار گولیاں میں بھی آگے لگی تھیں جب میں نے اصل حقیقت دریافت کی اور سب حالات معلوم ہوئے تو میں نے یہی قصد کر لیا کہ یہ مکان چھوڑ دینا

چاہئے۔ اس زمانے میں لکھنؤ کی یہ کیفیت ہو رہی تھی کہ اگر چند آدمی قتل ہو جاتے یا کسی معمولی ہنگامے میں دو چار بند و قیں چل جاتیں تو بھلوگ دست پاچہ ہو جاتے تھے۔ غیر تو ماں بیٹے کی اس لطافت میں بیگم صاحبہ کے پندرہ سولہ آدمیوں کی جانیں گئیں۔ اور آخر کار اس معاملے کا یوں خاتمہ ہو گیا کہ صاحب رزیدنٹ نے مداخلت کی اور بادشاہ نے یہ اقرار کیا کہ بیگم صاحبہ یا اپنے لڑکے سے آئندہ کچھ تعرض نہ کر دنگا اگر بیگم صاحبہ اُس مکان میں اٹھ کے چلی جائیگی جس میں چاہتا ہوں۔ اس پر صاحب رزیدنٹ نے اس لڑکے کی جان کا ذمہ اٹھایا اور بیگم صاحبہ مکان سے اٹھ گئیں۔ کیونکہ بیگم صاحبہ کو ایک انگریز کی زبان پر بہ نسبت بادشاہ اور اُنکے جمع وزراء کے قول و قسم کے زیادہ اعتبار تھا سچ تو یہ ہے کہ صرف یورپ ہی میں انتھانت کی وہ عظمت و جلالت اور اسکی بات کی وہ عجبتاثر ظاہر نہیں ہوتی جو ایک ایک انگریز کے نام میں مضمر ہے۔

بیگم صاحبہ کی اس تمام دوا و دوش اور مردانہ تقسیم حرایم و استقلال پر بھی یہ لڑکا بادشاہ کا نشانہ نہوسکا۔ کیونکہ نصیر الدین حیدر نے بذریعہ اشتہار اس لڑکے کے حرامی ہونے کا اعلان کر دیا تھا اور اسی مضمون کے سرکاری اشتہارات لکھو کے لکھنؤ کے پھانگوں پر چسپاں کر دیے گئے تھے۔ اور اس کارروائی پر انگریزی گورنمنٹ ہند نے جو بڑا کیا کہ ایسی صورت میں کہ اس لڑکے کے اچھے پر یہ کلنگ کا ٹیکا لگا ہوا ہو اسکو سخت تاج شاہی ہانے کا کوئی حق نہیں پھر جب خاصہ تراش کے چلے جانے کے تھوڑے دن بعد نصیر الدین حیدر کو زہر دیا گیا تو بیگم صاحبہ نے از سر نو اس فقے کو برپا کیا اور اسقدر زور دکھایا کہ انہو سپاہیوں کو بھیجے کہ رزیدنٹ کی کامحارہ کر لیا۔ اور اسی نوع و عود اس سلطنت کو سخت پر بٹھا دیا۔ لیکن اس تمام کارروائی سے رزیدنٹ صاحب مطلق ہر اسان نہ ہوئے اور اگرچہ خود انکی جان معرض خطر میں پڑ گئی تھی لیکن انھوں نے کچھ پروا نہ کی اور اس لڑکے کو وارث تاج و تخت تسلیم کرنے سے قطعی انکار ہی کرتے رہے۔ انھوں نے فوراً چھاوٹی سے فوج طلب کی اور جب فوج آگئی تو حکم دیدیا کہ زیر کیا جائے۔ ایک ہی دو گراں کی باڑہ چلنے سے بلوائیوں کا مجمع منتشر اور پراگندہ ہو گیا۔ اور نصیر الدین حیدر کے ایک مہم حجاب کے ساتھ بادشاہ ہمیشہ بہت بُرا برتاؤ کیا کرتے تھے سریر اور اسے سلطنت ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ضعیف ملکہ اور یہ نوع و عود کا ابھی تک لکھنؤ میں بقید حیات ہیں اس میں شک نہیں کہ انکی نیت بخیر تھی اور دوبارہ اپنی دھینگا دھینگائی سے بزدل و شمشیر کامیاب ہو چکی تھیں۔ اگر بیگم صاحبہ کسی اور زمانے میں پیدا ہوئی ہوتیں اور گرد و پیش کے حالات ذرا تبدیل شدہ ہوتے تو یقینی اُنکے کارہائے نمایاں دنیا کی تاریخ میں بہت روشن حرفوں میں نظر آتے مجھے



ہوئی شجاعت اور پامردی پر پسند آفریں کہنا چاہیے۔ اور اس سطح انگریزی روڈ ٹرنٹ کرنل کو صاحب بھی مستحق تحسین و آفریں ہیں کہ اگر وہ استقلال اور غریت سے کام نہ لیتے تو معاملات بہت جلد دیگر گوں ہو جاتے اور انجام بخیر نہ ہوتا۔ کیونکہ اس میں کچھ شک و شبہ نہیں کہ اس دلدل علم کی محرومی تخت و تاج سے اتنے نتائج پیدا نہیں ہوئے جتنے اس حالت میں پیدا ہوتے جبکہ وہ فرمانروا سے ملک ہو جاتا۔

لاحول ولاقوة۔ میں بھی کہاں سے کہاں جا ہوں گا۔ زمانہ سپاہیوں کے بیان نے میرے قلم کو خوب غرض دی کہ ایک اور ہی ڈکھڑا چھڑ گیا۔

کھنڈ کے حکم شاہی میں عورت کا ایک اور گروہ بھی قابل تذکرہ ہو۔ یہ کہاریو کا گروہ ہی۔ ان کہاریوں کے دے یہ خدمت تھی کہ حرم شاہی کے اندر جب بادشاہ سلامت یا کوئی بیگم ایک مکان سے دوسرے مکان میں جانے لگیں تو انکی بالکی یا اور جو بند سوار می ہو اُسے اپنے کا ندھو بڑا کٹھ لپھلیں۔ ان کہاریوں کے قواعد بھی سپاہیانہ انداز سے ہو اکر تھی اور اسی جماعت میں افسر ہر قسم کے لیے متہدد و غیر متہدد ہو اکر تھے۔ نصیر الدین حیدر کے زمانے میں ان کہاریوں کی جمعدار یا افسر ایک مردانہ صورت تو ہی ہیکل کماری تھی۔ یہ کماری بادشاہ کی بڑی منہ لگی تھی اور بادشاہ سلامت اس سے اکثر کھلتی کیا کرتے تھے۔ اور وہ اس سطح بادشاہ سوز بان طرائق اور شوخی و شگلی سے ترکی بہ ترکی جواب دیتی تھی کہ دیکھنے والے دنگ رہ جاتے تھے۔ میں اس بولی ٹھوکی کو حوالہ کلم نہیں کر سکتا جو اس طرار عورت سے اور بادشاہ سے ہوتی تھی کیونکہ اُسکو سننے ہر ایک مذہب آدمی کان میں اُٹھ لی ہے لیگا میں نے ولایت میں ایک معتبر صاحب سے جو اس زمانہ میں کھنڈ میں موجود تھے یہ بھی سنا ہے کہ اسی کماری نے بادشاہ کے بعض اہل خانہ اس کے ساز کر کے بادشاہ کو بڑھایا۔ بیگمات شاہی کی خدمت گزار کے واسطے بہترین پیش خدمتین۔ اماں۔ اہلیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ انہیں سے کچھ تو تبدیلی خانہ زادیں ہوتی تھیں۔ اور کچھ غریب والدین سے جو چھٹس صورت یا سلیقہ و خدمتگزاری خریدی جاتی تھیں۔ ان عورتوں کے سلیقہ اور حسن خدمت کا معیار صرف اچھا گانا اچھی داستان کہنا۔ یا اچھی طرح پاجبی کرنا ہوتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ جس طرح پُرانے زمانے میں قسطنطنیہ کے ایوان شاہی کی رو تیں سنیں گئی ہیں اسی طرح اودھ میں بھی بد وضع اور معتوب بیگمات شاہی بہت ہی چپ چلائی دنیا سے دور دفان کر دی گئی تھیں اور یہ کام انھیں شہنشاہ متوں یا خواجہ سراؤں کے ہاتھوں سرانجام پائے تھے۔ ان لوگوں کے حالات مشہور یہ سن علی زیادہ بیان کر سکتی ہیں اور میں انھیں کی تحریر نقل کیے دیتا ہوں۔ اتنا میں خود

سہ دیکھی کتاب۔ سلطان ہنگ۔ بعض حالات اس پر سن ملی ایک انگریزی پیشہ تھیں۔ انہوں نے کھنڈ کے

بھی کہہ سکتا ہوں کہ یہ حالات صرف حرم شاہی تک محدود نہیں بلکہ لکھنؤ کے اکثر ذی مرتبہ خاندانوں کی حالت ایسی ہی کچھ ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ اگرچہ ان لونڈیوں کو بیگمات کی ذاتی خدمتگزاری کی وجہ سے ہر وقت حاضر باش اور تعمیل ارشاد پر پلار رہنا پڑتا ہے لیکن ان کے ساتھ سلوک بہت اچھا ہوتا ہے۔ اور ہر قسم کا سامان آرام و آسائش ان کے واسطے دیا گیا جاتا ہے۔ باری بندھی ہوتی ہے اور معینہ و قنات پر ہر ایک اپنی باری سے اپنا کام کرتی اور خوش سلیقگی کے ساتھ اپنے مالک کے خدمات بجالاتی ہے۔ مہنگی بیویاں ان پر اسے طرح ہر محبت کی نظر رکھتی ہیں جیسے اوپر میں خدمتوں اور خواصوں پر۔ اور اس غلامی کی حالت میں بھی ان پر کسی طرح کی سختی و درشتی نہیں روا رکھی جاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ انھیں لونڈیوں کی کثرت یا قلت سے ہر گھر کی شان اور منزلت بھی جاتی ہے کیونکہ مسلمان سوسائٹی کی موجودہ حالت میں لونڈیاں امارت کے لوازم اور ریاست کی شان سمجھی جاتی ہیں۔ جو بیویاں نیک دل اور نیک مزاج ہوتی ہیں وہ اپنی لونڈیوں کی شادی بھی یہ وہ سن تیز کو پہنچ جاتی ہیں ان کے مناسب حال لڑکے تلاش کر کے کر دیتی ہیں اور جب ان سے اولاد ہوتی ہے تو اس اولاد کو بہت ہوشیاری و خبرداری کے ساتھ پالتی پرورش کرتی ہیں اور اکثر اوقات ان کی دیکھ بھال کے واسطے جو نئے وظایف مقرر کر دیتی ہیں یا خود انھیں نوظوق غلامی سے مگلو خلاص کر دیتی ہیں۔ حقیقت امر یہ ہے کہ جن لونڈیوں کے ساتھ مسلمان لوگ یہ چکا لگتے کہ سبک نہیں کرتے وہ یقیناً خود ہی بد راہ اور نئے ہوتے ہوئے۔ یہ کیفیت لونڈیوں کی اچھی حالت کی تخریب کی جواب ذرا اٹکی بڑی حالت کی ایک حکایت بھی سن لیتا جیسا ہے ہم صاحب نے تو یہ حکایت اسی معمولی سادگی کے ساتھ بیان کی ہے جو نہ مصنفین کا مہارت ہے۔ لیکن اگر کوئی مرد اس معانی و سادگی سے یہی داستان نقل کرنا تو نرم دل و عورتوں پر رقت طاری ہو جاتی۔ وہ لکھتی ہیں کہ میں نے سنا ہے کہ ایک مغز بیگم صاحبہ نے ایک نہایت حسین و خوبصورت لڑکی کو بیچنے سے پالا پرورش کیا تھا جب وہ جوان ہوئی تو صاحب خانہ کی منتظر نظر ہو گئی۔ اگرچہ بیگم صاحبہ کو خطرہ خیال ہی میں نہ لاتی تھی اور ان تمام احسانات و مراعات کے عوض میں جو بیچنے سے بیگم صاحبہ نے اس پر کیے تھے اسے بیگم صاحبہ کی بھائی پر کو دوں و دلناشہ دے کر دی۔ اگرچہ مجھے ٹھیک یہ نہیں معلوم کہ اس لونڈی نے بیگم صاحبہ سے کتنے قسم کی محسن کشی اور ناسپاسگزاری کی مگر میں نے سنا ہے کہ بیگم صاحبہ نے ایک نونہ عہد نامہ کرنے اور اپنی شان پر قرار رکھنے کے خیال سے آخر کار لونڈی پر عتاب نازل فرمایا۔ کیونکہ ایسے

بقیہ حاکشیہ صفحہ ۱۰۷۔ ایک ایسے جو لاہر لکھتے تھے شادی کر لی اور ان کے بہرہ مند ستائیس بیان و بارہ برس تک بہرہ لارچہ خود بہرہ دازاج سے بچائے ہیں جو نہ ناسازی طبیعت وہ انگشتان واپس گیس لکس پھر وہاں سے نہ ہیں۔

مشرقیں جہان صد بانڈیاں پیش خدمتیں۔ اما میں۔ اہلیں۔ ملازم تھیں یہ بات ضروری تھی کہ  
 اُسکو کوئی ایسی تعزیر دیجاتی جس سے دوسروں پر رعب جم جاتا اور ہر ایک اپنے مرتبہ کو پہچان  
 حد سے بڑھنے کی جرأت نہ کر سکتی۔ لہذا انھوں نے چاندی کی ایک موٹی زنجیر بنوائی اور یہ کم دیکھا کہ  
 دن میں چند گھنٹوں کی واسطے اسی زنجیر سے باز کر پٹنگ پر ڈال دیا یا کرے۔ تاکہ سب لوگ دیکھیں اور عرت  
 پرکھیں پٹنگ پر پڑا رہنا تو ہرگز کوئی سزا نہ تھی کیونکہ یہ تو خود خدا سے جانتی تھی۔ مگر زنجیر میں جکڑے ہوئے  
 بیدست دپائی کے ساتھ سزا یافتہ اور مجرم کی صورت سے پراہونا اور بچشموں کے واسطے حس و تشنّیج کا  
 موقع پیدا ہونا البتہ یہ ایسی ترکیب تھی جس سے بہت جلد اُس کا نشہ اتر گیا۔

میں صاحب نے پھر بھی تصویر کا نہایت روشن رخ ناظرین کو دکھایا ہی اور مرحلوں میں ہوتا ہی کرتا رہی  
 کا پہلو انکی نظر دھنسے گزرا ہی نہیں۔ ایسی حالت ہیں کہ لوندی نہ اس قدر بچنے سے گھر میں بانی گئی جو نہ  
 کچھ ایسی خوبصورت اور طردار ہو کہ صاحب خانہ کا دل تیرنگا دے دوسار کرے بلکہ برخلاف اسکے کیشہ  
 کرے نظر اور بصورت ہو مگر صاحب خانہ کو اسکی پرواہ بھی نہیں ہوتی کہ اُس پر کس قسم کی اور کس حد تک سزائیں  
 سختی کیجاتی ہو۔ اور ایسی فرشتہ خصلت بیباں بھی بہت شاذ ہیں کہ جو عتاب و عقاب میں اتنی نرم دلی مرن  
 کریں کہ باندھین بھی تو چاندی کی زنجیر سے کچھ شک نہیں کہ بعض اوقات رشک و حسد کا جب حملہ  
 بولتا ہے تو ظلم و تعدی کی کوئی انتہا نہیں رہتی اور اُس وقت اگر کسی میں حسن صورت بھی ہاں درجے  
 کا وجود ہو جسکا ذکر میں صاحب نے اپنی داستان میں بیان کیا ہے لیکن اسکی سفارش پر بھی رحم نہیں آتا پھر  
 جو بیباں قدرتی طور سے تیز مزاج اور تند خو ہوتی ہیں انکو تو ادنیٰ سے اشتعال طبع پر سخت سے سخت ظلم  
 کرنے میں کچھ باک نہیں ہوتا۔ اور ان حالتوں میں جو کچھ سختیاں اور کٹھنیں لوندیوں کو بھیلنا پڑتی ہیں وہ ناگفتہ  
 بہ ہیں مثلاً ابھی آٹھ ہی برس گزرا نہ ہوا کہ سارے کلکتے میں ایک مسلمان رئیس کے مظالم کی داستانوں سے  
 عجب طرح کا جوش نفرت و عداوت پیدا ہو گیا تھا اور ہر طرف سے ضد و عناد نفرتیں بند ہو گئی تھی جبلی آیت  
 یہ تھی کہ ان بیوی صاحبہ کی ایک لوندی نے اُنکی مرضی کے موافق گلے سے اٹکا تھا ابھی طرح نہیں بھرا  
 تھا۔ انھوں نے بار بار کھجا یا گروہ اپنی حرکت سے باز نہ آئی بالآخر بیوی صاحبہ کو غصہ چڑھ آیا انھوں  
 نے اور لوندیوں باندیوں کی مدد سے اس مقرب لوندی کو زین پر بچھاڑ کے تمام جسم پر چلتے چلتے  
 گلوں کی اتنی بارش کی کہ سارا بدن داغدار ہو گیا۔ جس سے اُس غریب کی یہ نوبت ہو گئی کہ  
 سارا بدن گالوں میں کوئے کو سپکا اور چال کی بوجھ لاکھوں بنا لیتے ہیں اور تباہ کو ہر کسی کی نگ رکھتے ہیں بدن دیکھوں کو  
 گلے سے لیتی۔

خود اُسکی ساتھ والیوں کو اُسپر ترس گئے۔ اور انجام یہ ہوا کہ اسی صدمہ سے بعد چندے وہ دنیا سے چل بسی۔ اس واقعے کی اطلاع پولیس کو ہوئی۔ مقدمے کی تحقیقات ہوئی۔ اور بیوی صاحبہ کو قید دوام عبور در دیہ شہر کی سزا دی گئی۔ اگرچہ دوران تحقیقات میں بیوی صاحبہ پر وہ نفسی نبی رہیں۔ لیکن حکم سزا صادر ہونے کے بعد اُنکو بے نقاب ہونا پڑا اور اُسوقت جو نامہ نگاران اخبارات موجود تھے وہ اُنکا حسن احوال دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ کچھ غلط فہم نہیں اس صورت کی تصویر اُناریں جس ہی ایسا حال فریب تھا۔

بیشک میں خود اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ باوجودیکہ میں ایک عرصے تک امرائے گھنٹہ سے ملاحظہ رہا مگر میں نے اپنے پورے زمانہ قیام گھنٹہ میں کبھی ونڈیوں کے ساتھ ایسے ظلم و بدعت کی کوئی داستان نہیں سنی۔ البتہ گھنٹہ میں سانپ مارنے یا اور کسی طرح کی ذلت دینے کی سزا لوڈی غلام دونوں کے واسطے راج تھی۔ لیکن اُن مظالم کی کہیں چھانٹوں بھی نہ تھی۔ جو اگر مسٹر اسٹو کے بیانات سمجھ میں تو امریکہ میں راج تھے۔

خواہ اسبوجہ سے کہ مجھے بالذات خواجہ سراؤں سے بہت نفرت تھی یا اسبوجہ سے کہ میں نے انکی بابت جو روایتیں حکایتیں سنی تھیں اُن سے میرے دل میں کچھ تعصب پیدا ہو گیا تھا بہر حال کسی وجہ سے مجھے اسوقت کہ جب میں گھنٹہ میں تھا اور اب بھی اسبات کا پورا یقین ہو کہ حرم شاہی میں اکثر مظالم کے بانی یہی کنجٹ خواجہ سرا ہوتے تھے۔ انھیں کے ہاتھوں عورتیں سزا پاتی تھیں اور یہی لوگ اس طرح پرانے ڈکے چھپوے توڑتے اور حوصلہ نکالتے تھے۔ کیونکہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کو اس جلادی کی خدمت میں کچھ بڑا مز ملتا ہی۔

لوڈیوں کی طرح خواجہ سرا بھی اکثر مسلمان امراء گھنٹہ کے محلات میں ہوتے تھے۔ اور حرم سراے شاہی میں تو کم از کم ڈیڑھ سو خواجہ سرا تھے۔ ان سب کا افسر بادشاہ یکم صاحبہ (جو دہلی کی شہزادی تھیں) کی ڈیوٹی پر متعین رہتا تھا اور ملک اور در میں یہ شخص بھی بڑے پایہ کا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ ان خواجہ سراؤں کی اصل یہ ہو کہ بعض لوگ اُنکو بچپن ہی میں چور ملاتے ہیں اور انکو امرائے دولت کے ہاتھوں بیچ ڈالتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے خدا، ندان نعمت کے مزاج میں بڑا دروغ پیدا کر لیتے ہیں اور مشیر و مستر علیہ جو جالتے ہیں۔ مسٹر سن علی گھنٹی ہیں کہ ان لوگوں کو خاص حقوق حاصل ہوتے ہیں اور بہت سے دیگر ملازمین کے اُنکے ساتھ مخصوص طور کی مراعات کی جاتی ہیں۔ اور ان لوگوں کو ہر وقت اور ہر حالت میں زانچا نہیں داخل ہونے کی علم اجازت ہوتی ہے۔ حرم سراے شاہی میں ملکات کے شکار کے لیے کی خدمت

یہ لوگ عورتوں سے بھی زیادہ ابھی طرح انجام دیتے ہیں۔“

سلطنت اور ہمیں اکثر خواجہ سرا خدات جلیلہ پر ممتاز رہے ہیں۔ اور انہوں نے محاصل ملک کی تحصیل و حاصل و اہم امور سلطنت کے انصرام اور پیچیدہ مراسلات و معاملات کا باحسن و جودہ سرانجام کیا ہے۔ چنانچہ شب ہر صاحب انھیں خواجہ سراؤں میں سے ایک کی نسبت لگتے ہیں کہ ایک بار بادشاہ وقت اس کے مکان پر تشریف لگے تو اس نے دہل لاکھ روپے کا ایک تخت بنوایا اور بادشاہ کو اُس پر بٹھایا اور پھر وہی تخت پیش کر دیا۔

شرح مھدی کی رو سے غلام بالکل آفاقی ملک ہے۔ اور جمال و متاع وہ فراہم کرے وہ بھی آفاقی ہی کی ملک ہے۔ اسی اصول پر خواجہ سرا لوگ اپنی زندگی میں جو کچھ دولت جمع کرتے ہیں وہ اُن کے مرنے پر اُنکے خدا و اذن لغت کو مل جاتی ہے۔ چنانچہ یہی قبیحہ ہے کہ خواجہ سراؤں اور لڑکی غلاموں پر بے انتہا زبردستی ہوتی ہے اور ان کے گھر میں نفائیس جواہرات اور ملبوسات گرانبہا کے ٹھیکہ لگائے جاتے ہیں کیونکہ آقاے ولی نعمت یہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ تو ایک امانت رکھائی جاتی ہے۔ کہ جو ایک مدت کے واسطے ایک شخص کے پاس رہے گی۔ اُس کے بعد اُس کا کوئی والی وارث تو بجز ہمارے ہے نہیں ہیں کو بچہ واپس بل جائیگی۔ ہم سب کو تو یہ بھی قانونی اختیار نہیں کہ کسی کو ہمہ کر سکے۔ میں نے سنا ہے کہ ایک مرتبہ یہ اتفاق پیش آیا کہ ایک امیر کبیر خواجہ سرا نے نظامت یا چکلہ داری کی حالت میں بہت بڑی اٹلاک پیدا کی اور مرتے وقت کچھ لوگوں کے نام ساری جائیداد کا وصیت نامہ بھی کر دیا۔ جب وہ مر گیا تو ان ورثانے بے تامل سارے اثاثے پر قبضہ و تصرف شروع کر دیا۔ لیکن جیسے ہی اس کا پرچہ بادشاہ کے حضور میں گزارا وہاں سے فوراً حکم ہوا کہ یہ سب تو نزول سرکار ہونا چاہیئے۔ کیونکہ بجز بادشاہ کے اور کسی کو اس جائیداد پر کوئی حق ہی نہیں پہونچتا تو جیسے بھی گئیں کہ جاسکے اُس پر دستبرد قبضہ کریں۔ لیکن ورثا قاضی نے اُسے بے اثر مقابل کیا اور بڑی بہادری سے اُسے۔ اُس کا پرچہ جدال و قتال سکے بعد یہ ثابت ہو چکی کہ بادشاہی قبضہ جائیداد پر ہوا۔ پھر تھوڑی سی سختی کرنے سے وہ سب دینے اور خزانے بھی معلوم ہو گئے۔ پھر اُن پر انہی سے سچ رہے تھے۔ اور اس ساری کارروائی میں ان قانون کی متابعت حقائق کے مطابق ہوتی ہے۔ ان حقائق کو ایک جہہ نہ دیکھا اور جو کچھ نقد و جنس تقاسب داخل خزانہ سلطنت ہو گیا۔

اس جہہ دینے والے ہوتے ہیں وہ سیر خشی۔ سخاوت۔ دریا دلی کے جو شر میں دیتے ہیں۔ ان کو یہ پرہیزی کی کینہ منظر لکھنا نہیں ہوتی۔ مترجم

فی الحقیقت باشندگان اور حرام قسم کے مناقشات و مشاجرات کے ایسے ہو کر ہو گئے ہیں کہ ذرا ذرا سی بات میں جدال و قتال کر بیٹھا ہو یا مرغوب طبع ہو گیا ہو۔ خیر۔ بس سے اتنا تو فائدہ ہوتا ہو گا کہ ہتھیاروں میں رنگ نہ لگنے پاتا ہو گا۔

میں نے حرم سلطانی کے بردہ کی لوازم اور سامان اپنے نوٹریوں۔ غلاموں۔ اور خواجہ سداون کے حالات بیان کرنے میں بہت وقت صرف کیا اب پردہ اٹھا کر ذرا اندر کی بھی سیر کرنا چاہیے۔ امید تو ہے کہ بہت سی لیڈیاں میرے ساتھ چلیں گی۔

محلات شاہی کے زمانہ مکانات بلحاظ تعمیر مردانہ مکانات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہیں نہ ان کے طرز میں بہت بڑا فرق ہے۔ معمولی طور پر ہندوستانی مجلس اربعہ قریب قریب اس قطع کی ہوتی ہے کہ ایک مربع عمارت ہوتی ہے جس کے چاروں طرف مربع یا مستطیل دالان ہوتے ہیں۔ آگے غلام گردنش ہوتی ہے۔ غلام گردنش کے سامنے چو ترہ۔ چو ترہ کے نیچے صحن۔ اگر مکان دو منزلہ ہوتا ہو تو باہر کی طرف اوپر کے درجن میں برآمدے نکال دیے جاتے ہیں۔ اور چاروں طرف چھتویر عمارتیں بنا دی جاتی ہیں جن میں کشادہ کشادہ کمرے ہوتے ہیں۔ نیچے کے مکانات عموماً صحن سے دو تین زینے اوپر بلند ہوتے ہیں۔ یہ بڑے بڑے دالان ہوتے ہیں جن کے پہلوؤں میں کوٹھریاں چھتیاں ہوتی ہیں۔ کوٹھریوں میں کدیاں لگے ہوتے ہیں اور انھیں میں اثاثہ البیت۔ کپڑے۔ زیور۔ اور قیمتی اشیاء جو زردہ کے کام نہیں آتیں رکھی جاتی ہیں۔ اگرچہ زیور و میں لوگ قعب کرینگے مگر ان دالانوں میں کواٹھ نہیں ہوتے صرف درجنوں پرست پڑے ہوتے ہیں یا اوٹیں رکھو بیجاتی ہیں۔ اور یہی وجہ تسمیہ ہے ہندوستانی عورتوں کے پردہ پوشی کہلانے کی۔ یعنی یہ لوگ عام نگاہوں سے پوشیدہ اور خلوت گز میں رہتی ہیں۔ اور بجز قریب دروں کے کوئی نامحرم انھیں دیکھ بھی نہیں سکتا۔ چنانچہ جب یہ عورتیں کسی سواری میں باہر نکلتی ہیں تب بھی پردے کے اندر رہتی ہیں اور ایسا سنگین پردہ ہوتا ہے کہ اندر سے کوئی شے باہر کی نظر نہیں آ سکتی۔ یہ پردہ صرف مردوں سے کیا جاتا ہے۔ عورتیں چاہے کسی قوم و ملت کی ہوں یہ روک روک غلط کر سکتی ہیں۔ ان پردہ نشینوں کو جب کبھی کہنی کی کسی عدالت میں بحیثیت فریق مقدمہ گواہ بننے کے اتفاق ہوتا ہے تب بھی عدالت کے کمرے میں اپنی بالکی کے اندر بیٹھ کر وہ آتی ہیں۔ البتہ یہی صورت میں انکا کوئی ملازم خاص یا قریبی عزیز آ کے شناخت اور تصدیق کر دیتا ہے اور وہ پردے کی آڑ سے جو کچھ کہتا ہوتا ہے کسی میں سچ یا جھوٹ۔ ملوم یا صفت کوئی انھیں دیکھ نہیں سکتا۔ ہر سوال کا جواب پردے کے اندر سے آتا ہے۔ آواز باہر نکلتی ہے مگر جس منہ سے آواز نکلتی ہے وہ نظروں سے پوشیدہ

جی رہتا ہو۔ اگرچہ اولے شہادت کا یہ طریقہ ایسا ہو جس سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں لیکن اس معاملے میں گورنمنٹ ہند ہرگز قابل الزام نہیں کیونکہ لمحاظ مراسم و معاشرت اہل ہند پر وہ ایک لازمی قانون ہو جسکی خلاف ورزی ہو نہیں سکتی۔ کیونکہ ملکی خصوصیات میں دست اندازی کسی نہج سے قرین مصلحت نہیں۔

گرمی کے موسم میں حرم کی عورتیں اکثر محسن میں نشست رکھتی ہیں۔ اور وہیں صحبت جمتی ہو محسن میں ایک شہنی تان دیجاتی ہو اور اُس کے نیچے فرش بچھا ہوتا ہو۔ محل کی خاتون بیچ میں تخت یا مسند پر بیٹھتی ہو اور جو کوئی اُس سے ملنے آتی ہو وہیں سلام کو حاضر ہوتی ہو۔ یہ خاتون صرف اپنے سے عمر اوپر نہ ہو یا زیادہ ذی مرتبہ عورت کی آمد پر یا کسی مرد رشتہ دار کو آئے دیکھنے اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑی ہوتی ہو۔ کیونکہ مرد ذات کی افسری کی اصلی شان و شوکت صرف بلا و مشرق ہی میں نظر آتی ہو۔ اور انھیں ممالک میں وہ افسر اور حاکم وقت سب کچھ معلوم ہوتا ہو۔ عورتیں بھی اُسے طبقہ اعلیٰ کی مخلوق سمجھتی ہیں اور اُسکی باتوں کو اس طرح کان دھر کے سنتی ہیں جیسے ولایت میں لڑکے اپنی گردن جھٹکے اپنے ماں باپ کے احکام ملتے ہیں۔ اُن کے ہر قول و فعل کو واجب العمل اور قابل تقلید جانتے ہیں اور اُن کے متسام خیالات اور باتوں کو عقل و نقل سے درست اور لغزش و خطا سے پاک سمجھتے ہیں۔ غالباً میری اس تحریر کو پڑھ کے ایک انگریزی عورت بے تامل کہ اُٹھکی کو "یہ بالکل غیر ممکن ہو" اور یہ عورتیں مرد و عورتوں فریب دیتی ہوگی۔ اور بظاہر اطاعت و انقیاد دکھانیکو ساری کارروائیاں کرتی ہوں گی۔ لیکن میں اُن سے صرف اسی قدر کہنو نکاح ذرا تھوڑی دیر کے واسطے تم یہ فرض کرو کہ تم نے ایسے لوگوں میں پیدا ہو کے پرورش اور تعلیم پائی ہو کہ جنکے ہاں لڑکی پیدا ہوتی ہو تو سب لوگ منہ تھو تھالیتے اور جسمانی سمجھتے ہیں اور لڑکا پیدا ہوتا ہو تو ہر شخص کی باچھیں ٹھلجاتی ہیں۔ مبارک سلامت کا غلغلہ بلند ہوتا اور خوش غیبی کی علامت سمجھا جاتا ہے اور پھر اس بات پر غور کرو کہ میں کچھ لکھتا ہوں وہ صحیح ہو سکتا ہے یا نہیں۔ بیشک وہ اس کی صحت کو تسلیم کرے گی اگرچہ اس حالت کو قابل فحش سمجھ سکی گی یہ عورتیں جو ہمارے نزدیک نہایت قناعت سے بسر کرنے والی۔ غرض مزاجی سے زندگی کے دن کاٹنے والے قیدیوں سے زیادہ نہیں ہوتیں فطرت اور آفرینش کے تہم و لر با مناظر سے بالکل نا بینا ہوتی ہیں۔ اُن کو کبھی دریاؤں اور کُستاروں کی چھاؤں دیکھنے کو نہیں ملتی۔ اُن کی نگاہیں باغ و بوستان اور لہلہاتے مرغزاروں کی میر سے کبھی آشنا نہیں ہوتیں وہ کھلے میدانوں کی تازہ میو ہا بر سے بھرے کھیتوں کی نظر فریب ہمار کی قدرت نہیں جانتیں۔

ایک یورپین لیڈی کا بیان ہو کہ اُس نے انہیں سے اکثر کی زبان سے بیساختہ بہ جملے سنے ہیں کہ ”کیوں جی۔ یہ کیسے پیارے پھول ہیں۔ میں کہتی ہوں جس جگہ ان پھولوں کے چمن کے چمن کھلے چمکے وہاں کیسی کچھ بہار ہوتی ہوگی“ انہیں لیڈی صاحبہ کا یہ بھی بیان ہو کہ اکثروں نے اُسے بڑی حیرت و استعجاب سے یہ سوال کیے کہ ”کیوں صاحب یہ تو بتائیے یہ پھول اُنکے کیونکر ہیں اور جب درخت میں ہوتے ہیں تو کیسے بچلے معلوم ہوتے ہیں۔“

جب محلی کی خاتون اپنی ملاقاتیوں سے والان کے اندر ملتی ہو تو بیچ کے درمیں ایک ستون سے ملا کے اُسکا گانہ دیکھ دیا جاتا ہو۔ اور اُسکے نیچے مسند بچھا دیا جاتا ہو۔ اُسی پر وہ بیٹھتی ہو۔ اس مسند پر اُسکے سوا اور کوئی نہیں بیٹھ سکتا مسند عموماً محل یا ریشمی کپڑے کا ہوتا ہو۔ جیسپر زردوزی کام ہوتا ہو یا کھوناب زربفت کا۔ اور اُسکے نیچے ایک نفیس قالین بچھا دیا جاتا ہو۔ جو قریب دو گز مربع کے ہوتا ہو۔ اسی مسند اور قالین کی حیثیت سے صاحب خانہ کے مرتبہ و شان کا اندازہ کیا جاتا ہو۔ چنانچہ حرم شاہی میں عموماً مسند زربفت کی ہوتی تھی اور اُسکے گرد بھاری کلاہ تونی جھال ٹنگی ہوتی تھی مسند پر دو چھوٹی ٹکیلیاں بھی دونوں پہلوؤں میں رکھ دی جاتی ہیں تاکہ زانو توڑ کے بیٹھنے میں یہ ٹکیلیاں زانو کے نیچے رہیں۔

اگر کوئی صاحب خانہ اپنے کسی مہمان عورت کو اپنی مسند پر بٹھا لیتی ہو تو اس سے یہی سمجھا جاتا ہو کہ یا تو یہ عورت مرتبہ میں اُس کے مساوی ہو یا یہ کہ میزبان نے غایت درجہ اخلاق و تواضع کا برتاؤ کیا ہو۔ اور اگر مہمان میزبان سے مرتبہ میں بہت بلند ہوتی ہو تو میزبان بالکل گارو سے عاجز و ہمدرد کے مہمان کو اُسپر بٹھا دیتی ہو۔ اور آپ گوسٹ مسند پر بیٹھ جاتی ہو۔ کیونکہ درانحالیکہ قالین نہ کسی کو جگہ دیدینا اُسکے واسطے باعث اعزاز و افتخار ہو تو مسند چھوڑ دینا تو بہت ہی ٹپسے اعزاز و تکریم کی علامت ہونا چاہیے۔

اگرچہ ہندوستانی خاتونیں شیشہ آلات کا رواج عام نہیں ہے لیکن حرم شاہی میں بڑے بڑے جھارٹانوس بکثرت تھے۔ یہ ایجاد صرف انصاریہ الدین حیدر نے کی تھی ورنہ اُسکے والد غازی الدین حیدر نے اگرچہ اپنے مکانات کی سجاوٹ کا بہت کچھ سامان کیا تھا انوساگوان خیر و شوق بھی بہت تھا لیکن انھوں نے جھارٹانول صرف امام باڑے اور اپنے رہنے کے مکانات ہی پر ہی مقصود رکھے تھے۔



بادشاہ کے جتنے محل تھے سب کی ڈیوڑھیاں الگ الگ تھیں۔ اور ہر ایک محل میں ملاقات کے کمرے (خلوت خانہ) والاں اور مسندیں علیحدہ علیحدہ تھیں۔ باوجودیکہ ان محلات میں اکثر ایسے تھے جنکو بادشاہ سلامت کی زیارت مینے میں ایک بار بھی نصیب نہ ہوتی تھی لیکن پھر بھی بادشاہ کی محل تو ضرور ہی تھیں اور مجھے بہت تحقیق معلوم ہوا کہ اگرچہ انکو اس بات کا یقین بھی ہو جاتا تھا کہ انکی بعض خواصوں پر بادشاہ کی نظر ہو اور بادشاہ ان سے اخلاط کرتے ہیں لیکن انکو اس پر مطلق اعتقاد نہ ہوتا تھا۔ چاہے خواص کتنی ہی منہ لگی ہو جائے اور بیگم صاحبہ کتنی ہی نگاہ سے گر جائیں پھر بھی جب تک حرم میں دونوں رہتی تھیں خواص خاص ہی نہیں جاتی تھی اور بیگم بیگم ہی۔ اور اس بارے میں خود بادشاہ سلامت نے بھی کبھی دست اندازی نہیں کی نہ تبدیل قراب کا کچھ خیال کیا۔

اعلیٰ درجے کی بیگمات شاہی کے لباس دیکھنے کا بھی مجھے با۔ با موقع ملا۔ صرف انھیں عورتوں کا لباس نہیں جو دروازہ خاص کیوقت حاضر باش رہتی تھیں۔ اگرچہ یہ عورتیں بھی نہایت حسین اور طر حدار ہوتی تھیں۔ شباب میں بھری ہوئی اور اسٹلہ رے کی پوشاکوں سے دلنشین ہوتی اور انکی بابت یہ حکم تھا کہ کوئی نظر ہرے انکی طرف نہ دیکھے کیونکہ بادشاہ کے نزدیک وہ بھی پردہ نشینوں ہی میں شمار کی جاتی تھیں اور انکی طرف منگی لگانا اور برابر دیکھنا داخل گستاخی و بدتمیزی تھا۔ مگر پھر بھی ہم لوگ انکو دیکھ سکتے تھے۔ اور دیکھتے ہی تھے بلکہ ہر خواص بیگمات کے پنا دے دیکھنے کا بھی اتفاق اکثر ہوا۔ کیونکہ بادشاہ سلامت کا یہ معمولی مذاق تھا کہ اکثر اوقات جب حمام سے برآمد ہوتے تو اس زمانے میں جن بیگم صاحبہ پر نظر عنایت ہوتی ان سے لباس تبدیل کر لیتے۔ اپنا لباس انھیں پہناتے ہیں اور انکی پوشاک آپ پہنتے۔ اور وہی پوشاک پہنے ہوئے باہر ہلوگوں کے سامنے نکل آتے بعض دفعہ یہ بھی اتفاق ہوا کہ رات کے وقت وہ اکثر اس گچھ کے پردے کے اندر چلے جاتے جو کھانے کے کمرے کے ایک سرے پر پڑا ہوا تھا۔ جسکا ذکر میں کر چکا ہوں اور وہ بیگم نے ہوسے برآمد ہوتے۔

مکن ہو کہ جب لباس وہ پہنتے آتے ہوں اسکا ساز و سامان کچھ مختلف اور اس کے پہننے کا انداز بھی اور ہوتا ہو لیکن کپڑے سب وہی ہوتے تھے اور جب بادشاہ پہنتے تھے تو بالکل بیگم ہی معلوم ہوتے تھے۔ اس لباس میں پانچا۔ ساٹن کجواب یا کسی اور نفیس ریشمی کپڑے کا ہوتا۔ مگر کوئی بھنسا بھنسا لیکن نیچے پونچکے خوب پھیلا ہوا۔ بڑے بڑے پائچے ڈھیر کے ڈھیر کبھی آگے زمین پر

پڑے ہوئے کبھی نہیں گرہ لگی ہوتی۔ کبھی ٹانگوں کے پچھے دو رنگ فرش کو زیب دیتے ہوئے کبھی کمر میں کھونٹے ہوئے اور ان پر دو پہلی سنہری پٹیاں لگی ہوتی۔ سامنے کی طرف زرتار انداز بندھتا۔ اُسکے چنڈے نانا پر پڑے ہوئے۔ جگہ جگہ پر کمر بندوں میں جو اہرات اور موتی ٹٹکے ہوئے ان پانچاؤں کا کمر پرچست اور پٹی سے کسا کوئی نہیں باہل پھنسا پھنسا ہوتا اور آگے بند رہتی پھیلتے جانا عجیب قدر ڈھاتا تھا سینے پر محرم یا سینہ بند اکثر کسی نازک ہلکے کپڑے کی ہوتی تھی۔ جیسے جالی۔ گاج یا باریک مل کی محرم سے سینے کا اُبھار پوری طرح سے نظر آتا تھا۔ کیونکہ جس قدر زیادہ باریک کپڑے کی بنائی جاتی تھی اتنی ہی نفاست مذاق ظاہر ہوتی تھی۔ یہی پوشش عام ہندوستانی عورت کی ہو۔ سلی سلائی اور قطع برید اور سجادے میں ڈھری دستکاری صرف کیجاتی ہو اُسکے گرد گولہاں سے لیکر نیچے تک اور گولہاں میں۔ بیل بیل سے ستارے کا نہایت نازک کام بنا ہوتا تھا۔ محرم پر ایک کرتی کر تک ہوتی تھی۔ یہ اکثر جالی کی ہوتی تھی۔ اگرچہ کرتی اوپر سے پہنی جاتی تھی لیکن اس سے محرم کا جو بن۔ زینورات کی کاپ کتاب دنیفہ اور شبی کا حسن ہرگز چھپ نہ سکتا تھا۔ سب چیزیں ہو ہو نظر آتی تھیں اور ان پر کرتی کا زرق برق مصالحو اور بھی روپ دکھاتا تھا۔ اس پر شاگ پر ایک ہلکا سا دوپٹہ بھی اوڑھا جاتا تھا۔ دوپٹے اکثر سنہری روپلی بادلوں کے ہوتے تھے حمل میں انگریزی پنگ کی چادر کے برابر عرض میں اُس سے کم۔ ڈھاکے کی ٹلس کے بھی دوپٹے بنتے ہیں لیکن ان پر بہت بھاری کامدانی کرطی ہوتی ہو۔ اور پھر نہایت بھاری بھاری آئینے پلو بھی ان پر چڑھائے جاتے ہیں۔ یہ دوپٹے سر پہنے کی طرف پڑا ہوتا ہو۔ اور دونوں شانوں پر اُسکے آئینے لیے جاتے ہیں۔ اُسکے اوڑھنے کی وجہ ایسی پیاری ہوتی ہو کہ بد صورت سے بد صورت عورت بھی اوڑھ لیتی ہو تو پری معلوم ہوتی ہو۔ چہ جائیکہ جو عورت خود ہی پر بیکال ہو۔ اُسکے حسن میں تو اور چار چاند لگ جاتے ہیں۔ کھڑے ہوئی حالت میں اُسکے اوڑھنے کی یہ ادا ہوتی ہو کہ ایک طرف آئینے لیکے اوپر کا جسم چھپا لیا جاتا ہو اور پھر دوسری آئینے کے شانے پر ڈال دیا جاتا ہو لیکن بیٹھنے کے وقت دونوں پہنے نہیں پر یا گود میں سیٹ کے رکھ لیے ہیں۔ کبھی کبھی ایسی حالت میں دوپٹے شانوں سے اتر بھی جاتا ہو۔ لیکن گھر کی ڈھری پڑھیاں اس ادا کو ہمیشہ ناپسند کرتی ہیں۔ لہذا اسے بد وضع اور بزداری عورتوں کی بدعت سمجھتی ہیں اور منع کرتی ہیں چنانچہ یہ وضع عام طور سے مرغوب و پسندیدہ نہیں ہو۔

اب فرما اپنے منجملہ میں ایک ایسی عورت کا نقشہ جائیے۔ جسکا پونسا قد ہو۔ کھٹلا چوڑا

گہواں رنگ ہو۔ ہاتھ کی ہتھیلیاں۔ انگلیوں کے پورا و ناخن سب ہندی کے رنگ سے  
 گھنا رہیں۔ نوکدار جوتہ پہنے ہوئے ہو۔ آنکھیں ایک تو دہنی شریلی نشیلی ہیں اسپر سرنگین  
 ہو کے اور بھی ترنگس جادو لگتی ہیں۔ ابرو کے بال اس احتیاط سے برابر جائے لگے ہیں کہ کھیں  
 اونچا نیچا معلوم نہیں ہوتا۔ پورے قوس کی شکل بنی ہوئی کڑی کمان کی طرح تنی ہوئی چکنی مٹنی  
 بلند پیشانی اور کتانی چہرے پر کالے بالوں کی لٹیں چنبیلی کے عطر میں مکتی ہوئی کچھ تو سامنے  
 طبری ہیں اور باقی جو موافق کے چہچوں میں آگئی ہیں وہ چوٹی جتنے پشت پر لہرا رہی ہیں۔ کانوں کے  
 کنارے چھوٹی چھوٹی طرح بایاں بائیں طرح کی تنگ سی ہیں ناک میں بڑی سی تھوہو۔ جس میں دو چکرار  
 موتیوں کے بیچ میں ایک یا قوت پڑا ہو۔ خیال کرو کہ اس شکل و صورت کی عورت اس سج و معج  
 اور بناؤ سنگار کے ساتھ نہایت فریب ناز و کرشمہ کے انداز سے اوپر کا جسم باریک  
 دوپٹے سے نیم والا درنیچے کا جسم ایک ذرق برق رنگین جامے سے پہنا کر کے ہوئے  
 تھارے سامنے کھڑی ہو اب تمھاری آنکھیں کامل ہو تو یقیناً دربار اور دھڑ کی ایک بیگم کا  
 نقشہ تمھاری نظروں کے سامنے پھر جائیگا۔

لکھنؤ میں جلوس کے ساتھ سیگت کی سواریاں آئے دن نہیں نکلا کرتی تھیں۔ ہاں البتہ  
 جب کسی متبرک مقام کی زیارت کرنا یا کسی گیم کو اولاد کی تمنائیں کسی ایسی مسجد میں جا کے منت  
 ماننا ہوتی تھی جو شہر سے فاصلے پر ہوتی تھی تو اس وقت سواری کا تزک و احتشام قابل دید ہوتا تھا  
 سیگت شاہی کے جلوس میں کچھ باہر گرما یا لاتیار نہ ہوتا تھا۔ بلکہ سب کا جلوس یکساں ہوتا تھا۔  
 البتہ بادشاہ بیگم کے واسطے فوجت ڈھارہ باہی مراتب۔ چتر زرنگار اور سایہ بان جسے آفتاب  
 کہتے تھے مخصوص تھا۔

اچھا اب ذرا بادشاہ بیگم صاحبہ کی سواری کا تزک و احتشام دیکھنا چاہیے کہ وہ درگاہ جاتی تھیں  
 تو کس شان سے جاتی تھیں۔ ان کی سواری کے آگے سب سے پہلے بادشاہی گاڑی کے کچھ سواری  
 جنگلی نیلی رنگ کی وردیوں پر روپلا کام زرد و زری بنا ہوا تھا۔ جھنڈیاں ہوا میں اڑاتے  
 بنڈ باجہ سجاتے نکلتے تھے۔ ان کے بعد دو پٹنیں پیدلوں کی یہ بھی جھنڈی اور باجے کے ساتھ  
 ان کے بعد ٹم ہاروں کی ایک کپنی جنگلی دریاں سفید اور ٹم بھی چاندی کے ہوتے تھے  
 اور جو پیدل پٹنوں کی ارغواں رنگ کی وردیوں کے مقابلے میں بہت ہی خوشنام معلوم ہوتی  
 تھیں۔ ان کے بعد کچھ لوگ سفید لباس پہنے۔ نفرنی جھنڈیاں ہاتھوں میں لیے نکلتے تھے ان کی

جھنڈیاں لکھنی (مثلث) ہوتی تھیں اور ان پر سلطنت اور دھکا شاہی معرکہ کڑا ہوتا تھا۔ ان جھنڈیوں پر داروں کے بعد ہی ایک بند سوار سی لکھتی تھی جس میں بادشاہ بیگم صاحبہ ہوتی تھیں۔ یہ سوار سی ایک برسے صندوق کے قطع کی ہوتی تھی۔ جبہ چاندی منڈھی ہوتی تھی اور اوپر سے ایک مغرق پوشش بھی پڑی ہوتی تھی۔ اور میں کمار اسکو اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوتے تھے۔ جو چارم حصہ میل کے فاصلے پر بدلتے رہتے تھے۔ یہ کمار سفید جبت لباس پہنتے ہوتے تھے۔ اور اوپر سے ڈھیلی ڈھیلی قبائیں گھار رنگ اور کار جو بی کام کی۔ انکی سرخ سرخ پگڑیوں میں پھری رہی پھلیاں لٹکی ہوتی تھیں اور ان پھلیوں میں طلائی زنجیریں اور بھندے بڑے ہوتے تھے جو شانے تک ٹٹکتے تھے۔ کماروں کے پیچھے مہراں ہوتی تھیں۔ جن کی خدمت اسی قدر تھی کہ کماروں سے ڈولا لیکو درگاہ کے اندر پہنچا دیں۔ انکے پیچھے ایک جم غفیر طلائی اور نقری عصا برداروں جو بداروں کا ہوتا تھا۔ یہ لوگ بیگم صاحبہ کے نام اور خطاب کا ذکر کا بولتے چلتے تھے اور یہی لوگ فقیر فقرا کو سوار سی کے قریب آنے سے روکتے رہتے تھے۔ کیونکہ لکھنؤ میں فقروں کا فرقہ ایسا نہیں جو کہ باستانی بٹایا جاسکے خصوصاً ایسے موقعوں پر جبکہ عام دستور یہ ہو کہ انکی طرف برابر روپیہ اختری پھینکتے جاتے ہیں اور ایک لٹس مچتی ہو۔ عصا برداروں کے بعد خواجہ سراؤں کا انسرا علیٰ رنواب ناظر جسکے اقتدارات و مراتب کا میں ذکر کر چکا ہوں اپنے ہاتھی پر سوار ہوا ہوتا تھا۔ ایسے موقع پر انکی پوشاک نہایت مغرق زرتارہ و جواہر نگار ہوتی تھی اس کے سر پر ایک نفیس جگمگاتا۔ شمشلہ کا تدمرے پرائے درجہ کا کشمیری دو شالہ ہوتا تھا اور بالکل ایک گڈے کی قطع ہوتی تھی۔

اب بیگم صاحبہ کی خواصوں اور پیش خدمتوں کی سواریاں لکھتی تھیں۔ ان میں کچھ ہالگیوں پر سوار ہوتی تھیں کچھ چندولوں پر اور کچھ رتھوں پر۔ ان سب کے ساتھ سپاہی۔ برق انداز۔ علم بڑا عصا بردار اور سوار سجدہ شمار ہوتے تھے۔ محل کی ان لگیوں خاتموں کی تعداد کبھی ڈیرہ سو سے کم نہ ہوتی بلکہ دوسو تک ہوتی تھی بعض لوگ بوجھ بیٹھیں گے کہ آخر ان لوگوں کا وہاں کیا کام تھا؟ اسکا جواب یہ ہو کہ ان کے متعلق بہتیری خدات تھیں۔ بعضوں کو داستان گوئی میں کمال حاصل تھا۔ اور سب طرح کی دلچسپ کہانیاں اور داستانیں بیاں کرتی تھیں۔ بعضی یاچی میں مشاق تھیں کہ جو ہر روز ہی خدمت انجام دیا کرتی تھیں مغلا نیاں تھیں جو سلائی کرتی تھیں۔ اگرچہ ہندوستان میں عورتوں کے کپڑے بھی مرد ہی پہنتے ہیں لیکن حرم شاہی میں یہ عورتیں ہی کرتی تھیں۔ بعضی مشاطگی کی خدمت پر مقرر تھیں اور بیگم صاحبہ کے بناؤ سنگھار میں باقاعدہ جاتی تھیں۔

اور بہتری قرار غواں ہوتی تھیں۔ اور بہتری خواہیں ایسی ہوتی تھیں کہ جو درحقیقت لونڈیاں ہوتی تھیں۔ مگر ان سے اوپر درری کے کام لیے جاتے تھے۔ یہ پیش خدمتیں اگرچہ کیسے ہی ادنیٰ درجے کے کام کرتی ہوں پھر بھی نا محرموں سے پوشیدہ اور بالکل پردے میں رہتے تھیں۔

اس شان و شکوہ۔ انہو کثیر اور بھیجہ شورغل کے ساتھ بادشاہ میگ صاحب کی سواری ایک متبرک مقام کی زیارت کیواسطے نکلا کرتی تھی۔ اور ناظرین! آپ یقین مانیں کہ خود میگ صاحب کو اپنی اس ٹھاٹھ ہاتھ کی کچھ کم پروانہ ہوتی تھی۔ اور انکی علوی شان کا جو آواز بلند ہوتا تھا وہ ان کے دل کو خوش کر دینے کو کافی ہوتا تھا۔ لیکن ہکوانے دماغوں سے انکی صحت بھلا دینا چاہیے۔

کیونکہ باوجود اس جاہ و حشم کے یہ بچاری واجب الرحم تھی۔ درانما لیکہ ان کی وقعت ایک بال و پر شکستہ مرغ زرین کی ایسی تھی۔ کیونکہ ہمارے نزدیک تو انگلستان کے کسی دوکاندار کی عورت جسکا شوہر یا ننداری سے کچھ کما تا ہوا اور جسکے پاس اپنا ذاتی مکان رہنے کو ہو اور دھکی بادشاہ میگ سے کہیں زیادہ خوشحال اور زیادہ مغزز ہے۔



## باب دہم

چھوٹے بڑے جانوروں کی لڑائیاں

دربارِ اودھ کے معمولی کھیل تماشوں میں سکھائے ہوئے پرندوں اور درندوں کی لڑائی کا چرچا بہت تھا۔ اور اسی غرض سے ہر قسم کے جانور پائے اور سکھائے سدھائے جاتے تھے۔ سب سے زیادہ تیر کی لڑائی حیرت انگیز ہوتی تھی۔ جہاں اس جانور کو چھ مارے دیے گئے اور وہ جٹ گیا اور بچوں اور چوچے سے حلقہ کرتے اور روکنے لگا۔ پھر اس قدر پامردی اور جرأت کے ساتھ لڑتا تھا کہ دیکھنے والے حیران و ششدر رہ جاتے تھے۔ خیر بادشاہ سلامت کو بھی تیر کی لڑائی بہت پسند تھی۔ یہ لڑائیاں عوامیوں ہو کر تھیں کہ کھانے کے بعد نیز بالکل صاف کر دی جاتی تھیں اور جانور نشہ پانی سے تیار ہو کر ”حصو رہی میں باریاب“ ہوتے تھے بادشاہ سلامت حسب دستور میز کے ایک جانب وسط میں اپنی زرنگار کرسی پر جلوہ افروز ہوتے تھے اور حکم دیتے تھے کہ نہال لڑائی شروع کرو۔ حکم ہوتے ہی دو مرغ لاکے میز پر سامنے کھڑے کر دیے جاتے تھے یہ دونوں آتے ہی آتے پہلے تو ہماری سب کی طرف غور سے دیکھتے اور اپنی اداوں سے یہ ظاہر کر سکتے تھے کہ ”آخر اس جلسے میں ہمارا کیا کام۔“ لہذا یہاں کیوں لائے ہیں۔ اب ایک مرغ نے گردن اٹھائے۔ گڑبڑوں کو ”آواز لگائی اور فوراً دوسرے نے صدائے بازگشت سنائی۔ دو ایک بار یہی سوال جواب ہوئے۔ لیکن ابھی دونوں میں سے کسی کے تیور نہیں بدلتے ہیں۔ آخر کار لوگوں نے ایک مرغی بھی دونوں مرغوں کے بیچ میں ٹھیک بادشاہ سلامت کے روبرو لاکے بٹھا دی۔ مرغی کے آتے ہی دونوں مرغ اپنی اپنی جگہ سے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے چلے کہ ذرا ان نیکیخت سے راہ و رسم پیدا کریں۔ اس وقت ان مرغوں کی رفتار کی وہی شان ہوتی تھی جیسے کوئی ترک مسجد یا زانا خانہ میں اکڑتا ہوا جاتا ہو۔

جب مرغی کی طرف دونوں بڑھتے ہیں اسی وقت سے ان کے تیور بگڑنا شروع ہو جاتے ہیں ایک کے پر پھول گئے۔ دوسرے کی گردن بلند ہو گئی۔ ایک نے ہانک لگائی۔ دوسرے نے ذرا زیادہ زور سے اسکا جواب دیا۔ بھاری مرغی سجائے خود حیران و پریشان کھڑی سیر دیکھ رہی ہو۔ آخر کار گتہم گتھا ہو گیا۔ یہ موقع غنیمت سمجھ کے وہ بھاری تو دبے پانوں کھسک گئی اور یہ دونوں جٹ گئے۔ اب بازو اٹھ گئے۔ کیس بھی بلند ہو گئے۔ پر پھول گئے۔ اور جو بچوں بچوں کی

رد و بدل بھی شروع ہو گئی۔ اسکے بعد صبیحی لات چلتی اور جس طرح کی چوچ بازی ہوتی ہی وہ بڑی دلچسپے قابل دید ہوتی جو۔ دونوں کی نگاہیں لڑی ہوئی۔ ایک ایک ادا پر آنکھیں گڑی ہوئی ہیں۔ گردنیں بلند ہیں۔ غیظ و غضب یا جوش انتقام سے پر بھوئے ہوئے ہیں۔ ٹانگیں بار بار اٹھتی اور لات رسید کر کے پھرنے پر آ جاتی ہیں۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی جانوں پریشانی ہوئی ہے اور ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہے۔ دھڑکے دھڑکی کے ساتھ ایک تھوڑا اکھسک جاتا ہے اور اپنے کو مفروض ثابت کرنے کے واسطے ذرا ٹھٹھک کے۔ بجاتا ہے۔ پھر بڑھ کے جٹ جاتا ہے۔ اور اس بتیابی و جوش سے حملہ کرتا ہے کہ جیسے دلیں ہی ٹھنی ہوئی ہے کہ بس حریف کے خون میں چوچ ڈبو کے دم لے اور فتح مندی کا سہرا منڈھ کے میدان سے نکلے۔

ادھر تو یہ جلدان اس طرح جی توڑے اور جان پر کھیل کے لڑ رہے ہیں ادھر مزے کے ارد گرد جتنے آدمی کھڑے ہیں سبکی نظریں انھیں پرچی ہوئی ہیں سبکی ہتھیں اسی پر مصروف ہیں کہ دیکھیں کون جیتتا کہ کسے ہاتھ بالا رہتا ہے۔ یہ لوگ موقع موقع سے دونوں کو داد دیتے جاتے ہیں کبھی اسکی تعریف کر کے جی بڑھا دیا۔ کبھی اُسکو بڑھا دے دیکے اور گر مایا۔ اور تو اور خود بادشاہ سلامت بھی جی جوش میں ہوتے تھے۔

آؤ کار۔ ایک مرتبہ دونوں جلفور اکا ہی وقت میں اڑتے ہیں اور مزے سے چند انچسہ کی بلندی پر متعلق ہوا میں تھک جاتے ہیں۔ ایک کے پنجے دوسرے کی رانوں۔ پٹھوں میں دبھننے ہوئے۔ دوسرے کی چوچ اُسکی آنکھ میں گڑی ہوئی۔ اب پر پنجے کے اڑنے اور زخموں سے خون کے شرار سے چھلنے لگے۔ دونوں کے بدن کو لہان ہو گئے اور یہ بخوبی آشکارا ہو گیا کہ یہ غالی جنگ اور گری نہ تھی کہ جو صرف تماشے کے طور پر تھا۔ لیکن تھی۔ اب نیند اکڑا۔ نا کھڑا ہوا ہے۔ بار بار لرزے بلند کرتا ہے۔ اور تماشائی لوگ واہ واہ "شاباش" کی آوازوں سے مکان سر پر اٹھاسے لیتے ہیں۔ لیکن ابھی بازی تمام نہیں ہوئی ہے۔ حریف پھر بڑھ رہا ہے۔ اگرچہ بہت کچھ خون بدن سے نکل گیا ہے۔ بچھے لگا کر ہونچکے ہیں۔ زبانیں پھٹ پھٹ گئی ہیں۔ لیکن اُسکی حیوٹ باقی ہے۔ تیرہ پر میل نہیں ہے۔ ایک بار اور وہ اُسی طرح دم خرم کے ساتھ مصروف جنگ ہو گا۔ اور بے خوف و خطر اور بالکل خوش خاطر کے ساتھ اپنی گھات ڈھونڈھیگا۔ کیونکہ ابھی مارنے کا حوصلہ اُسکے دل سے نکلا نہیں ہے۔

ابکی بار پھر دونوں اچھلا اور ہوا پر بلند ہوئے۔ پھر اُسی طرح پنجے رانوں اور پٹھوں میں

وسنے اور چونچوں نے آنکھوں پر ہتھکڑیاں لٹکا کر دیے پہلے جو فہمید ہوا تھا اب اسے شکست ہوئی۔ وہ پیچھے ہٹا۔ دیکھا تو ایک آنکھ حلقے سے باہر نکل آئی ہو۔ سچ یہ ہو کہ یہ بڑی ہی سیے رنجی کی سیر ہوئی تھی۔ لیکن ہلوگ جو میز کے گرد گھومتا تھا اسے دیکھنے کی بالکل عادی ہو جاتے تھے۔ اور اس پر کچھ اتفاقات ہی نہ کرتے تھے چہرہ کرے میں شور بلند ہوا۔ اور تھنوں سے پھٹا اڑنے لگا اور بھرا سی جیپا رے کو بڑھا دے دیے جانے لگے جسکی آنکھ جاچکی ہو۔ لیکن اسکو کسی ترخیب اور جوش کی حاجت ہی نہیں۔ وہ خود ان مقام لینے کے لیے جان پر کھیلے ہوئے ہو۔ چنانچہ گھڑی بھر بعد پھر جنگ و بیکار کا بازار گرم ہوتا ہو۔ اور پہلے سے بھی زیادہ جوش اور تیزی و تندی کے ساتھ گرم ہوتا ہو۔ حتیٰ کہ دونوں میں سے ایک بالکل بھان یا بسمل و نیم جان ہو سکے نیز پر گڑتا ہو تب جا کے لڑائی ختم ہوتی ہو۔ فہمید صاحب کو دیکھے کہ آنکھیں یہ فتح و ظفر کے دامن میں ملتی ہو۔ وہ بھی یا تو ایک آنکھ مٹو کے یا ایک ٹانگ سے ہاتھ دھو کے اور صرغ جان صحیح سلامت کے میدان سے مٹھتے ہیں۔ بلکہ اکثر تو یہی ہوتا ہو کہ لوگ اسے چمکارتے۔ شابشی دیتے پٹیلے ٹھونکتے لیجاتے ہیں اور آخر کار لہہ چندے اسکی بھی جان جاتی ہو۔

اب میز صاف ہو گئی۔ بادہ لکڑنگ کے در پیالے چلنے لگے۔ بادشاہ سلامت عالم سرخوشی میں ہیں۔ لوگوں سے تاکید فرما رہے ہیں کہ راجی ناس نہ کرنا۔ سب لوگ بظاہر تعمیل کر رہے ہیں۔ بادشاہ کی اہست پر سچو ان لگا ہوا ہو۔ زمانہ خواہ میں اسکی آگ تیز کر رہی ہیں۔ بادشاہ خوشنخوش و صوبوں کے بچے اڈا رہے ہیں۔ اور مرغوں کے حرکات پر اسے زنی ہو رہی ہو کس صفائی سے ایک نے دوسرے کی آنکھ نکال لی۔ اور اسے کیسی پھرتی سے لات ماری۔ اسپر ہنسی اڑ رہی ہو یہ باتیں ہی ایسی غلط انگیز ہیں نہ آخر۔ سرور و سرخوشی کی حالت میں بادشاہ سلامت بول اٹھے کہ یعنی۔ ابھی تو اور تماشہ ہونا چاہیے۔ یہ سنتے ہی امالی مرانی میناب ہو کے پوچھنے لگے کہ خداوندہ کسی بانی ہو۔؟ مرغ۔ شیر۔ تیر۔ کون جو طر متکایا جائے؟ بادشاہ نے کچھ ارشاد فرمایا اور پھر بازی شروع ہو گئی۔ ابکی بار کچھ اور زیادہ شور و غل اور طوفان بے قیزی بلند ہوا۔ کیونکہ اسباب سب کو مست و مجنون کر چکی ہو۔ جتنے کہ بادشاہ سلامت نشہ میں بالکل دھت ہو گئے۔ ایسے کہ حکم دیتے ہیں تو صاف جھلے بھی منہ سے نہیں نکلتے۔ اسی طور پر یہ جلسہ برافست ہوا۔

اب ہم بارہ سگھوں کا محل لکھتے ہیں۔ یہ جانور کوہ ہمالیہ کے قامن سے پکڑ کے بکثرت لکھنؤ میں لائے جاتے ہیں۔ یہاں انکو قندھنگی کی تعلیم دی جاتی ہو۔ اس پر جانور کا لکھنؤ جیو غار اور اسکی جسم کی



ساخت میں تراکت اور پیر تپلا پن بہت ہوتا ہو۔ بارہ سنگوں کی لڑائی کسی شاہی بارے یا احاطے میں (جو اسی غرض سے محاط کیا جاتا ہو) ہو کر تھی تھی۔ اور بادشاہ سلامت برآمدے میں بیٹھکے اس لڑائی کا تماشہ ملاحظہ فرماتے تھے اور ان کے ارد گرد رنیں رفقا اور مصاحبین جمع ہوتے تھے جس جیتنی اور چالاکئی سے یہ بڑے سنگوں والے جانور ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے تھے قابل دید ہوتی تھی۔ وہ پودمی چال۔ وہ شاخدا سنگوں کا ہوا میں بل کھانا۔ وہ اٹھا دے پاؤں گھات سے چلنا۔ اور ایک عجیب ادا کے ساتھ تپسے بدلتا۔ اور یہ چاہتا کہ ہم ہی موقع سے ہموں جس کچھ عجیب و دلکش سماں ہوتا تھا جسکا لطف بس دیکھنے سے نقل کرکھتا تھا۔ واقعی یہ نظارہ بہت خوش آئینہ ہوتا تھا اگرچہ قابل تاسف بھی ہوتا تھا کہ بوساری سبک خرامی اور ہنر آزمائی محض بے ضرورت ہو رہی ہو۔

رفتہ رفتہ دونوں اپنے سنگ سانس کے سنگوں سے تلو اور سپر دونوں کے کام لیتے تھے۔ سنگ سے سنگ ملا کے دونوں کبھی دو قدم آگے بڑھتے۔ کبھی ایک قدم پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ کیونکہ اسی طور سے وہ ٹکریں لڑتے ہیں۔ حتیٰ کہ بعد خرابی بھر بہت کچھ ٹکری بازی اور پتے بدل لول اور ہوشیاری کے ساتھ آگے بڑھنے اور پیچھے ہٹنے کی کارروائی کر کے دونوں کے سنگ گتھ جاتے ہیں اور اب وہ وقت آتا ہو کہ دونوں کے رنگ رنگ ریشہ ریشہ پر پورا زور پڑ رہا ہے اور دونوں نہایت مستعدی اور جوش کے ساتھ اپنی پوری قوت صرف کر رہے ہیں۔ جسکا انجام ایک نہ ایک کے حق میں موت ہوتا ہو۔ دونوں کے پچھلے پاؤں بالکل چڑے ہوئے ہیں۔ سر جھکے ہیں اور اگلے پاؤں اس طرح آگے بڑھکے ہیں کہ جیسے گویا زمین میں گاڑ دیے گئے ہیں۔ دونوں بڑے زور نگار رہے ہیں۔ اور پورے بدن کی طاقت ایک ایک ٹکریا ٹکری کے جواب میں صرف کر رہے ہیں۔ ایک بار ایک کی ٹکری زور اچھی پڑی اور اس نے اپنے حریف کو چند قدم پیچھے ڈھکیل دیا۔ دوسری بار اس نے اپنا بدلہ اس سے لیا۔ لیکن ابھی تک ان کے بدن کے سب رنگ پیچھے تھے ہوئے ہیں۔ ہر عضو بدن حصول تختہ ذی میں اپنی حیثیت کے مطابق حصہ لے رہا ہے اور اس حالت پر بھی جو پاؤں اٹھتا ہے وہ بڑی سہولت اور خوبصورتی کے ساتھ زمین پر رکھ دیا جاتا ہے اور جو حرکت ہوتی ہے وہ شائستگی اور تناسب اعضا کے خلاف نہیں ہوتی۔ کیونکہ جو کچھ زور آزمائی ہو رہی ہے وہ صرف سنگوں کے ذریعے سے ہو رہی ہے۔

آخر کار۔ ایک کا زور کم کر کے لگتا ہے۔ اسکی آنکھوں کے گول گول دیسے خوف دہرے

کی وجہ سے خوں چکان ہو جاتے ہیں۔ اب پاؤں جو اٹھتے اور پھر زمین پر آتے ہیں تو ان میں  
تھکھری بھی دکھائی دیتی ہے۔ کیونکہ زبردست حریت اُسے برابر ملتا۔ ٹوٹھکا جلا آتا ہے اور  
اب اُسے یہ اُمید باقی نہیں رہی ہے کہ پھر اپنی جگہ پر قائم ہو سکے گا۔ یہ آثار کمزوری دیکھنے کے حریف  
کا دل اور بڑھ جاتا ہے اور وہ اور بھی تیزی و تندہی کے ساتھ اُسے دیکھتا ہے۔ کیونکہ ایک کے دل  
سے جو اُمید نکلتی ہے وہ دوسرے کے سینے میں اور بھی حوصلہ پیدا کرتی اور اُمید بندھ جاتی ہے اور وہ  
بڑے زوروں میں ہو جاتا ہے۔

یہ حالت دیکھ کے برآمدے میں بڑا جوش سب کو ہوتا ہے۔ بادشاہ سلامت اور اُن کے صحابین  
بیتاب ہو ہو جاتے ہیں۔ اور لوگ اُن کمپیں بھاڑ بھاڑ کے اور گردنیں اٹھا اٹھا کے دیکھنے لگتے ہیں کہ  
انجام کیا ہوتا ہے۔ خود بادشاہ سلامت سب سے زیادہ شتاق ہوتے ہیں کہ دیکھیں کون باری لیجاتا  
ہے۔ بار بار وہ پکار اُٹھتے ہیں کہ ”دیکھنا۔ دیکھنا۔ اب وہ چلا۔ بالکل چلا سکا پالا اُسے لیے جاتا ہے  
اس میں شک ہی کیا ہے۔ کیونکہ کالا بارہ سنگھابرا بر سر گرمی کے ساتھ آگے بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ اُس کا سر اب  
کچھ اور زیادہ جھک گیا ہے۔ ہر گ پٹھاتا ہوا ہے اور جوڑ جوڑا لے جوش کے پتھر ک رہا ہے۔ اور حریف  
بچا لے کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے دیدے بڑی بیباکی اور بھینسی سے گھوم رہا ہے اس کی آنکھوں سے  
دشنت و ہراس ٹپک رہی ہے۔ خوف کے اُسے اُس کے بدن میں رعشہ پڑ گیا ہے۔ نازک ناٹلین خمر خرا  
رہی ہیں اور جوڑ جوڑے قابو ہو رہا ہے۔ آخر کار وہ احاطے کے سرے پر پہنچ گیا۔ اُس کی پھلی  
ناٹلین احاطے کے سرے لگ گئیں۔ اب پیچھے ہٹنے کی جگہ ذرا باقی نہیں ہے۔ پٹن ابھی تک حریف  
نے اُس کی جان نہیں چھوڑی ہے۔ وہ اُسی طرح اُسے ریل لیا ہے۔

اس وقت تماشائیوں میں سے کوئی شخص (جو بیباکی کے ساتھ اُٹھتا ہوتا ہے) بول اُٹھتا ہے  
کہ ”بس۔ بس۔ لڑائی ہو چکی۔ کیونکہ وہ دیکھتا ہے کہ پچارا شکستہ دل بارہ سنگھابرا ایک طرف سے بانسول  
کے ٹھار اور دوسری طرف سے مخمذ حریف کے شکنجے میں پھنس گیا ہے تو اُس کے منہ سے بے اختیار  
یہی جملہ نکل جاتا ہے کہ ”بس۔ لڑائی ہو چکی۔“ اور بادشاہ سلامت اور اُن کے صحابین اس پر  
بت خلاف صرف فرماتے ہیں۔

یہ آواز مغلوب اور کمزور جانور (جو ابھی تک صرف زور آزمائی ہوتا ہے) کے کان میں بھی  
پڑتی ہے اور حتی المقدور وہ اپنے گول گول دیدے اُٹھ کے اوپر کی طرف دیکھنے لگتا ہے کہ یہ آواز  
کو مرے آئی۔ کیونکہ اُسے اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ ایسے نازک وقت میں اُدھر سے کوئی

ملک بھی پہنچ سکتی ہو۔ اُس کے بدن کی ساری طاقت جو اب تک اُسے سنبھالے ہوئے تھی اب جواب دینے لگتی ہو۔ حریف تو ابھی تک سر جھکائے اور تازہ دم ریل پل کر رہا ہو۔ لیکن اُسکی انگلیں بالکل ڈمکنے لگتی ہیں۔ اب وہ اپنا بدن مگھوڑ کر حریف کے سامنے سے منہ پھیر لیتا ہو۔ گویا یہ بخار کتا ہو جس اب مقابلے کی تاب نہیں۔ گھڑی بھر میں سینک جگہ بند سے نکل جاتے ہیں۔ اور ٹھنڈے سینکوں کی تیز زکس اُس کے بدن کو گھائل کرنے لگتی ہیں۔ پیچھے کی گردن گھوم جاتی ہو۔ سر سے خون کے فوارے جاری ہو جاتے ہیں اور جبادہ ایک پاؤں تو اُس کے منہ سے نہایت درد و الم ظاہر کرنے والی آواز نکلتی ہو اور بڑے بڑے آنسو آنکھوں سے نکل کے منہ پر ڈھلکنے لگتے ہیں۔ جان بڑی پیاری ہوتی ہو۔ وہ بیچارہ بڑی جیتی اور مستعدی کے ساتھ اپنے کو حریف کی گرفت سے جدا کرتا ہو۔ حتیٰ کہ اس جھپٹے میں اکثر ٹھنڈے حریف کا منہ بھی پھر جاتا ہو۔ اور پھر بڑی کمان کے تیر کی طرح ہو اسکے گھوڑے پر سوار ہو سکے ایک دم میں کہیں لپکے پورج جاتا ہو۔ لیکن اُسکے کی وجہ سے مجبور ہو کے مشرول کے برابر برابر چکر لگائے لگتا ہو کہ شاید کئی منفرد صورت نکل آئے۔

برآمدے میں اب بھی بہت جوش ہو۔ ابھی کچھ اور تماشائی ہیں اور بادشاہ سلامت "شباباش" کی آوازوں سے پیچھے مفرد و مفتوح کا جی رکھ جلتے ہیں۔

جب بارہ سنگھا اپنی جان بچا کے بھاگتا ہو تو بڑے زور سے بے تکان بھاگتا ہو۔ اُس کے سرعت رفتار اس غضب کی ہوتی ہو کہ آنکھیں ٹھہرتی۔ وہ چاروں طرف حسرت سے نظر کرتا ہے کہ کوئی تو اس آڑے وقت مدد کو آئے۔ اور کسی طرف تو سخت اور گرین کی راہ نکلتی۔ مگر سب طرف سے ابوسی منہ دکھاتی ہو اور جس وقت وہ مڑکا چکر کاٹتا اور تیزی سے پھاگتا ہو اور اُس کی کھال پر خون نشان زخم دکھائی دیتے ہیں۔ عین اُسوقت اُسکا حریف اپنے حواس پریشان دوبارہ حملہ کرنے کے واسطے جمع کرتا ہو اور از سر نو چھوٹ پڑنے کے واسطے تازہ دم ہو جاتا ہو۔ پھر سر جھک جاتا ہو اور اتنا جھک جاتا ہو کہ پاؤں سے جا لگتا ہو۔ پھر بنگ (جن کی نوک میں خون آلود ہوئی ہیں) مفرد حریف کے سامنے ہنستے ہیں اور اپنی گھات پاجاتا ہو تو پھر بڑی تندہی کے ساتھ اُس پر چھوٹ پڑتا ہو۔ پھر اُس نے اپنے حریف کو ایک گدار سید گیا۔ پھر اُسکے سینک دور تک حریف کے بدن میں پیوست ہو گئے۔ حتیٰ کہ پیچھا۔ محسوس درج حریف بجان یا نیم جان ہو سکے نہیں پر گر پڑا اور ٹھنڈا اُسکی منہ پر سیٹوں سے جھنجھوڑ کے اپنا سر اٹھاتا اور غور پانی پر گر جاتا ہو۔

لاحول ولاقوتہ میں نے بھی کیا فضول کو اس کی ہو۔ سیلا جس مقام پر بڑے خوشحال

شیروں۔ اڑیل گیندوں اور کوہ پیکر ہاتھوں کی لڑائیوں کا بیان کرنا چاہیے وہاں سچا ہے بارہ لکھنؤ کی لڑائی کس شمار تھا رہیں۔ اگرچہ وہ کہتے ہی خوبصورت اور نازک اندام کیوں نہوں۔ ان دوندوں کی لڑائی کے سامنے پچاسہ مینڈھے۔ تیتیر۔ شیر۔ اور مرغوں کی لڑائیاں تو باز سچا افعال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ ہاں۔ دوشیہ دی یا جیتوں کا ایک دوسرے کو بھانڈنا۔ یا دو گشت و کھا اپنے قرونِ ناسیکوں سے بھار کرنا۔ یا دو ہاتھوں کا ایک دوسرے کی جان لینے پر طعن و توت کرنا بیشک ایسے امور ہیں جنکے بیان میں ناظرین کو افسانہ ہاے شادی و غم کا مزاج ملتا ہی کہو کہ ایسے تذکرے کے سامنے اور کسی جانور کی لڑائی کا نام بھی نہ لینا چاہیے۔

جب چیتے لڑائے جاتے تھے اور کئی روز کی بھوک اور پیاس کے تاؤ میں دو چیتے حاصل ہیں (جو نہایت سخت طور سے محاذ کیا جاتا تھا) چھوڑے جاتے تھے اسوقت ایسا سناٹا اور سکوت بر طاعت ہوتا تھا کہ اگر زمین پر سولی بھی گرے تو آواز سنائی دے۔ کیونکہ انتظار اور اشتیاق خود موسمِ جو کے اُس مقام پر آجاتا اور تیرہ کے دیکھنے اور سننے کے واسطے ہر شخص چشمِ براہ اور گوشِ برآواز ہوتا تھا۔

بادشاہ کے ہاں ایک چیتا مگر نامی تھا۔ بڑا گراں ڈیل۔ اور کھنوں کی لڑائیاں جیتے ہوئے۔ میں نے اُس سے بڑا چیتا کبھی دیکھا ہی نہیں۔ اُسکی کھال پر دھاریاں نہایت خوشنما تھیں۔ اور جب آزادی کے ساتھ وہ چلتا تھا تو اُسکی ٹانگوں اور لانی لانی پیچ پر چمکنی چمکی کھال بڑی پیاری معلوم ہوتی تھی۔ جو لوگ اس فن میں طاق تھے انکو خیاں تھا کہ اگر اس کے مقابلے پر لڑنے والا کوئی چیتا ہی نہیں سکتا۔ کہ ایک بار یہ خیر ملی کہ ایک بڑا ستوندا اور زور آور چیتا ترانی میں بکرا گیا ہی۔ واضح ہو کہ ترانی تو بی وق و بکل ہی جو او دھ اور زیاں کے درمیان حامل اور کوہ ہمالیہ کے دامن میں ہی۔ سب کی راسے ہی ہوں کہ اگر یہ جسا نور آجائے تو گلو اسے خوب جوڑ ہو۔

جب یہ نووارد شیر جس کا نام ترانی والا رکھا گیا۔ کھنوں میں آگیا تو اُسکی برداشت بڑی جگر گری اور نگرانی کے ساتھ کی گئی اور بے ہوا کہ جس زمانے میں کمانڈر انچیف فوج انگلشیہ کھنوں بادشاہ سے ملنے آئیں اُس وقت یہ جوڑ لڑایا جائے۔ چنانچہ اس کے واسطے بہت کچھ غیر معمولی تکلفات اور ساز و سامان کیے گئے۔ اور جس رستے میں یہ لڑائی ہوئی اسی تھی وہاں پھول بیوں اور رنچا رنگ آرائیوں سے بڑی سجاوٹ کی گئی۔ بادشاہ گان ہند کا مذاق آرائش و زیبائش میں تو

ضرب ابل جڑ۔ میں سمجھ بیٹا پا چیمے کہ اس سجاوٹ میں خوب خوب جوہر دکھائے گئے تھے۔ بس برائے  
میں بادشاہ سلامت موصفا میں اور کمانڈر انچیف مہاشان بیٹھے دالے تھے وہ نہایت مفرق  
وزن تار پر دوں اور خوش رنگ جھنڈیوں۔ بیروں سے خوب سجا گیا۔ جتر سلطانی جو سنہری اور زمردی رنگ  
کے بادے سے منڈھا ہوا تھا تخت شاہی پر سایہ افکن تھا۔ اور اُسکے دونوں پہلوؤں میں نہایت  
گرا نبھا اور ممتاز قسم کی کرسیاں صاحب کمانڈر انچیف اور صاحب رزیدنٹ کے واسطے بچھائی گئی تھیں  
بادشاہ سلامت اپنا تاج شاہی زیب سر کیے ہوئے تھے۔ یہ تاج بالکل نیا بنا ہوا تھا۔ اور اُس میں کثرت  
جوہرات جڑے ہوئے تھے۔ اُسکے طرے میں نہایت سفید براق پر ہالکا ہوا تھا۔ جو نیچے کی طرف ذرا  
جھکا ہوا رہتا تھا۔ اور بادشاہ سلامت جب چاہتے تھے بڑی شان سے سر اٹھاتے تھے۔ اُسکے  
چہرے کی گندی رنگت (جس میں غضب کی صباحت اور ملاحت تھی) جواہرات کی تابش اور ہما کے  
تازک پر کی جنبش سے اور بھی خوش آئند اور نظربہ معلوم ہوتی تھی۔ اس موقع پر وہ مشرقی لباس  
جو نہایت زرق برق چینی کھواب کا تھا پہنے ہوئے تھے۔ اس کپڑے میں اگرچہ ریشم بھی تھا مگر بالکل  
سیم وزر سے بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اور اُسکی آب و تاب اس غضب کی تھی کہ ہر جنبش پر جواہرات  
کے نہایت اچھے تراشے ہوئے نگینوں کا دھوکا ہوتا تھا۔ صاحب کمانڈر انچیف اپنی جرتیلی وردی پہنے  
ہوئے تھے۔ اور صاحب رزیدنٹ بالکل سادے لباس میں تھے۔ یہ سارا سال ایسا تھا جو کبھی

یہ کمانڈر انچیف لارڈ کو برسر تھے۔ جنہوں نے خدمت میں کئی بار قدم رنجہ فرمایا تھا۔ انکی تواضع و مہارت شاہانہ  
سان و شکوہ سے کی گئی تھی۔ چنانچہ انکے ایک انسوراجی کا بیان ہو کہ

”بس ذلت ہو کہ ایوان شاہی میں داخل ہوئے۔ ہو کہ بادشاہ اور اُن کے مصاحبین کے ساتھ ناشتہ کھا  
بہر پر بیٹھے۔ بادشاہ نہایت اعلیٰ درجے کا بدوس شاہی جتر منسل کا پہنے ہوئے تھے اور شاہی پٹا کرس ہانڈھے ہوئے تھے  
انکی گہرائی میں جواہرات ہی جواہرات نظر آتے تھے اور جسم پر ہیرے۔ زمرد اور موتیوں کے کھنڈے مائے بازو بند  
خودن اور انکے اپنی تاب و تابش دکھلا رہے تھے۔ کھنڈے سے خارج ہو کے ہو کہ ہو کہ قمر سلطانی میں داخل ہوئے۔ اگرچہ  
اس کی صنعت میں مناسب کو دخل نہ تھا لیکن آرائشی اور سجاوٹ نے اُسے دھن بنا رکھا تھا۔ خاص کر تخت شاہی بہت  
خوب سجا بنا ہوا تھا۔ جس میں زرد وزی کام تھا اور بالکل موتی بنائے ہوئے تھے۔ اسی مقام پر بادشاہ نے صاحب  
کمانڈر انچیف کو اپنی تصویر عنایت کی۔ جس میں ہیرے جڑے ہوئے تھے اور ایک موتیوں اور زمرد کی ٹری  
میں ٹکی ہوئی تھی۔“

فسرہ اموش نہیں ہو سکتا اور چاہے ہزاروں واقعات دل سے ٹھوہو جائیں لیکن یہ ضرور یاد رہے گا اور ترائی والے کی کٹھنہ صحن میں آسنے سانسے ایسے موقع سے رکھے گئے کہ جھوگ جو برآمدے میں تھے بخوبی دیکھ سکیں۔ چنانچہ جب یہ دونوں جانور نہایت بوش اور تیزی اور تندی سے اپنے کٹھروں میں دیواروں سے ملے ہوئے گھومتے تھے تو ہم انکی چمکیلی چٹھیوں کو دیکھ سکتے تھے۔ اس درمیان میں جب کوئی شخص کٹھروں کے پاس سے ہو کے نکلتا تھا تو جانور بڑے زور سے ہونکتے اور دانتوں کو پیسے غراٹے تھے۔

دیر تک دونوں کٹھرے بول ہی رکھے رہے۔ محض اس خیال سے کہ دونوں ایک دوسرے سے صورت آشنا ہو جائیں۔ کیونکہ اگر یہ چلتا خوشوار بہت ہوتا ہے لیکن باختلاف ڈرپوک اور بزدل بھی ہوتا ہے اور اسکی سرشت میں داخل ہے کہ اگر یکایک کسی خطوے میں پڑ جاتا ہے تو جان چڑانے اور منہ موٹنے لگتا ہے۔

میں نے خود اپنی آنکھ سے دو جینٹوں کو اس حال میں دیکھا ہے کہ دونوں بخوبی تیار کر لیے گئے تھے۔ بھوک اور پیاس کے مارے ہوئے تھے۔ اور اسی تاؤ میں تھے کہ احاطے میں داخل کیے گئے البتہ دونوں ایک دوسرے کی موجودگی سے بے خبر تھے۔ جب انکا سامنا ہو گیا تو دونوں کو یہی فکر پڑی کہ جہدہ راجد ممکن ہو اپنے کٹھروں میں پہنچ جائیں۔ اور جب کٹھروں میں نہ پہنچ سکے تو دونوں الگ الگ کونوں میں دیکھنے اور پیٹ کے بل لیٹنے اور ایک دوسرے کو گھورنے لگے۔ لیکن مقابلہ امید والی پر ایک بھی متوجہ نہ ہوا۔

یہ تو ظاہر ہے کہ گھرا اور ترائی والا دونوں کو ایک دوسرے کی موجودگی کی خبر بہت جلد ہو گئی۔ کیونکہ جب وہ اپنے کٹھروں میں ٹھل رہے تھے اُس وقت بھی ٹھلے ٹھلے یکایک وہ کھڑے ہو جاتے اور اپنے حریف کی طرف بالکل ٹھیروں کی طرح غراٹے اور دانت نکالنے لگتے تھے۔

صاحب کمانڈر انچیف اور صاحب ریزیڈنٹ دونوں نے ان جانوروں کو پیشتر ہی ملاحظہ فرمایا تھا۔ اور اب جو کمانڈر انچیف صاحب اُبیر غور سے گلاہ کرنے لگے۔ تو بادشاہ سلامت بول اُٹھے ”کیجیے صاحب۔ آپ کس پر بازی بٹے ہیں؟“ اس پر انھوں نے جواب دیا کہ ”حضور۔ مجھے تو سعاد ہی رکھیں“ بات یہ تھی کہ کپتانی کسی قدر بادشاہ سے کشیدہ اور پرانی تھی۔ کیونکہ انکے ملک میں بڑی اہتری و بدظنی پھیلی ہوئی تھی۔ اور اسی وجہ سے کمانڈر انچیف صاحب کو ان سے بازی بدنے میں شغف تھا۔ بادشاہ نے ریزیڈنٹ صاحب کی طرف مخاطب ہو کر ”بھئی۔ گھرا

پرستو اشرفیاں! رزیدینٹ صاحب نے جواب دیا کہ ”اچھا حضور۔ رہی میرے نزدیک تو ترانی والے جتنا نظر آتا ہو“ بادشاہ بڑے خوش ہوئے اور گلے ہاتھ ملنے کیونکہ اب انکو بازی کا مزہ ملنے لگا تھا۔ پھر وہ وزیر اعظم سے اُردو زبان میں مخاطب ہوئے کہ ”کیوں جی تم ترانی والے پر بازی لگاتے ہو“ اسپرانہوں نے کہا کہ ”جہاں پناہ۔ رزیدینٹ صاحب کی رائے ہمیشہ صحیح ہوتی ہو میں ضرور بازی لگاؤں گا“ بادشاہ بولے کہ ”اچھا تو گلہ پرستو اشرفیاں ہوئیں! واضح ہو کہ یہ حضرت وزیر اعظم تو برائے نام ہی تھے البتہ مالدار بڑے تھے۔ کیونکہ اصلی وزیر اعظم کا منصب اسی خاصہ تشریف کو حاصل تھا جو اسوقت بھی حلقہ نیاز مندان بااختصاص میں مودب استادوں تھا۔ بادشاہ نے فرمایا کہ ”اچھا توستو اشرفیو کی شرط رہی“ وزیر اعظم نے شرط منظور کر لی اور اپنی کمر کے کشمیری شالی کے ٹپکے سے ایک نہایت نفیس پاکٹ بک نکال کے اس شرط کے منہوں کو مسپر طابک لیا۔ یہ کچھ اس غرض سے نہ تھا کہ اگر بادشاہ بھول جائیں تو انکو یاد دلایا جائے بلکہ صرف اسلئے تھا کہ اگر کسی وقت بادشاہ فرمائیں کہ ”نہیں تم نے لکرا یہ شرط لگائی تھی“ تو وہ اسوقت یہ تحریر پیش کر کے اور وہی زبان یہ کہنے بادشاہ کو شک و شبہ اور تذبذب میں ڈال دے کہ ”کیوں بہن! تو نہیں کہ جاپناہ صحیح ارشاد فرماتے ہوں اور میں ہی غلط کہتا ہوں“ اور اگر بادشاہ اسپر زیادہ اصرار کریں کہ ”نہیں جی تم نے ترانی والے پر بازی لگائی تھی۔ تو وہ فوراً اشرفیاں حاضر کر دے اور ہنسی خوشی اپنی بار منگور کر کے رقم ادا کر دے۔ اور پھر اسکی کسرویوں نکال دے کہ اس کے بعد ہی جو کھری اسامی اُسکے چندے میں پھنس جائے اُسکے سرسار ادا بال اتار کے اپنی رقم سیدھی کرے۔

اشارہ ہوا۔ چیتوں کے کھڑے کھولے اور بالٹس کے ٹڑاٹھا دیے گئے۔ ترانی والا ایک ہی زقند بھر کے اپنے کھڑے سے باہر نکل آیا۔ اور اپنا جبر اچھیل کے ادھر ادھر اپنی دم ہلانے لگا۔ اُسی شان سے لگرا بھی نکل کے میدان میں اکھڑا ہوا۔ لیکن اُسکے انداز میں سلامت رومی زیادہ تھی۔ ابھی دونوں پچاس فٹ کے فاصلے سے تھے۔ دونوں کے منہ کھلے۔ دُہیں ہلتی۔ اور دونوں ایک دوسرے کو بغور دیکھ رہے تھے۔ بالآخر لگرا چند قدم آگے بڑھا۔ اور اُسکا حریف اپنے پاؤں توڑ کے صحن میں جہاں کا تھاں کھڑا۔ اور دشمن کی طرف ٹنگی لگا سے تار بگیا گویا ہر گھڑی جست مارنے اور زقند بھر نے پر طیار تھا۔ لگرا بھی اُسکو بغور دیکھتا ہوا آہستہ آہستہ ہوشیار سی کے ساتھ قدم بڑھاتا اور سامنا چھوڑ کے اور ذرا کتر کے چلا اور قریب پہونچ گیا اب ترانی والا بھی اٹھ کھڑا

ہوا اور وہ بھی دوسری طرف سے کھڑا کیا تا چلا۔ دونوں قریب پہونچ گئے۔ اس وقت برآمدے میں تجھے  
 تماشائی تھے سب دم بخود تھے۔ اور ہر شخص کی نگاہ انھیں دونوں پر لگی ہوئی تھی۔ جانوروں کی  
 غیر معمولی طور پر طویل القامت ہونے کی وجہ سے ہر تماشائی پورے طور پر سیر دیکھ سکتا تھا کیونکہ  
 یہ دونوں پہلوان برے عظیم الجثہ قوی میل اور خوبصورت تھے۔ ترائی والے کارنگ کلر اکی  
 بہ نسبت کسی قدر کھلا ہوا تھا۔ لیکن سیاہ سیاہ دھاریوں میں زردی ذرا اہلکی تھی۔ اور دونوں جانور  
 نہایت خوبصورت۔ دلیر اور بے پناہ تھی۔ آخر کار آہستہ آہستہ بڑھتے بڑھتے لگرنے ایک جت  
 کی کیونکہ پچھلی فہمندیوں کی وجہ سے غالباً اُسے اپنی قوت پر زیادہ اعتماد تھا۔ اُسے جست کی مگر  
 اس شان سے کہ یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ارادہ کرے کی ہو بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے کوئی برفی  
 قوت تھی جس نے اُسے اچھال دیا ہو اور یہ جت اس قدر اچانک ایسی پھرتی کے ساتھ اور اتنی تندی  
 سے تھی کہ جس سے صاف پایا جاتا تھا کہ بالارادہ نہ تھی۔ لڑائی والا بھی اس موقع پر غافل نہ تھا۔ جس  
 عملت کے ساتھ اُسکا حریف ہوا پر بلند ہوا تھا بعینہ اُنسی چالاک کی کے ساتھ وہ بھی ٹھٹھک کر الگ کھڑا  
 ہو گیا۔ دونوں کے حرکات ایسی پھرتی سے ہوئے کہ ان واحد میں ادھر اُسے جست کی ادھر اُسے  
 لگرا بیچ و تاب کھانے زمین پر آیا۔ اور قبل اسکے کہ وہ دم راست کرے یا اُسکو اپنے زمین پر آرہنے  
 کا احساس ہو فوجہ ترائی والا اسپر آ پڑا اور اُسکے پیچے اسکی گردن پر زور سے پڑے اور اُسکے  
 گلے کے قریب پہونچ گیا۔ یہ بھی دم کے دم میں ہو گیا۔ ابھی ہلوگ اچھی طرح یہ دیکھ بھی نہ چکے تھے کہ پھر  
 لگرا کی گھات چلی گئی۔ یعنی معاً لگرنے بڑے زور سے اور اپنی پوری قوت صرف کر کے ایک جست کی اور اسکے  
 پنجوں اور حیر سے اپنی گردن اور گلے کو چھڑا کر صاف الگ جا کھڑا ہو گیا۔ بلکہ اس زبرد میں گیا کہ اپنے  
 ساتھ تھوڑی دوزخ ترائی والے کو بھی گھسیٹ لیکھا لیکن اُسکی گردن اور شانہ پر خون کے نشان ہوئے  
 تھے۔ اب حریف کی گرفت سے اپنے کو گلو خلاص کر کے اُسے فوراً ایک سخت جلد ترائی والے پر کیا۔ اسوقت  
 بادشاہ سلامت نے وزیر اعظم کی جانب خطاب کر کے فرمایا: "شاہنشاہ! شاہنشاہ! اب میں اسپر دوسو  
 اشرفیاں لگاتا ہوں" اسپر روشن الدولہ نے عرض کیا کہ قبلہ عالم کی ہی مرضی ہو تو وہی سواشریا  
 سی" پھر اُس نے اپنی پاکٹ بک نکال کے اسپر بشرط بھی لٹا دیا۔ ہم لوگ اُسوقت لڑائی کی طرف  
 ایسے ہمد تن مصروف تھے کہ کسی نے ان باتوں پر توجہ ہی نہیں کی جب لگرنے اپنے کو حریف کی گرفت  
 سے گلو خلاص کیا ہو اُسکے بعد صرف لمحہ دو لمحہ کے واسطے دونوں جانور اپنے منہ کھولے ایک دوسرے  
 کو گھورتے رہے۔ اُسوقت دونوں کے منہ پورے طور پر کھلے تھے اور انکی سیاہ سیاہ دھاریوں کی جگہ



کھالوں کی جنبش سے بہت پیاری معلوم ہوئی تھی۔ دونوں کی بھانج اور غوشتاں آنکھیں باہم لڑی ہوئی تھیں۔ اور وہ غصے میں کھڑے دم ہار رہے تھے۔ وفتہ لگانے اپنے حریف پر ایک زور شور کا حملہ کیا۔

اس مرتبہ اسکا حریف اُس سے بہت ہی قریب تھا اسلئے اسکو پہلا موقع پٹ پٹیکانہ مل سکا اور اُس نے بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا۔ اب دونوں جانور بیچ میدان میں کھڑے تھے۔ دونوں کے پنجے جلدی جلدی چل رہے تھے اور دونوں منہ پھیلا کے حریف کی گردن پکڑنے پر بڑھ رہے تھے۔ دونوں کی ہر حرکت پر ہلوگوں کی نظریں لڑی تھیں اور ہلوگ بخوبی دیکھ رہے تھے کہ کس نے کیونکر حملہ کیا اور کس نے کیونکر حصے کا جواب دیا۔ جب وہ دونوں بالکل قریب ہو گئے اور بیخون اور زخمت سے حملہ کرنے اور ٹپکنے لگے تب معلوم ہوا کہ دونوں جانوروں کو بدرجہ مساوی اپنے حریف کو جی کھوں کے زخمی کر ڈالنے میں کامیابی ہوئی تھی۔ اور دونوں اپنی اپنی پرہیز زور آزمائی کے ساتھ ایک دوسرے کے منہ سے پڑے اور گردنوں میں پنجے دھسنے سخت کشش و کوشش کے ساتھ کشتی ٹوڑ رہے تھے اور اپنی پھلی ٹانگیں جاتے کھڑے ہوئے تھے۔ بلاشبہ یہ نہایت دلچسپ زور آزمائی تھی۔ اگرچہ بیڈیاں اس کیفیت کو پڑھنے بہ زبان ہو کے بول اٹھیں گی کہ یہ ساری سیر بڑی غلامانہ۔ وحشیانہ اور نہایت سفاکی کی سیر تھی۔ مگر میں نہیں دلاتا ہوں کہ اس لڑائی میں بھی بہت سے عالی خیالات متعبر تھے اور کچھ شک نہیں کہ جنگل میں ایسی لڑائی اکثر ہوا کرتی ہو۔

اسی حیثیت سے یہ دونوں جانور قریب قریب چھ فیٹ بلند آپس میں جھپٹے ہوئے اپنے پھیلے پاؤں پر زور دینے لڑ رہے تھے اور ہنسنے گول گول چہرے اور خمر بار آنکھیں نہایت خوبصورتی سے ہنسنے طویل جسم کے اوپر دکھلائی دیتی تھیں جسقدر مضبوط گرفت کے ساتھ پنجے گردنوں اور ہلوگوں میں دھنستے تھے اتنے دیکھ کے حیرت ہوتی تھی۔ دونوں نہ اپنی جگہ سے ہنستے تھے نہ اپنے چلاتے تھے بلکہ ایک آں کھڑے نہ رہتے۔ جہ تھے اور گویا اسی زور آزمائی پر موت و زندگی کا فیصلہ منحصر تھا۔ دونوں کے جسموں سے خون کے فوارے جاری تھے اور انکی ہاجیت کا تصفیہ اب انکی جسمانی قوتوں پر اٹھ رہا تھا۔ اس واقعات کی تحریر میں بہ نسبت اصل واقعے کے زیادہ تاخیر ہوتی ہو جسوقت یہ دونوں جانور اس طرح کھڑے تھے اسوقت برآمدے میں جتنے تھے سب بالکل دم بخود اور آئینہ حیرت بنے ہوئے تھے۔ اور ایسے سکوت و خاموشی کے عالم میں غور و تامل کے ساتھ تماشہ دیکھ رہے تھے کہ گویا کسیکے بدن میں جاں ہی نہیں ہو۔ لیکن یہ سب کیفیت زیادہ دیر تک قائم نہیں رہی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد لگنے جو زیادہ چلا

اور غمخوار اور پر غضب تھا بڑی زور سے اپنے حریف کو زمین پر دے چکا۔ دونوں نے منڈ کڑی کھائی اور جب سنبھلے تو یہ ایک یہ نظر آیا کہ ترائی والے کی پیٹھ زمین سے لگ گئی ہو اور گلہ اسپر چڑھا بیٹھا ہو۔ اسوقت بادشاہ نے بہت خوش ہو کر ہوا و از بلند فرمایا کہ بدشاہ باش۔ گلہ اشا باش۔ اور انگریزی میں کہی آوازیں ایک ہو کے نکلیں کہ گلہ بازی لیگیا۔ لیکن گلہ کی یہ جیت عارضی اور برائے نام تھی۔ گلہ کے پچھلے پاؤں کے پنجے ترائی والے کے پیٹ میں گھسے ہوئے تھے اور ترائی والے نے اپنے حریف کو منہ سے مضبوط پکڑے ہوئے تھا زور سے ایک طمانچہ اگلے دست سے گلہ کے سپر پر رسید کیا اور اس کے پنجے گلہ کی آنکھوں میں دھنس گئے۔ جب کانیچہ یہ ہوا کہ اسکی ایک آنکھ حدتہ چشم سے باہر نکل پڑی۔ اس در دکی وجہ سے گلہ نے زور سے پیچ ماری اور اپنے حریف کو چھوڑ دیا۔ اور خود بھی اسکی گرفت سے جدا ہونے کی عہد کوشش کی مگر حریف کے اسے اسکی ایک نہ چلی۔ اسوقت ترائی والے نے نہایت جیتی سے گلہ کے گلے میں اپنے دانت پیوست کر دیے لیکن گلہ زور کر کے اسے میدان میں چند قدم کھسکے۔ گیا۔ اور اگرچہ اس نے اپنے تئیں اس کے پنجے سے چھڑنے کی بڑی نوشش کی مگر بالکل رانگاں لگی۔ اسوقت یکا یک نہایت تیزی سے ترائی والا نیچے سے اٹھا اور اٹھکے گلہ پر چڑھ بیٹھا۔ اب گویا زانی کا خاتمہ ہو گیا تھا۔ گلہ اپنے دشمن کے نیچے پڑا تھا۔ اور بالکل بے قابو ہو گیا تھا۔ اس کے تمام جسم سے برابر خون بہ رہا تھا اور اب اس میں یہ سکت نہ تھی کہ کچھ زور لگائے۔ ترائی والے نے اپنے پنجے سے حریف کا بڑا ہٹا کے اور اس کا منہ پھر کے اپنے دانت اس کے حلق میں پورے طور پر دھنسا دیے۔ اسوقت گلہ بالکل بے بسی کے عالم میں بہت کچھ ہاتھ پاؤں مار رہا تھا اور اپنے طمانچوں سے ترائی والے کی کھال بڑیچے ڈالتا تھا کیونکہ اس سے زیادہ اب وہ کرب کی کیا سکتا تھا۔ اس کے منہ کی گرفت چھوٹ چکی تھی حریف کے پنجے میں سب طرف سے پھنسا پڑا تھا اور بدن سے خون نکلا جا رہا تھا۔ اب لوگوں نے انگریزی اور ہندوستانی زبان میں غل مچانا شروع کیا کہ گلہ اگیا۔ بادشاہ نے بھی فرمایا کہ بیشک۔ مار گیا۔ اور طمانچوں کو حکم دیا کہ گلہ کے کپڑے کی کڑکی کھو لو اور ترائی والے کو ہٹا دو۔ چنانچہ سسٹن سسٹن گرم سناغضیں ٹھاٹھ کے باہر سے ڈاکر فاتح جانا۔ کجا جسم داغا گیا۔ بھلے اسکے کہ وہ خود علمبرہ ہو۔ اس سارے تماشے میں یہ حرکت نہایت غلامانہ تھی۔ لیکن گلہ کی جان کے واسطے کوئی دوسری تدبیر اس کے سوا ممکن بھی نہ تھی۔ وہ بیچارہ بالکل ہزیمت خیز رہا اور دل شکستہ۔ طاؤز اکثرے کے اندر گھس گیا۔ اسکی ہزیمت کے نشان میدان میں تھے یعنی اس کا خون زمین پر پڑا تھا جو اس کی یاد دل رہا تھا۔ اور وہ اپنی پچھلی ٹانگوں میں دم دبلے تھا۔ لیکن اسی حال میں

میں بھی اُسکی آن بان قائم رہی۔ وہ بھاگا تو گھوڑے کی طرح سیدھا ہو کے زور سے نہیں بھاگا بلکہ آہستہ آہستہ دبے پاؤں بلی کی چال۔ اگرچہ نقاب سے باور کھنے کی غرض سے جلتی ہوئی سرخ سرخ سلاخیں ترائی والے کے سامنے کر دی گئی تھیں تاہم وہ اپنے ہزیمت خوردہ حریف کو گھور رہا تھا اور قریب اس کے کہ لگرا اپنے کھڑے میں داخل ہو اس نے ان سلاخوں پر ایک بار اور جست کی کہ حریف پر پھر حملہ کرے۔ لیکن حریف تک نہ پہنچ سکا۔ جلدی سے لگرا اپنے کھڑے میں جا کے ایک کونے میں دم دبا کے چڑا۔ اور ترائی والا آخر وقت تک برابر تیز نظروں سے اُسکو دیکھتا اور غراتار ہائے ذرا ویر کے لیے بھی اُدھر سے نظر نہ ہٹائی۔ پھر دو تین مرتبہ پھر پری پیکے اور اپنے بچے جاٹ کے وہ اٹھ کھڑا ہوا اور مستانہ چال سے اپنے کھڑے کی طرف چلا۔ جو ٹھٹھا ہوا سامنے رکھا تھا۔ اُسکے زخمی شانوں سے بڑے بڑے قطرے خون کے ٹپک رہے تھے اور وہ ایسی شان سے جاٹھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بڑی بہت وجاہت ازلی سے بڑی لے گیا۔

## باب یا ز دہم

بڑے بھاری بھر کم جانوروں کی جوڑ

اتیک میں نے بڑیوں۔ بارہ سنگھوں اور چیتوں کی معمولی لڑائی کا حال تحریر کیا ہو۔ اب میں اُن سے بھی زیادہ گران طریں۔ تنومند اور غنبنک جانوروں کی لڑائی کی کیفیت لکھتا ہوں جنہلے اُنکے اونٹوں کی لڑائی جو جس سے بڑھکے وحشیانہ جنگ تصور میں نہیں آسکتی۔ لکھنویں اونٹ باہم لڑائی کے واسطے سکے جاتے ہیں لیکن قدرت نے اس جانور کو بکار آمد و صلح جو پیدا کیا ہو اور جنگ جوئی کی کوئی شان اُس میں نہیں ہو۔ چنانچہ جب حضرت انسان کو اپنے حظ نفس کے واسطے اُنکو جنگجو بنانے کی غرض سے جد و جد۔ بلیغ کرنا پڑتی ہو تو اس تبدیلی قدرت کی سعی لا حاصل عجب مضحکہ انگیز ہوتی ہو۔

یہ تو بھی جانتے ہیں کہ پیر کے کوہ آتش نشان کی طرح اونٹ اپنے گلے سے حریف پر جھاگ کی بوچھاڑ کر دیتا ہو۔ مگر میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا ہو کہ جو اونٹ لڑائی کے واسطے سکھائے جاتے ہیں پیٹ بھر کے جھاگ اُڑاتے ہیں اور یہ سیر نہایت خوفناک ہوتی ہو۔ کیونکہ ایک اونٹ کا اپنے ماتو نہیں دوسرے کا لانا لانا ہونٹھ رفا کی سے دبا کر کھینچنا۔ کسی بچ سے خوشنام نہیں معلوم ہوتا۔ ان لڑائیوں کا یہ انجام ہوتا ہو کہ یا تو چھوڑ دیتے ہیں اور بھی بد قرار ہو جاتا ہو۔ یا آنکھ پر آئی لگی ہو جاتی ہو۔ مگر خیر

یہ جوتی چو کہ لانا ہے ڈول بدن ہر ایک قسم کے مدد سے محفوظ رہتا ہے۔

گینڈا بھی باخلقت ایک صلح پسند جانور ہے۔ بشپ ہیر صاحب لکھتے ہیں کہ مغلائی الدین حیدر کے عہد میں گینڈا گاڑی میں جوتا جاتا تھا اور اسکی پشت پر بودہ بھی کھینچا جاتا تھا، مگر میں نے گینڈا کو اس حیثیت سے کبھی نہیں دیکھا۔ اگرچہ یہ جانور فطرتاً صلح جو ہے لیکن اونٹ کے مقابلے میں پھر بھی لڑائی کے واسطے زیادہ موزوں جو۔ اسکا قرد لی ایسا سینگ۔ اسکی فولاد سے زیادہ مضبوط کھال۔ اسکا بھاری ہڈی جسم اور اس کے قوی دست و پاؤں۔ یہ چیزیں ایسی ہیں کہ جنگ بل پر وہ بڑے سے بڑے جانور ذکاوت کے مقابل ہو جاتا ہو اور ان کے لیے بھی ہلینا کہ ہوتا ہو۔ اور جب وہ جوش میں آجاتا ہو اسوقت اگر اسے پہلیا پوٹھیں یا باغی کے مقابلے میں چھوڑ دیں تو بیشک وہ ان کو بھی لڑ سکتا ہو شاہ اودھ کے قوش خانے کی عظمت اس امر سے صاف ظاہر ہے کہ میرے زمانہ ملازمت میں

وہاں پندرہ ہس گینڈے تھے۔ اور وہ چاند گنج کے ایک رستے میں چھوٹے اور غھوڑی و اونٹ بھرا لگاتے رہتے تھے۔ اکثر تو اسی چاند گنج میں اور کبھی کبھی مبارک منزل میں دریا کے کنارے موزی جانوروں کی لڑائی ہو کرتی تھی کیونکہ اس مقام پر اس عرض خاص سے بڑے بڑے میدان محاط کیے گئے تھے میدان کے ایک طرف ایک برآمدہ دو منزلہ اسطور پر بنایا جاتا تھا کہ جیسے نکلہ میں بنی طور لندن میں کٹر کوٹھیلوں کے سامنے گاڑیاں کٹری ہو چکے واسطے برآمدے نکلے ہوتے ہیں۔ اور اس کے باہر سے بادشاہ سلامت اور مہم لوگ تماشہ دیکھا کرتے تھے کبھی کبھی یہ لڑائیاں کھلے ہوسے سبزہ زار میں بھی ہوا کرتی تھیں جبکہ گرد بڑے بڑے مضبوط سنون قائم کر کے انیرمجان یا پاڑ پھانڈہ لیتے تھے اور اسکی قطع برآمدے کی ایسی قائم کر دیتے تھے اور وہاں پیہر کے لوگ تماشہ دیکھتے تھے گینڈے لڑائی یوں ہوتی تھی کہ ہاتھوں کی طرح مخصوص موسم میں دو گینڈوں کو مقوی اور منشی چیزیں کھلا کر تیار کرتے تھے اور یا تو احاطہ کے اندر ایک ایک سمت مقابل سے چھوڑ دیتے تھے یا سبزہ زار میں آئے سامنے کر کے ہٹا دیتے تھے۔ اور نہایت ہوشیار و چالاک سوار ہاتھوں میں نیزے لائے دونوں کو کھرید کھرید کر کے دونوں طرف سے ایک دوسرے کے مقابل لاکھڑا کر دیتے تھے۔ جسوقت دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اسوقت انہیں حملہ کرنے کی آمادگی پیدا ہو جاتی تھی کیونکہ بوسوٹھنے سے انہیں فوراً معلوم ہو جاتا تھا کہ حریف مقابل نر ہے یا مادہ۔ پھر وہ اپنی گردن نیچی کر کے چھٹ پڑتے ہیں اور سو کی طرح اپنی پیشانی جو خاردار بھی ہوتی ہو۔ باہر بٹرا دیتے ہیں۔ انکی ٹانگوں اور پیٹھ سے دریائی گھوڑا۔ یہ بد شکل اور موٹا نازہ جانور آگے دو دانت دو ٹٹ کے قریب نکلے ہوتے ہیں۔

کی کھال ایسی دبیز ہوتی ہو کہ قرولی نمائیگ سے کوئی خراش تک بھی اُس پر نہیں پڑتی۔ البتہ اس تیز سینگ سے اُن کے نازک پیٹ یا ٹانگوں کے بچ کی کھال پر کاری زخم لگ جاتے ہیں چنانچہ اُس کی حفاظت کی غرض سے وہ چھپتے وقت سر جھکا لیتے تھے کیونکہ اُس میں دونوں مقاصد حاصل کئے ہیں یعنی اپنی حفاظت بھی ہوتی ہو اور اس کا بھی موقع مل سکتا ہے کہ حریف کی ٹانگوں کی بچ کی کھال پر سینگ پہنچ جائے اور چیر بھاڑ ہو سکے اور اگر کبھی ایسا موقع ملتا ہو تو ایک ذرا اسے اشارے میں سینگ سے کھال پھٹ جاتی ہے۔ چونکہ ہر حریف کو ایسے موقع کی تلاش رہتی ہے اس وجہ سے اکثر یہی ہوتا ہے کہ پہلے اُن کے سر اور پیشانی باہم ٹکرا جاتے ہیں اُس وقت خوب ٹکراؤ ہوتی ہے۔ ایک دوسرے کو دھک دھکیلتا ہو۔ سر کو نیچا کر کے دھکم دھکا کرتا ہو اور دونوں اس زور سے غرائے اور سینگ سے سینگ ٹکراتے اور اس قدر چالاکی اور قوت صرف کرتے ہیں کہ دیکھنے والے کو حیرت ہوتی ہو کہ ایسے بھاری بھر کم جانور یہ کچھ کر سکتے ہیں۔ بالآخر دونوں سینگ سے سینگ تھوٹنے سے ٹھوٹتی اور سر سے سر ٹکراتے جاتے ہیں اور سر اس وجہ سے ملاتے رہتے ہیں کہ ایک دوسرے کو ٹانگوں کے بچ میں یا پیٹ میں سینگ دھسنے کا موقع نہ دے۔ اُس وقت سخت زور آزمائی کے ساتھ باہم دھکم دھکا اور مسلسل ریل پیل شروع ہو جاتی ہو اور ہر ایک اپنے بدن کا سارا بوجھ دوسرے پر ڈالتا ہو اور اُس کی ساتھ پورے جسم کا زور جو قدرت نے عطا کیا ہو دوسرے پر صرف کرتا ہو۔ اور اسی طرح برابر ایک دوسرے کو دھک دھکیلتا چلا جاتا ہو نتیجہ یہ ہوتا ہو کہ زور اپنی جگہ چھوڑنے لگتا ہو اور پہلے تو وہ آہستہ آہستہ قدم قدم کھینچتا اور پھر بڑے زور سے بھاگنے لگتا ہے اور یہ حالت دیکھنے والے کو زور آور حریف اور بھی تیزی و تندہی دکھائے اور گرما گرمی سے باپے تلے کرنے لگتا ہو حتیٰ کہ جبار اکبر و ناب مقادمت نہ لکے زور سے اپنا سینگ اور سر الگ کر لینے کو پیچھے مہلتا ہو۔ اس ہی وقت اطرائی کے تصفیہ اور زور آزمائی کے خاتمے کا ہوتا ہے میں نے اُسکو مختلف طریقوں سے ختم اور فیصل ہوتے دیکھا ہو۔ یعنی اگر منہ محاط ہوتا ہے تو زور کو زیادہ بھاگنے کا موقع نہیں رہتا اور اُس کا حریف غالب یقیناً اسکو بہت اچھی طرح زخموں سے جو کر ڈالتا یا مار ڈالتا ہو اور اُس کے بعد فاتح کو سوار لوگ برجیوں اور گرم سلاخوں سے الگ کر دیتے ہیں۔ لیکن اگر کھلا میدان ہوتا ہو تو زور دار اگر چالاک ہو تو بچوں کے پیچھے بھاگتا چلا جاتا ہو اور بعض اوقات بھاگ بھاگ اُسکو کوئی گزند نہیں پہنچتا۔ البتہ زوردار اُس کا سخت تعاقب کرتا ہو حتیٰ کہ دونوں گنبدے لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں ایسی حالت میں زمیں کی نوعیت اور دونوں کی ہوشیاری و چالاک کی نتیجہ مختصر رہتا ہو۔ کیونکہ تعاقب اندر نہ بنے گا یا تو مفرور کی جان کا خدا ہی حافظ و نگہبان رہتا ہو

بچا رہے کے سینے میں ایک فٹ گہرا زخم ہو جاتا ہو اور اُس کے صدر سے اُسکی جانبی دشا ہوتی ہو۔ البتہ ایک مرتبہ اور صرف ایک مرتبہ میں نے اُسکے خلاف کیفیت دیکھی یعنی لڑتے لڑتے کمزور گینڈا پہلے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹا چلا جا رہا تھا بعد کو زور سے پیچھے کی طرف بھاگا اور اپنے حریف سے الگ ہو جانے میں کامیاب ہو گیا۔ میدان سب طرف سے کھلا تھا۔ دفعۃً حریف غالب مغلوب کی اس حرکت سے متحیر سا ہونے لگا اور گردن اوپر اٹھانے کے دیکھنے لگا اور مغلوب اگرچہ اب تک جان لیکے بھاگ نکلتے نظر آ رہا تھا لیکن موقع بدلنے کے فوراً حرکت کر گیا اور گردن نیچے کر کے حریف غالب کی دونوں رانوں کے بیچ میں اُسنے اپنا سر ڈال دیا اور اپنے سینک سے اُسکا سینہ شق کر ڈالا۔ چنانچہ حریف غالب کے جسم سے خون کھینچنے اور اُسکی درناک چیخنے سے خلاف امید اُس مغلوب کی فتح و نصرت بجائے شکست کے تسلیم کی گئی جو ابھی ذرا پیشتر بالکل زمین چھوڑ رہا تھا۔ بلکہ امید تھی کہ اب زخمی گینڈا بھاگ نکلا۔ اُسکے بدن سے خون نکلا جا رہا تھا اور زخم کے منہ سے انتہائی تک نلی پڑتی تھیں۔ حریف نے اسکو موقع ملنے پر بٹ بٹنے اور چند قدم بھاگنے کا دیا۔ لیکن جیسے ہی زخمی گینڈا اچلا کہ اُسکے حریف نے جھپٹ کر اپنا سینک اُس غریب کی پچھلی ٹانگوں کے اندر ڈال دیا اور زخموں سے اُسے بالکل ہی بیکار کر ڈالا۔ جسے کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ بعد کو سب اوروں نے برجھوں سے فلاح کو بھگا دیا۔ میں نے اُسکی تحقیقات نہیں کی کہ پھر زخمی گینڈا مر گیا یا زندہ رہا۔ اُس زمانے میں غالب کسی سے کچھ سنا ضرور ہو گا۔ غالب وہ بھی یاد نہیں۔ ممکن ہو کہ ان زمانوں سے وہ اچھا ہو گیا ہو یا کچھ لیبر نہیں ہو۔ کیونکہ وہ ہندوستانی جوان جانوروں کی خدمت اور پرورش پر ادانت کرتے ہیں اس معاملہ اور معانات میں بڑے ہوشیار و ملیقہ شعار ہوتے ہیں۔

گینڈے اور ہاتھی کی لطائی ایسی دلچسپ نہیں ہوتی جیسی گینڈے اور چیتے کی لطائی گینڈے اور ہاتھی کی لطائی باوجودیکہ دونوں مست ہو کیوں نہ ہوں کچھ آسان امر نہیں ہو۔ اگر کبھی دونوں کو لڑنے کا اتفاق پیش آتا ہو اور دونوں حملہ آور می پر آمادہ و مستعد ہو جاتے ہیں تو بیشک بہت سخت زور آزمائی جانبین سے ہوتی ہو۔ ہاتھی اپنی سونڈ اٹھائے۔ منہ نکلائے۔ ایک طرف سے اور گینڈا اپنا سر جھکائے دوسری طرف سے مقابلے کو بھیتتا ہو۔ ہاتھی کے دونوں دانت گینڈے کے دونوں پہلوؤں میں گر جاتے ہیں لیکن زیادہ نقصان نہیں پہنچاتے۔ پھر ہاتھی اپنی چوٹی پیشانی سے گینڈے کو پیچھے رہاتا ہو۔ اگر کبھی شاڈ پور پر ہاتھی کے دانت گینڈے کی کھال میں پیرست ہو گئے تو یہ دھنسا بے پناہ ہوتا ہو۔ پھر اُس غریب کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ اگر

یہ دیکھا گیا ہو کہ گینڈا اپنا تیز سینگ ہاتھی کی اگلی رانوں کے درمیان میں ڈال کے اُسکی کھال چیر ڈالتا ہو۔ اور ہاتھی اگرچہ اپنی سونڈ سے موقع بچاتا رہتا ہو۔ لیکن بچتا نہیں۔ البتہ اُس کی سونڈ کی وجہ سے گینڈا مجبور ہو جاتا ہو کہ اپنا سینگ اُسکے جسم میں دوڑنک نہیں پہنچا سکتا۔ اور یہی وجہ ہوتی ہو کہ ہاتھی کو جو زخم لگتا ہو وہ کچھ ملک نہیں ہوتا۔

گینڈے اور تیندے کی لڑائی البتہ بڑی جان دار اور گرما گرم ہوا کرتی ہو۔ بڑے جانور کا اپنی مضبوط اور مستقل سامان حفاظت سے اپنا بچاؤ کرنا۔ چھوٹے جانور کا دبے پاؤں اور بلی کی چال چلکے پھر چھیننا اور حملہ کرنا۔ ایک کی جھکی ہوئی پیشانی اور تیز سینگ۔ دوسرے کے نیلے دانت ایک کے پاس بل کھائے ہوئے سینگ کا حفاظت کی غرض سے ہونا۔ دوسرے کے پاس گول گول سر اس میں جکتی ہوئی آنکھیں اور آنکھوں میں خارا شگاف تار قطرہ اور پھر زید براں خارا در پمچہ۔ یہ چیزیں ایسی تھیں جس پر سبکی نگاہیں جمی رہتیں اور بڑی دلچسپی سے جمی رہتیں۔ گینڈے کی بیٹھ پر قسم کے حملے سے محفوظ رہتی ہو۔ جب تیندہ اُس پر زقند بھر کے اپنے پنجے سے طمانچہ مارتا ہے۔ تو اُسے بد پرندہ اخراش تک نہیں آتی۔ اگرچہ تیندہ اُسے چت لٹکے اُسکی بیٹ کی کھال اپنی پنجوں سے پارہ پارہ کر کے مار ہی ڈالتا ہو۔ میں نے ایسے نتائج کا حال تو ضرور سنا ہو لیکن آنکھوں سے کبھی نہیں دیکھا کہ یہ شاذ ہو ورنہ فیصدی ننانوے لڑائیوں میں گینڈا ہی غالب رہتا اور ظفر مند نکلتا ہو۔ اور اُسکی صورت یہ ہوتی ہو کہ تیندہ اُس پر بار بار چھیننا اور طمانچے چلاتا ہو لیکن اُسکے زہر پوش بدن پر اُس کا کچھ بس نہیں چلتا اور کوئی سحر اس آہنی قلعے میں اثر نہیں کرتا جب وہ حملہ کرتے کرتے تھک جاتا ہو تو گینڈا کسی طور پر موقع پلکے اپنا جھکا ہوا تیز باڑھ دار سینگ اُسکی کھال کے اندر کر دیتا ہو تیندہ وہاں چونکہ حملہ کرنے کی جانب سے بے پردہ اور لڑائی سے دست بردار ہو چکتا ہو۔ لہذا جس وقت گینڈا اُس پر حملہ کرنے لگتا ہو وہ آسانی سے بھاگ نکلتا ہو۔

دنیا میں کوئی جانور ایسا نہیں ہو کہ تیندے کی طرح تیز استقلال و بامردی اور اطمینان و سنجیدگی کیساتھ حریف کے حلوں اور ضربوں کی برداشت کر سکتا ہو۔ تب اُسے ایک شیر کے ساتھ کسی چھوٹے سے ساحل میں چھوڑ دیتے ہیں اُس وقت بھی وہ کسی جگہ سے بچیں اور پریشان نظر نہیں آتا وہ کہیں سے بدحواس اور مضطرب نہیں ہوتا بلکہ بڑی طمانیت و دلچسپی کے ساتھ ہر بلا سے سامنا کرنے اور ہر مصیبت کے بھیلنے کو کھڑا ہو جاتا ہو۔ سچ یہ ہو کہ اُسکی مضبوط زہر کی ایسی مستحکم کھال قدرتی طور پر اُسکی حفاظت کی سپر ہوتی ہو۔ اُسکے چہرے کی ساخت بھی اس قسم کی ہو کہ اُس پر بھی کوئی حملہ اثر نہیں کر سکتا۔ تھو تھنی سے

لیکھتے تھے کہ اسکا چہرہ بیچھا سا ہوتا ہو اور آنکھیں بڑی بڑی اٹھی ہوئی ہڈیوں کے حلقے میں ایسی اندر کو گھسی ہوئی ہوتی ہیں کہ انپر کوئی حربہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ اسکا چھوٹا خمدار سینک بھی بجائے خود ایک آلہ حفاظت خود اختیاری کا ہو اور دوسرے جانور و نکلے دریا خالیہ گینڈے کی جسمانی طاقت پر نظر کیجاتی ہو) حق میں ایک خطرناک حربہ بالانہم حیوٹ یہ اپنے سے زیادہ قوی اجتناد و غضبناک جانوروں کے (جیسے ہاتھی یا شیر) مقابلے میں کھڑا ہوتا ہو تو بڑی حیرت معلوم ہوتی ہو۔ میں نے گینڈے کا مقابلہ کبھی شیر پر سے ہوتے نہیں دیکھا۔ کیونکہ شاہ اودھ کے ہاں صرف تین چار شیر بر تھے۔ اور وہ خاص مواقع کے واسطے نگار کئے گئے تھے۔ لیکن مجھے میں ذرا شبہ نہیں کہ شیر اور گینڈے کی لڑائی بالکل تیندو سے اور گینڈے کی ایسی ہوتی ہوگی۔ کیونکہ دوشیر اسی طرح لڑتے ہیں جیسے دو چیتے یا تیندو سے لکھنؤ میں کوئی شیر ایسا نہ تھا جو دو ہانکے سب سے بڑے تیندو سے ہمسری کر سکتا بیشک ہمالیہ کے شمال و غرب میں اور بالعموم ایشیا میں جیسے دوا یک شیر لڑتے ہیں ویسے افریقہ میں نہیں ملتے لیکن مجھے اس بارے میں بہت شک و شبہ ہو کہ شمال کا تیندو شیر سے زیادہ خطرناک ہوتا ہو۔ جیسے بڑے تیندو سے میں نے لکھنؤ میں دیکھے انکے مقابلے کا کوئی شیر بھی لندن یا برلن میں میری نظر سے نہیں گزرا۔

منجملہ دیکھو لڑائی کے ہاتھیوں کے جوشہ اور دھرم کی سرکار میں تھے ایک ہاتھی صرف ایک ڈنٹ کا  
ایسا زور اور اور کوہ پیکہ تھا کہ تنہا اُسے سو مرتبہ لڑائی میں فتح حاصل کی تھی۔ اس ہاتھی کا نام پیر تھا  
اور بادشاہ سلامت اُسے بیحد عزیز رکھتے تھے۔ اسکا ایک دانت بہت سی مختلف لڑائیوں میں تدریج  
بالکل ٹوٹ گیا تھا کیونکہ ہاتھی اپنے دانتوں سے اس زور سے رٹتے ہیں کہ کبھی دانت کا ایک  
ٹکڑا اور کبھی مسلم دانت اس زور آزائی کے نذر ہو جایا کرتا ہے۔ چنانچہ ملیک کو دانت بھی ٹوٹا تھا اگر  
ٹوٹا تھا۔ میر جب جوش میں ہوتا تھا جسے مستی سے تعبیر کرتے ہیں انہو اُس وقت وہ بھی خطرناک  
ہو جاتا تھا۔

جس زمانے میں صاحبِ مکملہ اندر انجمنِ افواجِ انگلشیہ تشریف فرما لکھنؤ ہوئے تھے ہادشاہ نے یہ تجویز کیا کہ ہر کے مقابلے کی واسطے کوئی ہاتھی پیش کیا جائے اور ایک بار اور ہر کی ٹرائی ہو۔ اتفاق کی بات کہ اُس زمانے میں ہر بھی مست تھا اور ایک اور سیاہ رنگ کا ہر زبردست ہاتھی بھی مست ہو گیا تھا۔ ان دونوں کا جوڑ بد لگیا۔ اور ٹرائی اُٹے ہو گئی۔ بستی کی حالت میں دونوں ہاتھی ایک دوسرے کو دیکھتے ہی آمادہ جنگ ہو جاتے ہیں۔ انھیں کسی ترغیب کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر ہاتھی کی گردن پر اسکا ہات بٹھا ہوتا ہو اور سوا ہمارا



کسی اور کی مجال نہیں ہوتی کہ مستی کی حالت میں اُس کے پاس چٹک سکے اور اس حالت بے اختیار  
و غصہ نہائی میں بھی وہ بچوں کی طرح پوری طور پر ہمارے قابو میں ہوتا ہے۔ ہاتھوں کی لڑائی  
کے واسطے کچھ زیادہ اہتمام کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف ایک مضبوط رسی ہاتھ کی گردن سے  
لیکر اُسکی دم میں باندھ دیتے ہیں۔ اور لڑائی کے وقت ہمارے اسی رسی کو تھامے ہوئے ہاتھ  
کی گردن پر جا بیٹھا رہتا ہے۔ یہ بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے کہ لڑائی کے وقت ہمارے ہمارے ہاتھ کی جان  
کیسے سخت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ مگر وہ اپنے ہاتھ اور نیز خود اپنی نمود اور ناموری کا ایسا اندازہ  
ہوتا ہے کہ اُسکی دلی تمنا یہی ہوتی ہے کہ اسی کا ہاتھ لڑائی کے واسطے انتخاب کیا جائے اور وہ کسی  
طرح اس جو حکم سے نہ منہ چھپاتا ہے نہ جان چراتا کیونکہ اس میں جو کچھ نمود ہوتی ہے ہمارے ہاتھ کی گردن  
ہوتی ہے۔ اگر اتفاقاً ہمارے ہاتھ پر سے گر پڑتا ہے تو حریف ہاتھ موقع پاتے ہی اُسکی جان ہی  
لے ڈالتا ہے۔ ایسے وہ نہایت ہوشیاری سے رسی پر گھومتا پھرتا ہے۔ اور اس مضبوطی سے رسی پکڑتا ہے  
جیسے کسی جادو شکر کے تختے کو ڈوبتا ہوا آدمی۔

جس زمانے میں صاحب لکنا پڑا بحیف کی خاطر یہ تماشہ دکھلایا گیا تھا تو ہم سب معربادشاہ سلامت  
اور اُنکے درباریوں کے دریاے گوشتی کے کنارے ایک کونٹھی میں جا کے بیٹھے تھے۔ ایک جانب دریا گوتی  
کے کنارے باندھ رکھے برآمدہ نکال لگایا تھا اور دوسرے کنارے پر روضہ تھا یہ ٹھہرا ہوا تھا کہ لڑائی وہیں ہو اور  
ہر گز برآمدے سے سیر کریں۔ گوشتی کا پاٹ اس مقام پر لیٹ اسٹریٹ لندن کے برابر چڑھا تھا اور  
چونکہ برآمدہ تلخ آب پر نکلا ہوا تھا لہذا ہلوگ بہت ہی قریب سے لڑائی کا تماشہ دیکھ سکتے تھے دوسرے جانب  
رشتے میں جہاں تک آنکھ کام کرتی تھی برابر سبزہ زار نظر آتا تھا۔ اور کوئی چیز حجاب نہ تھی۔

بادشاہ کے اشارہ فرماتے پر دونوں طرف سے ہاتھ (جنہ ہمارے سوار تھے) چھوڑے گئے  
ایک دوسرا دیرینے حریف کے مقابلے میں زیادہ گراں ذیل نہیں معلوم ہوتا تھا کیونکہ اُسکے دانت بہت  
زبردست تھے جسوقت ہاتھوں کی نظر دوچار ہوئی اپنی اپنی سونڈ اور دم اٹھا کے بے تحاشا ایک  
دوسرے پر حملہ کر نیکے واسطے دوڑے۔ بالعموم ہاتھوں کی لڑائی اسی عنوان سے شروع ہوتی ہے۔  
وہ اپنی سونڈ پیٹھی اٹھا لیتا ہے تاکہ اس پر کچھ گزند نہ پہنچے اور حالت غیظ و غضب میں اُسکی دم بھی  
اسی طرح اٹھی ہوتی ہے اور اسکی چنگھڑ گھڑا ہٹ کے ساتھ ہوتی ہے۔

بلبر اور اُسکے حریف میں پہلے بڑے زور سے ٹکرا بازی ہوئی مستک ت مستک اسن دیر لڑتی تھی کہ  
ٹکروں کے دھماکے کی آواز آدھے میل کے فاصلہ پر اچھی طرح سنائی دیتی تھی پہلی ٹکرا بازی ہو چکی

تو دونوں ہاتھوں نے منہ سے منہ اور دانت سے دانت ملا کر زمین پر قدم مضبوط جا دیے صرف سوئیں جو اوپر کو سیدھی اٹھی ہوئی تھیں الگ رہیں اور حکم دھکاریں پیل شروع ہوئی۔ یہ لڑا پیل سلسل ہوتی تھی ان کے سر ایک لمحہ کے واسطے بھی جدا نہیں ہوتے تھے البتہ انکی میٹھیں زور کرتے کرتے کبھی خم ہو جاتی تھیں اور کبھی تن جاتی تھیں جس سے انکی زور آزمائی اور ہم تن مصروفیت کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا۔ دونوں کے مہاوت گردنوں پر بیٹھے ہوئے اپنی ہوشیار سی اور کمال دکھا رہے تھے۔ آنکھوں کے پہلے زور زور سے لگاتے اور جلا جلا کے اپنے اپنے ہاتھی اکوجرات اور جوش دلا رہے تھے۔ یہ تاشہ دیکھ کر ہر تاشائی سناٹے کے عالم میں چوہتا تھا اور اس کا خون رنگ نہیں جوش مارنے لگتا تھا۔ یہ عجیب سماں پیش نظر تھا کہ ایسے کوہ پیکر جانور کیسا جمی توڑ کے ایک دوسرے کو ریل رہے ہیں اور ہوشیار و تجربہ کار مہاوت کس قدر شد و مد سے اپنے ہاتھوں کو لڑنے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

ایسی لڑائی کا معمول ہو کر زور اور چاؤر ہمیشہ بازی لیتا ہوا ہے۔ کبھی کبھار ایسا بھی اتفاق پیش آ جاتا ہو کہ زور اور اپنے ہی جھونک میں نیچے آ رہتا ہو اور کمزور فتح پا جاتا ہو۔ مگر ایسے اتفاقات شاذ ہیں۔ اور بہ نسبت اور جانور دیکھے ہاتھوں کی لڑائی میں اور بھی کم ایسا اتفاق ہوتا ہو۔ اگر کوئی یہ بوجھ کر آخر اس حکم دھکاریا پیل کا نتیجہ کیا ہوتا ہو، تو اسکا سہل جواب یہ ہو کہ جب زور اور کمزور دھکے دے گا تو گرا دیتا ہو تو اکثر اوقات کمزور کی جان ہی پر بخائی ہو۔ لیکن یہ اکثر اسوقت ہوتا ہے جب بہت تیزی و تندہی صرف کیجاتی ہو اور غلبت کے ساتھ پیانے چلے ہوتے ہیں اور کمزور کو تعجیل تمام پیچھے بھاگنے کا کوئی موقع نہیں مل سکتا۔ پس دل سے امید اور بہان سے طاقت دونوں ایک ہی وقت رخصت ہوتے ہیں اور وہ بیچارہ گھبرا گھبرا کر اوپر اوپر بھاگنے کی کوشش میں مڑتا ہو جس جادھر پہنچا ہو اُدھر ہی سے حریف اُسے دھکے دے داتا ہو۔ آخر کار وہ چونہ بھا جاتا اور میطرح گر پڑتا ہو۔ اور پھر حریف اُسکے پہلو میں لیٹے دانت دھنسا کر اُسکی جان لے ڈالتا ہو۔ لیکن اگر کمزور کسی طرح پھرتی سے مڑ کر اپنی جان بچا لے جاتا ہو تو بازی زور اور کے ہاتھ رہتی ہو اور حتی المقدور وہ مغلوب کا نقاب کرتا ہو اور اگر مد میطرح ہو جاتی ہو تو مستک سے خوب کمریں مارا تا اور دانتوں سے بالکل زخمی کر داتا ہو۔ یہ جلد مشرقہ تھا اب میر کی داستان سنو۔

میر اور اسکا حریف برابر زور آزمائی میں مصروف اور اپنی اپنی جگہوں پر پامردی و استقلال کے ساتھ جمے ہوئے تھے۔ اور بادشاہ سلامت صاحب کمانڈر انچیف۔ صاحب رزٹینٹ اور ہم سب

نہایت غور و مائل سے دم بخود اس زور آزمائی کا تماشا برآمدے پر سے دیکھ رہے تھے۔ برآمدے پر سکوت و محویت بلکہ بخود کی کا عالم طاری تھا۔ رفتہ رفتہ پہننے دیکھا کہ اک دتا میر اپنے حریف پر قابو پائے لگا۔ اسکا اٹکا پاؤں نہ معلوم آگے بڑھنے کو یا پیچھے بھاگنے کو زمین سے اٹھ گیا۔ لیکن ابھی وہ بڑی مصروفیت سے زور آزمائی کر رہا ہو۔ ایک لمحہ کے بعد فوراً کھل گیا کہ یہ پاؤں آگے بڑھنے کو نہیں اٹھا تھا بلکہ بھاگنے کی غرض سے کیونکہ ابھی یہ پاؤں زمین پر رکھا نہیں گیا تھا کہ دوسرا لگا پاؤں بھی زمین پر سے اٹھا کر پھر زمین پر آگیا۔ میر کے ہاوت کی نظر اس حرکت پر پڑی۔ وہ فوراً آٹو لگا۔ اب اس نے پہلے سے زیادہ بے تکان غل عجائبا شروع کیا اور بڑی زور و زور سے میر کے سر پر آنکس مارنے لگا۔ اسوقت میر کو جوش دلانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ وہ بوڑھا خزانہ تھا اپنے پاؤں لگات خوب سمجھتا تھا۔ اسے خود معلوم ہو چکا تھا کہ اب فتح و نصرت کا سہرا اس کے سر نہ بچا جا رہا ہے اور اس خیال سے اسکی ہمت بلند ہو چکی تھی۔ اور ہاوت کی طرح اسکا دل بالنوں بڑھ رہا تھا۔ اسوقت دونوں ہاتھی ساحل سے چند گز کے فاصلے پر تھے اور ہزیمت خوردہ ہاتھی آہستہ آہستہ پیچھے کھسکتا ہوا۔ رفتہ رفتہ بالکل لب دریا پہونچ گیا آخر کار رفتہ آہستہ پیچھے پاؤں سے ایک جست کی اور حریف کے پیچھے سے اپنے کو چھڑاکے دریا میں کود پڑا۔ اب اسکا ہاوت رسی پکڑ کے پیٹھ پر پہونچ گیا لیکن تھوڑی دیر بعد پھر اسکی گردن پر سوار نظر آیا۔ اور ہاتھی پرتا ہوا دوسرے کنارے پر پہونچا اور بھاگا۔ میر کو حریف کے اسطرح بھاگ بھگنے پر بھی غصہ آگیا۔ اسکا ہاوت ہزار اسے بانی میں جلی ترغیب دیا کہ گرا آئے اور پیچھے ہی نہ کیا اس پلے پر نہ آیا۔ بلکہ غیظ و غضب کی حالت میں وہ چار طرف اس غرض سے بگھومنے اور گھور گھور کے دیکھنے لگا کہ کسپر حلہ کرے اور غصہ اتارے۔ اسکا ہاوت اب بھی آنکس پر آنکس اترتا اور فل شور مچا کے اسے اپنے پس میں لائیں کی کوشش کرتا تھا اور جانتا تھا کہ کسی طرح وہ حریف کا تعاقب کرے۔ اسی کوشش میں تھا کہ ایک بار میر نے پلٹا کھایا اور اس کے گھومتے ہی ہاوت غریب کا آسن اٹھ گیا اور وہ دھم سے زمین پر آ رہا اور اسی ہاتھی کے سامنے چاروں شانے چت گر پڑا جسے مار مار کے وہ خود جوش و لالہ تھا ہلوگوں کو فوراً یقین ہو گیا کہ اب اس بجا پرے ہاوت کی جان کی خیر نہیں۔ وہ اس شان سے زمین پر پڑا تھا کہ ایک پاؤں سمیٹے۔ ایک اوپر اٹھائے اور دونوں ہاتھ نہایت حسرت و بکیسی کے ساتھ آسمان کی طرف اٹھ ہوئے۔ کہ دفعۃً ہاتھی نے ایک پاؤں اس غریب کے سینے پر رکھ دیا اور ہلوگوں کے چٹا چٹ ٹوٹنے کی آواز ہمارے کانوں تک پہونچی اور دو گھڑی میں اسکی کچلی۔ بد ہیبت لاش سامنے نظر آنے لگی۔

اُسے چلانے غل مجانے۔ داد فریاد کرنے کا بھی موقع نہ مل سکا۔ ہاتھی کی گردن سے جیسے ہی وہ چاروں شانے چت زمین پر گرا ویسے ہی ہاتھی کا پاؤں اُسکے سینے پر پھونکیا۔ اور آنا فانا ہڈیاں چرمرکے رہ گئیں۔ لیکن ابھی ہاتھی کا غصہ فرو نہیں ہوا تھا سینے پر پاؤں رکھے ہی رکھے اُس نے اپنی سونڈ سے اُسکا ہاتھ پکڑا اور اُسے شانے سے اکھاڑ کے پھینک دیا۔ پھر دوسرا ہاتھ پکڑا اور وہ بھی اسی طرح خون میں تھڑا ہوا ہوا پر اڑتا نظر آیا۔ یہ بھی کیا ہیبتناک سماں تھا جسے خیال کر کے اب بھی رو نہ گئے کھڑے بچھڑتے ہیں اور جس وقت یہ سماں پیش نظر تھا اُس وقت تو جتنے دیکھنے والے تھے سب تھڑا گئے تھے۔ مگر اسکا الزام سوا ہاتھی کے اور کسی پر آ نہیں سکتا تھا کیونکہ یہ کسی اور کی خطا نہ تھی۔ ابھی ہم لوگ تماشے کے اس بد انجام سے متاثر ہی تھے کہ ہم نے دیکھا کہ ایک عورت بڑی زور سے جھپٹتی ہوئی میری طرف آرہی ہے اور اُسکی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ دبا ہوا ہے۔ یہ دیکھ کے ہلوگ اور زیادہ مضطر و بدحواس ہو گئے تھے کہ صاحب کما ٹرا نجیف بیتابی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور بادشاہ سے کہنے لگے کہ ”جائناہ اور خون ہوا چاہتا ہے۔ بُد خبر لیجیے۔ کیا کوئی تدبیر اس کے روکنے کی ممکن ہی نہیں؟“ بادشاہ سلامت فرمانے لگے کہ ”کیا کیا جائے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ عورت اسی مہات کی معلوم ہوتی ہے“ لیکن صاحب رزیدنٹ حکم دیکھ چکے تھے کہ سانٹے مار جلد دوڑیں اور ہاتھی کو ہنکا لائیں۔ اگر چہ یہ حکم دیا گیا تھا مگر فوراً تعمیل دشوار تھی۔ کچھ تو حکم پہنچنے میں تو قف ہوا۔ کچھ سواروں کے سوار ہونے اور پانچ پانچ کا پر ابانہ مکے چلنے میں دیر ہوئی۔ یہ سوار اپنے لائبے برچھونکی اتنی ہاتھی کی نازک سونڈ سے جھبھ کر اُسکو ایک طرف ہنکا لیا کرتے ہیں حقیقت میں وہ اپنے فون میں طاق ہوتے ہیں اور اگر ہاتھی اُنکے برچھونکی جھٹ بجائے مقابلے پر آمادہ ہو جاتا ہو تو وہ نہایت پھرتی اور چالاک سے گھوڑے کو کو دبا کے فوراً اٹک ہو جایا کرتے ہیں۔

ابھی سانٹے مار جلد جلد سوار ہو کے نہایت ہوشیاری کے ساتھ دو سمتوں سے ہاتھی کے قریب جا رہے تھے۔ کہ وہ عورت بڑی دلیری سے حیون و خطر ہاتھی کے پاس پہونچ گئی اور چلائی کہ ”اے میرے میرے میرے۔ جلا۔ دیکھ تو میری تو نے یہ کیا غضب ڈھایا ہے اب پوری طرح گھر کا ناس کر دے۔ تو نے چھت تو ڈھادی دیواریں باقی ہیں۔ وہ بھی گرا دے۔ میرے والی کو تو مار چکا۔ اُسے تو بہت پیار کرتا تھا۔ اب اُنکی روئے والی ایک ہیں باقی ہوں اور ایک یہ بچہ لے اُنہیں بھی اُنسی کے پاس پہونچا دے“ جو لوگ ہندوستان سے نا آشناے محض ہیں اُنکو یہ گفتگو محلِ عزافت اور قابلِ مضحکہ معلوم ہوگی۔ لیکن قریب قریب یہی الفاظ اس عورت نے اُس رنج و غم میں اپنی زبان سے نکالے تھے

اور عرصے تک اُسکا ایک ایک لفظ میرے کانوں میں گونجتا رہا۔ بات یہ ہو کہ ہمارے اور اُسکے بال بچے اپنے ہاتھی کے ساتھ ساتھ رہا کرتے ہیں اور اُسے آدمی کی طرح بھڑکنے، خفا ہوتے۔ اور خفا ہوتا ہوتا منانے۔ اُٹکی تعریف یا خوشامد کرتے اور اُسپر اپنا غصہ دھنکی دکھاتے رہتے ہیں۔

یہ حالت دیکھتے بھلوگوں کو بالکل یقین ہو گیا کہ اب کوئی دم میں میرا اپنے ہمارے ہمارے بارہ بارہ لاش سے جدا ہو کر اُسکی غریب بیوہ اور یتیم بچے کا بھی خون کر ڈالے گا۔ لیکن ہمارے خیالات بالکل غلط تھے اور برعکس کیفیت پیش آئی یعنی میرا غصہ فوراً فرو ہو گیا۔ اب وہ اپنے کردار پر پتچانے لگا۔ اُسے اپنا پاؤں لاش پر سے اٹھایا۔ تب تو یہ عورت ہاتھی سے چٹ لگئی ہاتھی بھی اُسکے زار مارنے پر متاسف و پشیمان کھڑا ہو گیا۔ یہ سنا بھی عجیب دردناک تھا کہ عورت ہارے والے کا غل چاتی اور گرد پھر پھر کے ہاتھی کو ہزاروں صلواتیں سنارہی تھی اور ہاتھی اپنی نازیبا حرکت پر نادم و منفعل ساکت کھڑا اور غمگین نظر سے اُسکی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسی اثنا میں معصوم بے زبان بچے نے دو تین بار ہاتھی کی سونڈ پکڑ لی اور اُس سے کھیلنے لگا جس سے ثابت ہو رہا تھا کہ وہ سونڈ سے کھیلنے کا عادی ہو رہا تھا۔ کیونکہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ ہمارے لڑکے برابر ہاتھی کی اُٹکی ٹانگوں کے بیچ میں کھینٹے کھینٹے گھس جایا کرتے ہیں اور ہاتھی آہستہ آہستہ اپنی سونڈ کو اور ان شفقت سے اُن کے اوپر اُدھر اُدھر گھومایا اور اُنکو جھولا جھولا یا کرتا ہے۔

اس درمیان میں سانٹے مارا پہنچے۔ یہ لوگ عمدہ۔ چالاک گھوڑوں پر سوار تھے۔ اور انھوں نے دونوں طرف سے آہستہ آہستہ اپنے نیزہ کی دوکس اُسکے جسم پر لگا کیں اور اپنے منشا سے اُسکو آگاہ کر دیا۔ میرے بہیم ہو کے ایک بار کان پھٹ پھٹائے اور غمگین نگاہ سے سوار کو دیکھا اُسکے جسم پر دو سے صاف پایا جاتا تھا کہ اُسکی مرضی یہ ہو کہ سواروں کو اپنے کرب دکھانے کی ضرورت نہ پڑے بلکہ ہمارے ہاتھی کی عورت جبراً چاہے اُسے ہٹا لے جائے۔ پھر سواروں نے اپنے نیزے سے اُسکے بدن میں چھوڑے اور اُنکو دراز سے چھوڑے۔ اب تو اُسے بھی اپنی سونڈ پکڑ لی اور زور سے چنگھاڑ کے بائیں جانب کے سواروں پر چھٹا۔ لیکن فوراً ہی سواروں نے گھوڑے کو داسے اور انگ ہو گئے۔ میرے بیچے دوڑا اور سوار زور سے بھاگ کر ایک دہرا چاند سے اور میری نظر سے غائب ہو گئے۔ لیکن میرا غصہ اُچکا تھا۔ وہ پھر ہوا۔ زارہنی طرف کے سواروں پر چھٹا اور وہ بھی اُسی طرح بچ پھا کے نکل بھاگے۔ میرا اُنکے بھی بیچے دوڑا اس وقت بادشاہ سلامت نے چلا کے فرمایا کہ ”ہمارے ہاتھی کی عورت سے کہو کہ وہ میرا کر لے۔ اُسکے بلانے سے ضرور وہ چلا آئے گا۔“ چنانچہ عورت نے میرا کھینچا اور جرح کرنا اپنے اُنکے کی آواز پر نرم دبانے لگا۔

پڑتا ہو۔ میری بھی اس عورت کی آواز سنتے ہی سیدھا چلا آیا۔ جب بادشاہ نے حکم دیا کہ دیکھو اس عورت سے کہو کہ ”بچے کو لیکر اسپر سوار ہو جائے۔ اور ہنگامہ لیا جائے“ فوراً یہ حکم اُس عورت تک پہنچا دیا گیا۔ اور میرا اسکے کھنے سے بیٹھ گیا۔ اور عورت میرے سوار ہوئی۔ پھر میرے اپنی سوئڈ سے پہلے مہات متولی کی لاش اور میرا اسکے رٹے کو اٹھا کے عورت کے حوالے کر دیا۔ اور یہ عورت ہی بجائے اپنے شوہر کے میری مہات مقرر ہو گئی۔ کیونکہ اُسے کوئی دوسرا مہات پسند ہی نہ آیا۔ اور سخت غیظ و غضب اور جوش و خروش و مستی کی حالت میں بھی وہ اسی عورت کا مطیع و فرمانبردار بن رہا تھا۔ وہ کیسا ہی بھرا دوجوش میں بھرا کیوں نہ ہو جہاں اس عورت نے اپنا ہاتھ اسکی سوئڈ پر پھیرا اور اُسکا سارا جوش و خروش جاتا رہا۔ عورت بھی بالکل بڑبڑاتی اور بے خوف و خطر اسپر سوار ہوتی اور کل کام اُس سے لیتی تھی۔ نکلن غالب تو یہی ہو کہ جس قدر قابو عورت نے میرے پر حاصل کیا تھا اُسکے مرنے کے بعد اُسکے رٹے کو بھی وہی قابو حاصل ہوا ہوگا۔ ایک مہات کی ہلاکت کی کیفیت تو میں بیان کر چکا اب ایک دوسرے مہات کی جان بچانے کی سرگزشت سناتا ہوں۔

ایک مرتبہ ہاتھیوں کی لڑائی کے وقت ایک رتنے میں (جسکے چاروں طرف آہنی کھڑا لگا ہوا تھا) یہ اتفاق پیش آیا کہ میرے دو دن ہاتھی بڑے زور شور کے ساتھ باہم ریل بیل کر رہے تھے کہ دفعتاً کمزور ہاتھی ہمت ہار کے اپنے حریف کے مقابلے سے بھاگ نکلا۔ اور رتنے کے چاروں طرف چکر کاٹنے لگا۔ اسکا حریف بھی اُسکا پیچھا لے ہوئے برابر دوڑ لگا رہا تھا۔ اس حالت کو دیکھکے یہ حکم دید گیا کہ ہزیمت خور وہ ہاتھی کو نکل جانے کی راہ دید بجائے۔ لیکن جس وقت وہ نکل کے بھاگا اُسی وقت اتفاقاً میرا اسکا مہات اُسکی گردن پر سے الگ ہو کے زمین پر گر پڑا۔ مگر ابھی تعاقب کنندہ ہاتھی کی نظر اسپر نہیں پڑی تھی لیکن جس وقت یہ ہاتھی کھڑے کے پاس کھڑا ہو کر ٹوک گیا اسوقت میرا سے مہات کیجان کا خدا ہی حافظ و نگہبان تھا۔ کیونکہ اب اُسے مفکری کوئی صورت نہ تھی۔ ذرا کی ذرا وہ ہاتھی کی نگاہ سے بچا رہا۔ لیکن کب تک چھپ سکتا تھا۔ آخر اُسے دیکھ ہی لیا اور دوڑ بیٹھ ہی اُسے ریلنا اور برسنا شروع کر دیا۔ اسوقت مہات کی جان بری کی کوئی تدبیر ممکن نہ تھی۔ کیونکہ یہ صورت و حالت پیش آگئی تھی۔ بالآخر ہاتھی اس غریب پر پل پڑا۔ کیونکہ ہاتھی صرف اپنے ہی مہات سے راضی رہتے ہیں اور حریف کے مہات کو ہمیشہ دشمنی کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس ہاتھی کے مہات نے ہزار روکا کہ اُس غریب کی جان کسی طرح بچ جائے مگر وہ غصے میں بھرا اور بر جھا یا اور اٹھسا کسی طرح اس کے قابو میں نہ آیا۔ اور اُسکی کوئی کوشش کارگر نہ ہوئی۔ ایک بار اُسی نے سنا میرا

حلقہ کرنے کے واسطے اپنی سونڈ اٹھائی اُسوقت بیچارہ مہادت کھڑے کے ایک کونے سے لگا ہوا سٹا سہا کھڑا تھا۔ ہاتھی نے اپنی مشک ٹیک کے بڑی زور سے ریل اور اُس کے دونوں دانت کھڑے کی سلاخوں کے درمیان فیصل میں باہر نکل آئے اور مہادت بیچ میں آگیا۔ اب وہ اپنی مشک سے بعینہ اُسی طرح زور زور سے ہولے مارتا تھا۔ جیسے مقابلے پر کوئی ہاتھی ہوتا اور اُسے ٹکرانا بیچارہ مہادت کھڑے کے کونے سے چپٹا ہوا بہت ہی بدن کو سٹائے کھڑا تھا۔ اور ہاتھی ٹکر پر ٹکر مار رہا تھا۔ لیکن اس شخص نے اپنے بدن کو کھڑے سے چٹ کر اتنا سکڑا اور اپنے دونوں ہاتھ اس طرح بٹھے کے پیچھے کر لیے کہ جس سے وہ بالکل ڈبلا تپلا معلوم ہونے لگا۔ اور اوپر سے ہلوگ جو دیکھ رہے تھے تو ہم سب ہی خیال کر رہے تھے کہ ٹکروں کے مارے بیچارہ بالکل بچی ہو گیا ہوگا۔ اور ہڈیاں پسلیاں سریر ہو گئی ہونگی۔ لیکن یہ ہم لوگوں کی غلط فہمی تھی کیونکہ مہادت نے اپنے کو کھڑے کے گوشے میں ہاتھی کی ٹکروں سے محفوظ تصور کر کے اپنا بدن خوب سکڑا تھا پھر نہایت ہوشیاری سے بدن جرا کر آہستہ آہستہ جھکنا شروع کیا اور ایک بارگی بیٹھ گیا۔ ہاتھی جو کھاسکو دیکھ نہیں سکتا تھا اپنے دل میں ہی سمجھتا رہا تھا کہ ٹکریں مار مار کے مسکا کام تمام کر چکا ہو۔ بیٹھنے کے ساتھ ہی مہادت ایک دم سے بڑی پھرتی کے ساتھ ہاتھی کی اگلی ٹانگوں کے بیچ میں سے نکل کے فوراً علیحدہ میدان میں قلابخ مار کے جا کھڑا ہو گیا۔ ہم لوگوں نے جو اسے دسے پاؤں ہاتھی کی ٹانگوں کے بیچ سے نکل کے اور قلابخ مار کے میدان میں آتے دیکھا تو دنگ ہو کر رہ گئے کہ اتنی زبردست ٹکڑوں پر بھی نہ امسکی کسی ہڈی کو گزند ہو نہ کھال پر کوئی خراش لگی۔ اور آیتہ اللہ میں یہ شخص کھڑے کے برابر سے بھاگ کر میدان کے اس پار آ کے کھڑا ہو گیا۔ چنانچہ جسوقت بہت سے لوگ آتے تھے وہ ان میں ہاتھی کے ڈرانے اور ہٹانے کے واسطے آکھڑے ہوتے تھے اُسوقت وہ آدمی جیسے چند ساعت قبل لوگ ایک چکنا چور لاشہ تصور کرتے تھے ہٹا کٹا چاق چوبندہ ان لوگوں کا شرمیکہ حال نظر آتا تھا۔

بڑے تعجب کی بات یہ کہ ہاتھی کیسے ہی غیظ اور مستی کی حالت میں کیوں نہ ہو جہاں اُس کے سامنے آتنبازی چھوڑی گئی وہ سہم کے خون زدہ ہو جاتا ہو۔ اگر بن یا چرخہ اُسکے آگے داغی جاتی ہو تو ہاتھی اُس کی آواز اور سنسنہاٹ سے ہیڈ ڈرنے کر زنے لگتا ہو۔ چنانچہ اسی خیال سے ایسے موسم میں کہ جب ہاتھی مست اور بے قابو ہو جاتے ہیں ہمیشہ آتنبازی اُنکے ڈرانے دھمکانے اور ایہ ارسائی سے رد کرنے کے لیے تیار رہا کرتی ہو۔

## باب دوازدہم

لکھنؤ کا محرم

ہندوستان کے مسلمانوں کی طرز معاشرت میں جو انقلابات و تغیرات سال کے مختلف اوقات میں ہوا کرتے ہیں کچھ عجیب ہیں۔ ماہ محرم جو عربی کا ایک مہینہ ہوا سیں دو اولیٰ سالہ اسلام یعنی حضرت امام حسن و امام حسینؑ کی شہادت کی سالانہ عزا داری ہوا کرتی ہو۔ یہ دونوں بنی زادے تھے اور نصف سے زیادہ مسلمان باشندگان ہند کا ماتم مناتے اور یہ زمانہ بہت کچھ گریہ و بکا اور سخت غم و ماتم میں بسر کرتے ہیں۔ انھیں میں دربار لکھنؤ بھی شامل ہے۔ نصف سے زیادہ مسلمان اسوجہ سے محرم مناتے ہیں کہ یہ بخوبی ظاہر ہو کہ مسلمانوں میں دو بڑے فرقے ہیں۔ ایک فرقہ شیعہ دوسرا فرقہ اہل سنت و جماعت۔ اور ان دونوں فرقوں میں باہم دلیلی ہی تانتا تہی ہے جیسے متعصب پر و شٹنٹ اور درسن کیتھولک عیسائیوں میں۔ ترک لوگ سنی ہیں۔ اور اہل عجم شیعہ علیہ العموم یوں سمجھا جائیے کہ مغربی مسلمان دریائے فرات سے لیکر بحر اطلال تک سنی ہیں۔ اور مشرقی مسلمان دریائے فرات سے لیکر جاوا تک شیعہ۔

ہندوستان میں محرم کا زمانہ کبھی دنگ فساد سے خالی نہیں جاتا۔ شیعہ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ امام حسن اور امام حسینؑ کی شہادت بڑی سفاکی و برہمچی سے ظالمانہ واقع ہوئی اور سنیوں کا اعتقاد ہے کہ غلیفہ وقت نے انکو بطور جائز قتل کیا کیونکہ وہ غاصب تھے (عفا اللہ)

محرم کو اکثر مسلمانان لکھنؤ ایسے منہم نظر آتے ہیں گویا تمام دنیا کی عیش و راحت اور کاروبار زندگی سے دفنا محروم کر دیے گئے ہیں۔ گلی کو بچے سنان پڑ جاتے ہیں۔ اور ہر شخص اپنے گھر میں اپنے گھر والوں کے ساتھ غم امام میں سوگوار ہو جاتا ہو۔

دوسری بات جو کو علی نہیں بھر بھڑکتی نظر آتی ہو۔ اور لوگ ماتمی لباس پہننے ہوئے تعزیریوں کے جلو سس کے ساتھ چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جگہ جگہ پر تعزیرے نظر آنے لگتے ہیں اور انکی ساتھ خلعت کا جمع بھی ہوتا ہو۔ یہ تعزیرے ان مزارات متبرکہ کی شیعہ ہوتے ہیں جو کر بلا یا مشہد میں دریائے فرات کے ساحل پر واقع ہیں۔ اور انھیں لیل کے امام باڑوں یا امر کی حاسر انہیں

لکھنؤ کے زمانہ شاہی میں یہ باتیں لکھنؤ میں ہوتی تھیں اسوجہ سے متعلق غلطی سے سارے ہندوستان میں کیا گیا ہو یہ حالت محض داستان پارینہ ہے۔

لکھنؤ میں یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ کتاب میں جو نہ یہ وجہ اختلاف ہے صرف معصن صاحب کی غلطی ہو۔



رکھتے ہیں۔ بادشاہ سلامت کا تعزیہ جو غازی الدین حیدر کے عہد میں انگلستان سے بنے کیا تھا سب پر بلور کا ڈھلا ہوا تھا اور اسپر سرائیا کیا ہوا تھا۔ اسے سب لوگ نہایت عزت و توقیر سے دیکھتے اور بہت مقدس خیال کرتے تھے۔

امام بارہ محض موم کریم کی غرض سے پیشتر سے تیار کیا جاتا ہوا۔ اور اکثر سرگروہ اس خاندان کے جنکا امام بارہ بنوایا ہوتا ہوا اس میں دفن بھی ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ شاہی امام بارہ دکنی بھی یہی حالت تھی۔ امام بارہ سے میں تعزیے جو موم کے زمانے میں رکھے جاتے ہیں مکہ منظر کے روبرو رکھے جاتے ہیں شاہی تعزیہ کے اوپر ایک سبز نخل کا چارچنی شامیانہ بھی تننا ہوتا ہوا۔ سامنے کی طرف ایک ممبر بھی رہا اسی کینڈے کا ہوتا ہوا جیسا تعزیہ (سیان شہادت پڑھنے کی غرض سے رکھا جاتا ہوا) جس پر مرثیہ خواں رو قبیلہ ہو کے اور تعزیہ کجبان پٹھر کر کے کھڑا ہوتا ہوا۔ ممبر کی شکل، ایک اونچے چوڑے کی بوتلی جیسی ہیں دیوار یا کٹھن اکچھ نہیں ہوتا۔ اسپر واقعہ خواں کھڑے ہو کے یا بیٹھ کے پڑھتا ہوا کھڑے ہونا یا بیٹھنا اس کی مرضی پر منحصر ہوتا ہوا۔

اس زمانے میں امام بارہ نمیں روشنی کی یہ بھناات اور اسی روشنی میں کارچونی کام کی بنیادوں کی استفادہ رکھ دیکھ برتی ہو کر آدمی کی نظر کو چکا چوند لگ جاتی ہو۔ علموں کے طلائی و تختہ سنی پنچوں کی جھلکا ہٹے اور انکے بھاری بھاری ٹپکوں کی بجاوٹ۔ زر و دوسری کام پر لگنا جنہی کرن کی جھال دکنی زیبائش اور انکی دہ سے در و دیوار کی آب و تاب بس سارا امام بارہ بھڑ نور ہو جاتا۔ اور روشنی کی اکثریت سے رات کو دکھا سناں نظر آنے لگتا ہوا جیسے آدھارسی ڈالیش و زیبائش میں اونچی مڑیاں بانٹھے اور لابی دانتیاں پھٹکا گئے ہونے آدمیوں کا ادب اور سکوت سے چلنا پھرنا۔ انکی معلوم داند و بگیں صدقوں سے حد دینے پر غم کا ظاہر ہونا یا ایسا سا ہونا ہے کہ سبز میر حسن علی کا یہ کہنا صحیح معلوم ہوتا ہو کہ ان چیزوں کو دیکھ کے وہ طلسمی ایوانات بار ہا میری آنکھوں کے پیچھے پھر گئے جو الف لیلہ کی داستانوں کو پڑھنے ذہن میں نقش ہو جاتے ہیں۔

تعزیوں کے پیچھے اکثر نشانات شاہی ملک عرب کے جیسے دربار حمار و دستار۔ آفتاب کا نقشہ اور جو ہر نگار سلور رکھے نظر آتے ہیں۔ یہ گویا اس بات کی شہادتیں ہیں کہ ہم سب مظلوم کو مسلمانوں کے خلیفہ ہونے کا جائز استحقاق تھا کہ جس سے متعصب سنی اعجاز کرتے ہیں۔

ایام محرم میں ہمارے تعزیوں کے گرد بڑی بڑی میٹھ و سبز رنگ کی موسمی توفیں روشن رہا کرتی ہیں اور غصہ و رور میں دو مرتبہ ہالاس عزاء امام بارہ و فیض ختم ہوا کرتی ہیں جس میں شام کی مجلس زیادہ

دلچسپ ہوتی ہو۔ کیونکہ اسیں مجمع خوب ہوتا ہو۔ یہ جب سیر ہوئی تھی کہ بادشاہ سلامت مانتی لباس پہنے اور سر پر مور کے پر دکھاتا جرجے ہوئے واقعہ خوال کے روبرو بیٹھے ہوئے ہیں۔ اُنکے پیچھے کثرت سے اُنکے ہندوستانی ملازم بیٹھے ہیں کہ جو دودھ کی قطار باندھے۔ گردنیں جھکائے نظریں نیچی کیے۔ اور انگلیں صورت بنائے امام باڑے میں داخل ہوئے تھے۔ اُسوقت جھاڑوں اور موسمی شمعوں کی تیز روشنی میں آسمان نہایت برہنہ اور اسوقت کا غم سکوت قابل دیدہ ہوتا تھا اس سکوت کو واقعہ خوال واضح ہو کر بادشاہ کے سامنے وہی مجتہد واقعہ خوالی کرتا تھا جسپر بادشاہ سلامت کی نظر مانتی تھی چلے اپنی دردناک آواز سے توڑ دیتا تھا اور سامعین بالکل خاموشی کے ساتھ سراپا انوم و حریں بنے اور ہمہ تن گوش ہو کے اُسے سنتے تھے۔ اُسوقت روشنی کی تاب و تابش میں بڑی بڑی بیگم بول کی شان اور امام باڑے کے ساز و سامان کی چمک دمک۔ زرنگار سلون کے چمکون کی تڑپ جب لطف دکھاتی تھی کہ اندر بہر طرف یہ معلوم ہوتا تھا کہ شبیہ آگ لگی ہوئی ہو۔ واقعہ خوال جسوقت واقعات، شہادت ائمہ معصومین چلتا تھا تو عجب انداز سے آنکھیں کھلا گما۔ کہ پڑھنا تھا۔ پڑھتے ہی پڑھتے اُسکی آواز میں زور اور زکھون سے جوش تھا ہر مہوئے کھٹا تھا۔ سامعین پہلے تو ساکت و منہم صورت بنے مگر نکالے بیٹھے رہتے تھے لیکن سننے سننے اُنکے دل بھی گرا زور ہونے لگتے تھے اور آفر کا پس۔ و گرتے ہیں اہلار کے۔ نہ شرم کر رہتے تھے مجلس میں جب پیش پڑ جاتی تھی تو واقعہ خوال اور بھی چلا چلا کے مصائب اہلیت کا حال بیان کرنے لگتا تھا جس سے سامعین پر شدت گریہ و دہکاسے عجب حالت طاری ہو جاتی تھی۔ کسی کی آنکھ سے آنسوؤں کا تار بندھتا۔ کوئی ہچکیاں سے سکیاں لیتا اور کوئی چلا چلا کے دادیلا اہمیتیا کی حد بلند کرتا۔ اور اسی درمیان میں خاص خاص مواقع پر بعض سامعین کا زبان سے ”حسن حسین“ کا فقرہ بھی نکلتا اور آخر کار سب لوگ متواتر اور مسلسل سینہ کوئی کرنے لگتے یہ ماتم پہلے تو آہستہ آہستہ ہوتا تھا پھر زور سے ”حسن حسین“ کی صدا اور اُنکے ساتھ سینہ کوئی کا ہنگامہ بلند ہوتا اور سارا امام باڑہ اُسی سے گونج اٹھتا تھا۔ دنِ منٹ تک یہی حالت طاری رہتی اور پھر یکایک سکوت اور سانسے کا عالم یہ ابھرتا تھا جو کہ ہر شخص کو منت و مشتت کے بعد غمگینی سی راحت ملنا چاہیے عالم اس سے کہ وہ منت ایسی شدید ہو جیسے ہرستانی ملک (جہاں بھیچو ابھو) کا تھپیڑ اودانت ہے و انت بجا دیتا ہے) اور ایسے بہت موسم میں جبکہ آرتھیاں محاررت صرف نوے درجے پر ہو تیس میل کی کڑی منزل کھٹے کھٹے کھٹے یا صرف دنِ منٹ کے واسطے علی الاطلاق ”حسن حسین“ کی صدا اُنکا کر سینہ کوئی کیجاے۔ اسی لحاظ سے اس منت خاتم کے بعد جس سے سب لوگ پکھان ہو جاتے تھے شہرت کا دور چلتا تھا اور بادشاہ کا



ہیں۔ موٹا جھوٹا کھاتے پیتے ہیں۔ مگر ماگرم سالن اور فرسے دار پلاؤ چھوڑ کے صرف چرکی روٹی ایلے ہوئے چاؤل اور وال پر بسر و وقت کرتے ہیں۔ عورتیں اپنی زیور بڑھا ڈالتی اور بناؤ سنگار کی تمام چیزیں بالائے طاق رکھ دیتی ہیں۔ حالانکہ ہندوستانی مستورات کی جان انھیں زیورات میں بڑی ربا کرتی ہو۔ زیور سے انھیں بڑی تفریح اور راحت قلبی پہونچتی ہو اور زیور ہی کا رکھ رکھاؤ بہت کچھ انکا مشغلہ زندگی ہوتا ہو۔

باشندگان لکھنؤ کا اعتقاد یہی کہ لکھنؤ میں امام حسینؑ کو علم کا پنجرہ (جیسے ایک غریب زائر ملک شام کو وہاں لایا تھا) موجود ہے اور یہ نہایت ہی مقدس و متبرک یادگار سمجھا جاتا ہے جس مکان میں یہ تبرک رکھا ہو وہ درگاہ سے موسوم ہو۔ اور محرم کی پانچویں تاریخ وہاں بڑے جلوس اور جہاز کے ساتھ ساری لکھنؤ کے علم چڑھائے جاتے ہیں۔ ایوان شاہی سے درگاہ پورے پانچ میس کے فاصلے پر ہو۔ اسکی عمارت بہت شاندار ہو اور اُسکے چوچوں پنج میں ایک چوترہ بنا ہو۔ چوترے کے چاروں طرف چھوٹے بڑے علم کھڑے ہیں اُنکے ٹکوں اور پھر مردوں پر نہایت نفیس معرکے بنے ہوئے ہیں۔ چوترے کے کچھیں وہ علم کا پنجرہ ایک بانس کے اوپر لگا ہوا رکھا ہو جسے مکان کو زیارت گاہ بنایا ہو۔

پانچویں محرم کی صبح کو حشیت و منزلت کے باشندگان لکھنؤ اپنے اپنے علم لیکے جوق جوق اس درگاہ کی طرف جاتے نظر آتے ہیں۔ چونکہ ایسے نمود و نمائش کے مواقع پر یہاں کی خلقت اپنی دولت و ثروت کے اظہار کی عادی ہو۔ لہذا اسکے اہتمام میں کوئی دقیقہ اٹھائے نہیں رکھا جاتا چنانچہ شاہی امام بڑے سے جو علم باجاہ و شہر درگاہ جاتے تھے انکا جلوس اور کسود فرکیج بیان کرنا ہوں۔ اس جلوس میں سب کے آگے چہر سات ہاتھی ہوتے تھے جنہر مفرق جھولیں پاکر میں بڑی نفرتی طلائی جھوکا عماریان کسی اور گلے میں نفرتی گھنٹے اور بیکلیں لگتی ہوتی تھیں۔ ہر ایک ہاتھی پر کچھ لوگ جواہر نگار علم ہاتھوں میں لیے سوار ہوتے تھے اور اُنکے ہمراہ سپاہیوں کا ایک گارڈ ہوتا تھا۔ ہاتھیوں کے پیچھے ایک شخص خاص طور پر سوگوار بنا ہوتا تھا۔ اس شخص کے ہاتھ میں ایک بڑی چھڑی سپاہیہ کپڑے سے منڈھی ہوئی تھی۔ اس چھڑکے اوپر ایک الٹی کمان میں دو گئی تلواریں لٹکتی ہوتی تھیں اسکے پیچھے خود بادشاہ سلامت ہوتے تھے۔ اُنکے گرد پیش خاندان شاہی کے لوگ اور مقرب مقرب علاؤ مذہب ہوتے تھے اُنکے پیچھے ایک گھوڑا جسے ”دولہ ل“ کہتے ہیں (یعنی جسپر امام حسینؑ شہید ہوئے وقت سوار تھے) ہوتا تھا۔ یہ گھوڑا عربی النسل اور بڑی قد و قامت کا ہوتا تھا۔ اور اسی غرض کیواسلے سدھایا جاتا تھا۔ اسکی ٹانگیں اور پہلو میخ رنگی ہوتی تھیں اور اُسکا بدن تیرونے چھدا ہوتا تھا۔ یہ گولیا داگرا

تھی اس مصیبت و اذیت کی جو اصلی گھوڑے اور اس کے سوار پر پڑی تھی۔ گھوڑے کے پشت پر نہایت منفرد زرتار۔ و جو اہرنگا۔ چار جامہ کسا ہوتا تھا جو گھوڑے کے سبزہ یا فقری رنگ پر بہت کھلتا اور زیب دیتا تھا۔ گھوڑے کا سار و سراپا سب ٹھوس سونے کا ہوتا تھا اور گھوڑے کی زین پر ایک عربی عامر ایک کمان اور ایک تیر و نسنے بھرا ترکش بھی رکھا ہوتا تھا اور اس کے جلوں نہایت زرق برق و دریاں بنو ہوئے چند خام ہوتے تھے۔ یہ لوگ ہاتھوں میں چنور لیے اس کی گس رانی کرتے جاتے تھے۔ اس گھوڑے کے پیچھے ملازمن شاہی کی ایک جماعت اور پھر فوج کے سواروں پیدلوں کی جمہنٹیں اور تماشائی خلقت کا انبوہ کثیر ہوتا تھا۔

علم چڑھانیک یہ صورت ہوتی جو کہ پہلے اب علم ایک دور واز سے داخل ہوتے ہیں پھر اس پیچھے کے ساتھ پیش کیے جاتے ہیں اور اس سے پہلے کر دوسرے دور واز سے نکلتے جاتے ہیں تاکہ اور اور علموں کے آگے میں دقت نہ ہو۔ ان بھری ہوا گزرا ہو۔ اور شہر کی خلقت انہو در انہو اس رسم کے ادا کرنے کی واسطے براہ راستے رہتی ہو۔ ان میں سے بعض کو تو عجز چٹھنے کے انتظار میں صبح سے تیسرا پیر ہو جاتا ہو اور بعض یون جی کسی اور اتفاقی سبب سے یہیں ٹھہر جاتے ہیں جس سے صبح سے شام تک ایک میلانا لگا پتا ہو علموں کی کثرت تعداد اسی سے سمجھیں کہ کتنی بڑے کچھ خوب یاد ہے جب میں لکھنؤ میں تھا تو میں نے ایک سال سن کہ کئی بار یہ جاس ہزار علم در گمہ میں چڑھائے گئے اور اسپر بجے کچھ جنبھا نہیں ہوا تھا۔

دنیا میں عام طور سے مشہور ہو کہ شادی و غم تو ام میں چنانچہ ایک شاعر کہ گیا ہے۔

دیر، حدیقہ بہار خزاں ہم آغوش است

زمانہ جام بہت دجنازہ بردوش است

یہ بات بلاد مشرق میں بہت اچھی طور سے ثابت ہوئی ہو۔ مثلاً زمانہ محرم میں جو مخصوص اظہار بیچ و ماتم کا وقت ہوتا ہو غم کے پہلو پہ پہلو شادی کا سماں بھی نظر آتا ہے یعنی محرم کی ساتویں تاریخ کو تو سرفرب شادی کی یادگار میں بھی ایک جلوس بڑے سامان اور تزک و استکرام سے نکالا جاتا ہوتا ہے شہر کے کتے ہیں۔ یہ یادگار ہوتی ہو ایک روایت تاریخی کی کہ عین اسی روز جبکہ امام حسین کے شہید ہوا قاسم کی شہادت ہوئی اس کی شہد کو امام حسین نے اپنی جیتی لاڈلی بیٹی کی شادی اپنے بھتیجے امام قاسم کے ساتھ کر دی تھی شہد کی شادی دوسرے کے بڑے ساز و سامان اور تکلفات جمع کیے جاتے ہیں اور وہ علمی العلوم شب کو نکلا کرتی ہو غریبوں کی مہندیوں امر کے امام یاڑوں میں جاتی ہیں اور فدا

یا وزیر اعظم کی منہدی معمولاً شاہی امام باڑے میں چڑھائی جاتی ہو۔ ان عظیم الشان منہدیوں کی آمد کے سبب سے اس رات کو تمام امام باڑوں میں سجدہ خیر معمولی روشنی اور سجاوٹ کیجاتی ہے اور جب روشنی اور سجاوٹ کا انتظام کامل ہو چکتا ہو اسوقت خلافت بے روک ٹوک امام باڑوں کی بار دیکھنے جایا کرتی ہے۔ اس کنیز الانفاقر گردہ میں سے بعض تو بڑے بڑے زکام رنگ بھاروں کی کیفیت دیکھنے میں محو ہوتے ہیں جن میں صدمہ شمعیں روشنی ہوتی ہیں کیونکہ مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے ایک مرتبہ گنا تھا تو ایک بھار میں سو کنوں چڑھے ہوئے تھے۔ بعض خوش رنگ اور باغ و بہار کنول بگ دیکھ دیکھ کے دنگ ہوتے ہیں۔ بعض لوگ امام کے مزار پر انوار کی آرائش اور تاب و تابش کھڑے دیکھا کرتے ہیں جسکے سامنے ایک بڑے شیر کی تصویر ایک جانب اور دو مچھلیاں جنکے سر باہر لے اور ایک دوسرے کی طرف جھکے ہوتے ہیں (یہی شاہان اودھ کا شاہی معرکہ ہو) دوسری جانب بیٹھتے ہیں۔ یہ تمام شاہی ان حوالت و ذرات کو دیکھنے کے بعد لطف اٹھاتے ہیں اور ایک ایک شے کو حیرت سے دیکھتے اور اس پر تعجب و آفریں کی صدا بلند کرتے ہیں۔ کیونکہ اسوقت امام باڑے کی تزئین کے واسطے ہر ایک مذاق اور طبیعت کے لوگوں کی تفریح اور دلچسپی کا کچھ نہ کچھ سامان ضرور ہوتا ہو۔ مثلاً ایک طرف طلائی و نقرئی علوں کے زر کار و جواہر نگار پیچے اور بٹلے ابلداریے ہیں۔ اور اُنہیں کے پاس خانہ کعب کے دروازے اور امام حسینؑ کے فیہ و رخ گاہ اور تہ مبارک واقعہ کرہا کے نقاری نقشے ہوتے ہیں جو ایک پانڈی کی میز پر رکھے ہوتے ہیں اور اُنکو دیکھ دیکھ کے رقیق القلب حضرات کے دل کھلنے لگتے ہیں۔ ایک طرف دیوار و نمیں طرح طرح کے نفیس و نادر اور عجیب عجیب ساخت کی تیار رکھے ہوئے ہوتے ہیں جنکے دیکھنے سے بہادری اور جنگ آزمائہ لوگوں کے دلوں میں جوش و عنایت پیدا ہوتا ہو۔ لیکن اس ساری آراستگی اور زینت کا مقصد و ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ مذاق کی نفاست ظاہر کی جائے بلکہ یہ ساری کلکٹھڑوں انداز شان و علو سے مرتبت کے واسطے اٹھائی جاتی ہو۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس کے دیکھنے سے جو تعجب و استحباب کی کیفیت تا شاہیوں پر طاری ہوتی ہو اُسے دیکھنے والا مزاج تھا ہے۔

جسوقت اہرے تو پونے کے سر ہونے کی آواز سنائی دیتی ہے اسوقت معلوم ہوتا ہے کہ آپ آرائش شادی کے تحت درہن تخت جنکے پاشہ کو بتمہہ ملو تہجہ و آواز فریب ہو چکے ہیں۔ ان آواز کے سنتے ہی شاہی لقیب اور چوہدار امام باڑے اور کے راستے کی صفائی کیواسطے آجاتے ہیں۔ یہ لوگ اپنا کام خدمت میں بہت جست و جستند ہوتے ہیں۔ اب ایک طرف تو تمام شاہی

ہجری کے ساتھ مصروف سیر تماشہ ہیں اور دوسری طرف یہ لوگ انھیں نکالی باہر کرنے پر کمر بستہ تماشائی ابھی جی بھر کے دیکھ نہیں چکے ہیں۔ انکی آنکھیں سیر نہیں ہوئی ہیں کہ یہ تفرقہ انداز انکے سروں پر بلاے بے درماں کی طرح مسلط ہو گئے۔ چونکہ خالی دوت دیک سے وہ لوگ ٹھنڈے نہیں ہوتے لہذا دوت دیک شروع بھی نہیں کیا جاتی بلکہ سرے سے ہاتھ پاؤں کی قوت سے کام لیا جاتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ ان لمبی داڑھی اور بھیا نک صورت والے مسلمانوں نے لندن کے پولس والے کیا برتاؤ کرینگے اگر وہاں کہیں یہ پوچھیں اور راستہ صاف کرنے کی ضرورت پیش آئے البتہ یہ میرا دیکھا ہوا ہو کہ لکھنؤ میں شاہی جوہدار بڑی دو ٹوک کارروائی کرتے ہیں اور اپنے برتاؤ میں لٹی لیٹی نہیں رکھتے۔ یہ لوگ پہلے بلند آواز سے تین بار بار کے کہتے ہیں کہ "امام باڑہ خالی کرد" لیکن جب اس آواز کی صدائے باز نشست نہیں آتی اور وہ دیکھتے ہیں کہ تماشائیوں کے کان پر فوراً جوں نہیں رینگے بلکہ وہ بدستور برق برق روشنی جگمگاتے شیشہ آلات اور نفرتی وطلائی ساز و سامان کے تماشے میں محو اور منہمک ہوئے۔ گزشتہ اٹھاسے سٹکان دیکھنے میں مصروف ہیں۔ تو وہ اچھی طرح ڈنڈے مارنے اور کوڑے پھٹکا رسنے لگتے ہیں۔ پھر اسی کے ساتھ لات چیت۔ گھونٹہ کی سبھی آلات خود ضرب کام میں آنے لگتے ہیں۔ اور یہ کارروائی ایسی لا پر والی بلکہ بید روی کے ساتھ کیا جاتی ہو کہ ہر طرف سے تڑاق بڑاق اور دھماکے کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ اب بیچائے تماشائی لوگ جڑاتے دل ہی دلیں ان لوگوں کو کوستے نکالیاں دیتے ہوئے لڑکھڑاتے قدیموں اور جڑکی کھٹی جال سے باہر نکلنے لگتے ہیں۔ کسی تماشائی کی تہی مجال نہیں ہوتی کہ ان سے کارروائی آویزوں سے متبادل پیش آسکے کیونکہ انکے ایسے ہر ایک برتاؤ کا کلیہ اختیار حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ ایسے موقع پر ڈنڈے مارنے اور کوڑے پھٹکا رسنے کی رسم پڑ گئی ہو لہذا نہ کسی کو ناگوار ہوتی ہو نہ کوئی اسے سچا سمجھتا ہی چلتا کچھ بھی کہے اس کے اس زور سے گد اڑا دیا جاتا تھا کہ وہ بیچارہ تھلا کے رہ جاتا تھا لیکن بیچارے کے بھر چکا ہو کے وہ سپاہی کو دیکھنے لگے اور کچھ نہ کہہ سکتا تھا اور میاں سپاہی کو اس پر کچھ اعتنا نہ ہوتی تھی وہ اپنی لا پر والی کے ساتھ کوڑے کو بل دینے یا ڈنڈا اتارنے میں مصروف ہوتے تھے۔ تماشائیوں کے واسطے یہ وقت بڑی مصیبت کا ہوتا تھا کہ ہر طرف یہ ایک کوڑے چمکتے دیکھتے تھے اور جوں نہ کر سکتے تھے منظریات نکالیاں سننے اور لذتیں سنے تھے مگر جواب نہ دے سکتے تھے۔ اس وقت ہاتھ اور کمر کے سبب ہتھیار بھی بیکار ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ وقت ہی اسکا نہ ہوتا تھا کہ برامیں اور مقابلہ کریں۔ یہ سب رسم اور دستور یکے کر امات ہیں۔ اتنی یہ ہے کہ دریائے انڈس کے مشرق جانب دو دستور "اور" اور "حق"

مترادف لکھیں ہیں۔

اسنے عرصے میں امام باڑے میں مندی کے داخل ہونے کا پورا پورا انتظام ہو جاتا ہے۔ اور  
اور مندی بھی امام باڑے کے بالکل قریب پہنچ جاتی ہے۔ اب امام باڑے میں بالکل سنا ہو گیا ہے۔  
جس پچانک سے تماشائی نکال باہر کیے گئے ہیں وہ بند کر دیا گیا ہے۔ باہر کا مزاج صحن حسین برطمان  
روشنی ہوتی ہے چشم فطر بنا ہوا ہے۔ لیکن مندی کا جلوس آنے لگا۔ ہاتھی۔ اونٹ۔ اور گھوڑے  
تو پچانک کے باہر ہی چھوڑ دیے گئے سپاہی۔ جلوس بردار۔ اور باجے والے امام باڑے  
لے صحن میں رہے۔ انکی وجہ سے ایسا مجمع ہو جاتا ہے کہ تل دہرنے کی جگہ خالی نہیں ہوتی اور  
کی بھی کاری کا فرش بالکل چھپ جاتا ہے۔ یہ لوگ دہنہ بائیں براجم کے کھڑے ہو جاتے ہیں  
اور بیچ میں۔ اسے چھوڑ دیتے ہیں جس پر سے پہلے تو مندی کا اصلی سامان آنا شروع ہوتا ہے۔  
نیچے نفری کشتیوں میں ہر قسم کی ٹھیکائیاں خشک میوے۔ پھولوں کے ہار گرجے۔ پچیر کھٹ  
اور گلدستے جنہیں زرق برق بنائیں پہنے ہوئے ملازمین اپنے ہاتھوں یا سروں پر لیے ہوئے  
ہیں اب اس وقت نہایت نفیس آتش بازی بھی چھوٹنے لگتی ہے۔ پھر اس سامان عروسی کے بعد  
دولہن کی نفری بالکی دھیمی بھگات کی سواری کی ہوتی ہوتی ہوتا ہے اس کے گہمت بھرک  
کی وردی پہنے ہوئے مشعلی ہاتھوں میں مشعلیں لیے ہوئے ہیں۔ پھر مشعلوں کی روشنی میں باجے والوں کی  
چوکیاں آتی ہیں۔ یہ لوگ بہت عمدہ بلجے جاتے ہوئے ہنسی خوشی اس سامان عروسی کو  
امام باڑے کے وسیع دالان کے اندر لیجاتے اور وہاں گشت لگاتے ہیں۔ پھر یہ سب سامان آتش  
پر چڑھا دیا جاتا ہے۔ کیونکہ اس ساری درد مندی کا حاصل اتنا ہی ہوتا ہے کہ بعد چندے اسے  
بھی لغزہ کے ساتھ کر لایا جائے۔ ہنوز سامان عروسی پوری طرح امام باڑے میں پہنچ بھی نہیں  
چکا ہے کہ عزاواروں کا ایک گروہ مرھبکائے پھر نکلائے۔ احمی لباس پہنے اور نگین صورت بنائے  
امام باڑے میں آ جاتا ہے۔ چونکہ شادی اور شہادت ایک ہی رز ہوتی تھی اس لیے سامان عروسی  
کے باشندہ کو یہ سامان غم و ماتم بھی ہوتا ہے۔ اسکے بعد حضرت قاسم کا توت چہند خلام گاندہ پور  
اٹھا کے لاتے ہیں اور اسکے ساتھ عزاواران مغموم صورت کا مجمع ہوتا ہے۔ بعض اوقات ان لوگوں  
کے ساتھ ایک گھوڑا اور حضرت امام قاسم کا سمجھا جاتا ہے اور جو اسی غرض سے سدا یا جاتا ہے  
بھی ہوتا ہے۔ اس گھوڑے پر امام قاسم کی زینا۔ پگڑی انکی کمان اور نکاحیہ اور تیروں سے بھر پور  
بھی ہوتا ہے۔ اور اسکے اوپر کا۔ جوئی و نفری نشان شاہی لینے چتر اور آقا بہ سادہ کناچ ہوتا ہے



اگر اس گھڑے کو امام باڑے میں لاتے ہیں تو وہ ایسا شائستہ ہوتا ہے کہ جس پر کامل الطینان ہو سکتا ہے۔ وہ اس شان اور تانت سہولت کے ساتھ امام باڑے کے والوں میں گشت لگاتا ہے کہ جی چاہتا ہے۔ بس دیکھا کرے۔ اندر کا حال تو بس اس قدر بیان کے قابل تھا جو بیان کیا گیا کیونکہ یہاں اب مرث مجلس ہوتی ہو اور کچھ نہیں ہوتا اب ہر کا بیان کرتا ہوں کیونکہ وہاں بھی کچھ رسوم ادا ہوتے ہیں۔ یہاں جو کچھ ہوتا ہو وہ عوام الناس کے مذاق کے مناسب ہوتا ہے کیونکہ اندر کا اندوہناک سماں عوام کے لیے بالطبع درغوب نہیں ہو سکتا۔ وہاں بھی قسم کی مخلوق جمع ہوتی ہو پڑھتے بے مزہ۔ ایک پر ایک گزرتا ہو۔ انیس غل غباڑا۔ ہنگامہ جھنسی۔ دنگی چلن مذاق بھی کچھ بے تیزیاں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ روپیہ پیسہ لوٹنے کے منتظر ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس ملک کا یہ بند بڑا ہوا دستور ہے کہ بیاہ برات میں ہمیشہ کچھ روپیہ ضرور ملنا چاہیو۔ اور صندی کے بھی لوازم میں یہ بات داخل ہو پھر کھانا متروک کیونکہ نہ ہو سکتی ہو۔ دراختالیہ کہ یہ رسم عقدا امام قاسم و دختر امام حسین کی یادگار میں کیا جاتی ہو۔ چنانچہ عہد ہزار لوگ جو ایسی خدمت پر مامور ہیں ہوتے ہیں مٹھیاں بھر کر کے روپیہ اور چھوٹے پھوٹے کے چاندی کے اس آزادی دسیہ نشی ہست دلت بائیں لٹاتے رہتے ہیں کہ جسے دیکھنے پر پین حیزات دنگ رہ جاتے ہیں لیکن ایسے موقع پر بلا خیال کسی زیر باری کے جی محول کے خیرات مہرات کیونکہ مسلمان لوگ ایک مذہبی فرض سمجھتے ہیں چنانچہ لکھنؤ کے کسی عمار نواب میرزا نے کہ یہ ایک معتبر کتابی روایت جو کرم کے زمانہ میں انھوں نے تین لاکھ روپیہ صرف کیا تھا لہذا خیرات مہرات جلوس کے سامان۔ آرائش کی چیزوں بھاری بھاری پوشاکوں اور وردیوں (جو ایک مرتبہ کے سوا دوبارہ استعمال میں نہیں آئیں) کی طیاری میں جو کچھ نمودائش ہوا کرتی تھے اُسے دیکھ کر کوئی عقیر نہ ہونا چاہیے بیشک یہ بہت صحیح ہے کہ کسی حشمہ ہندوستان کے مسلمانوں کی دولت کا اندازہ لکھو ان کے سامان عزاداری محرم سے بخوبی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ تمام قیمتی اور گراں بہا سامان ایک مرتبہ لیا کر لے رکھ لیا جائے اور ہر سال استعمال میں آیا کرے کیونکہ اس سے اخراجات میں بہت تخفیف کی صورت مل سکتی ہو۔ لیکن یہ کوئی نہیں کرتا۔ بلکہ جو شے ایک بار استعمال میں آجاتی ہو پھر وہ دوسرے سال ہرگز استعمال میں نہیں آتی اور زمانہ عسداوری کے خاتمے پر یہ سارا سامان غریبوں اور حاجت مندوں کو تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محرم کے زمانہ میں عام لوگ نہایت خوش و خروش ظاہر کرتے ہیں اور اس سے پریشان نہیں ہوتے میں نے ابھی اہم عزاداری کا بیان انجام کو نہیں پہنچایا ہو۔ امام باڑوں میں یہ تھی سامان آرائش انعقاد مجالس عزاداری وغیرہ کے جلوس

کا اس کروفر سے ہندی اور علموں میں اٹھنا یہ سب تو ابتدائی مراتب ہوتے ہیں۔ اور اُن کے انتہا میں ایک حد درجہ دلکش و دل فریب سامان نظر آتا ہو۔

وافح ہو کہ دونوں امام مظلوم زیر زمین دفن ہیں۔ اور ابھی صرف اُنکی شہادت کے اور اُس کے پیشتر کے واقعات کی یاد تازہ کی گئی ہو۔ لیکن اُنکے جنازہ اٹھانے اور ہجرت و تدفین کی ساری سہیں انہی باقی ہیں۔ چنانچہ جنازہ اٹھانے میں بھی بہت کچھ ہتلم کیا جاتا ہو۔ اور تدفین اور صریح مبارک لفظی حل کے بابت رجحانات میں ہوتی ہو، ہر ایک متحمل اور ذی مقدور خاندان نے بہت زمانہ پیشتر سے بڑے بڑے بند و بست کر رکھے ہیں۔ لیکن تدفین کے واسطے بڑی بڑی عالیشان کر بلا لوگوں کے اسلاف عرصہ سے بنا گئے ہیں۔ یہ کل کر بلا میں شہر کی دیواروں سے فاصلہ و از پر واقع ہوتی ہیں اور بڑے ترط کے سے بشمار مخلوق کے گروہ کچھ تو تماشہ دیکھنے اور کچھ بغرض شرکت بعض مراسم مذہبی وہاں جاتے ہیں۔ ان لوگوں کے ساتھ کھانے پینے کا بہت کچھ سامان ہوتا ہو اور وہ سامان بھی ہوتا ہو جو مسلمان کی قبروں میں رکھتے وقت درکار ہوتا ہو۔

چونکہ امام حسین کی شہادت میں فوجی حیثیت غالب تھی لہذا ہر طرح یہ کوشش کی جاتی ہو کہ ساری نمائش میں فوجی شان اور جنگی آداب قائم رہے۔ چنانچہ جلوس میں پیشتر جھنڈیاں برقیں ہوتی ہیں جن کے پھر سے اور پرچم جو امیں اوڑھتے ہوتے ہیں۔ بنیڈ باجے ہوتے ہیں جو زرمیہ گیتیں بجاتے ہیں۔ پھر سپاہی منشی لوگ اُچھی بنے ہوئے نہد قیاسپتولیں دانتے۔ اور ڈھکیا ٹواریں ہلاتے چکاتے۔ نکلے ہیں اور ان چیزوں کو دیکھنے کے شخص کے ستمیہ کے سامنے پورا میلان جنگ کا سامان پیش ہو جاتا ہے۔ امر کے تفریوں کے پیچھے پیچھے غریب غربا کے تفری بھی ہوتے ہیں۔ کیونکہ اُنکے جلوس اور بھڑ بھڑ میں آنکھوں کا بار مل سکتا ہے۔ لہذا وہ اپنے حد سے سب اور نہیں کرتے۔ علاوہ اسکے بعض مواقع پر متعصب سنی لوگ نہیت حلیا و مزاحمت کھڑے نظر آتے ہیں کیونکہ یہ مخالف فرقہ و عقیدہ والے لوگ اس کل سامان کو بیہودہ اور فی الحقیقت ناپاک تصور کرتے ہیں۔ تفریوں کے جلوس میں جو سامان ہوتا ہو ایک ہی قرینہ سے سب جگہ ہوتا ہو۔ یعنی سب سے پہلے علم ہوتے ہیں اس طرح سے کہ ہاتھی کے ہومج پر کچھ لوگ بیٹھے ہوتے ہیں اور اُنکے ہاتھوں میں کپڑے سے منڈھی ہوئی چھڑیں بانس کی ہوتی ہیں جنکے سر و پر پتے اور پتوں کے نیچے لائے چٹکے لگے ہوتے ہیں اگر کسی کا تفریہ و ہوم سے اٹھتا ہو تو دین یا یا پتے چھسے ہاتھوں پر اسی طرح علم ہوتے ہیں۔ پھر اسکے پیچھے ہاجے والوں کی چڑکیاں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اپنی

باجوں میں مٹھے یا تو سوتے ہوئے چلتے ہیں۔ اس مقام پر یہ سمجھ لینا چاہیے کہ جس جگہ پر سب باجے  
 واسے برابر اپنے باجے جاتے ہوئے اور ایک کے بعد ایک چوکی بجا میوہ والوں کی چلتی ہوئی تو وہاں  
 باجوں کے تال مٹری آواز کیا خاک سمجھ میں آتی ہوگی۔ پھر ان کے بعد ایک آدمی بڑی لاہنی چھڑ میں  
 ایک الٹی کمان لگائے اور کمان کے دونوں سروں میں دو تلواریں لٹکائے نکلتا ہو۔ اور اسے کچھ  
 لوگ سنبھالے ہوئے ہیں جنکے ہاتھوں میں جھنڈیاں بھی ہوتی ہیں۔ ان جھنڈیوں کے سیاہ ریشمی  
 پھر برسے ہوا میں لہراتے ہوئے ہیں اور انکے پیچھے ڈنڈل لکھڑا ہوتا ہو جسکے دائیں بائیں دھنیں  
 لٹکائے ہوتے ہیں۔ اور اس کے آگے آگے ایک افسر نشان شاہی لینے آتا بیٹے ہوئے اور  
 دوسرا افسر اس کے اوپر چتر لگائے اور اس کے ساتھ کچھ لوگ گھوڑے کا نفرنی زیور وغیرہ لیے ہوئے  
 اور بہت سے لوگ چھوٹی چھوٹی سہکنی جھنڈیاں لیے ہوئے ہیں اور ڈنڈل کے زین پر  
 سنہری کام کی بیش بہا بگڑی۔ شمشیر آبدار۔ پرتلہ۔ ترکش۔ کمان۔ اور دیگر اسلحہ رکھے ہوتے ہیں  
 اور اکثر اس گھوڑے کے پیچھے صاحب خانہ بحیثیت سرخیل عزاداروں ہوتا ہے واضح ہو کہ اس  
 عنوان سے اور ایسے بھیڑ بھڑکے ساتھ کئی میل تک پاپا وہ چلنا کچھ آسان نہیں ہوتا پھر  
 اس کے پیچھے کچھ لوگ نفرنی و طلائی آئینے لیاے ہوتے ہیں جن میں چاندنی سونے کی زنجیریں  
 لگی ہوتی ہیں۔ دھنچک۔ رومن کیتھوک گر جاؤ نہیں ہوتی ہیں اور لوہان وغیرہ خوشبویات  
 سلگتی ہوتی ہیں۔ صاحب خانہ اور اس کے احباب ہی کے ساتھ مرثیہ خواں بھی ہوتے ہیں۔ یہ سب  
 سوگوار برہنہ سر ننگے پاؤں دنگلیں صورت بنائے ہوتے ہیں اور اکثر ان لوگوں کے  
 برہنہ سروں پر گرد یا چھو سہ پڑا ہوتا ہو۔ یہی میز علامت انتہا سے غم و الم کی ہو۔ پھر انکے پیچھے  
 خراج مبارک ہوتی ہو جسکے اوپر سبز مخمل کا کارچوبی خامیادتنا ہوتا ہو۔ تھریہ بانسوں پر رکھا ہوتا  
 ہو اور اسے بہت سے لوگ بچو کا نہ جو پیر اٹھائے ہوتے ہیں۔ پھر اس کے بعد امام قاسم کا تابوت  
 اور آٹھ بی بی کی بند پانکی اور بہت سی کشتیاں متحدہ تھاکٹ اور سامان عودسی کی سلسلہ وار  
 ہوتی ہیں۔ پھر سب سے آخر میں اونٹوں اور ایتھوں پر لشکریان امام تشنہ کام کا خمیہ و حسنہ گاہ  
 اسطرچہ بار ہوتا ہو جس طرح انھوں نے مرثیہ سے کر بلا کی طرف کوچ کیا تھا۔ یہ سب مزدوری لوانا  
 اور سامان عزاداری کے بالعموم تفریوں کے ساتھ ہوتے ہیں۔ علاوہ ان کے ہندوستانی خیرا  
 اور داد و پیش کا سامان بھی ہوتا ہو لینے ایک قطار اونٹوں یا ایتھوں کی ہوتی ہو جنہیں  
 متعدد اور متعدد ملازمین سوار ہوتے ہیں اور وہ راستہ بھر روپے پیسے اور روٹی غرابا و مساکین کو

برابر تقسیم کرتے چلتے ہیں۔ مسلمان عورتوں کے عقیدے میں یہ رونی مجباً سطح تغزیہ کے ساتھ تقسیم کی جاتی ہو۔ ایک میزک ہوئی ہو چنانچہ وہ اپنے نوکروں چاکروں کو اس کام پر تینیاں کر دیتے ہیں کہ چاکے ایک ٹکڑا روٹی کا ٹانگ لاویں۔ حالانکہ وہ خود منوں اٹنے کی روٹیاں خیرات کرتے کرتے رہتے ہیں۔ عام عقیدے کے موافق زمانہ محرم میں فقرا و مساکین پر بخشش و انظار کرنا نہایت مستحسن و موجب صد برکت سمجھا جاتا ہے۔

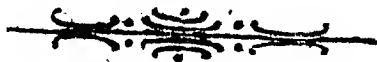
چونکہ شہر کے مختلف راستوں سے برابر تغزیہ نکلتے ہیں اسوجہ سے تمام گلی کو بچے توپ بند وں اور پستول کی آوازوں اور حسن حسین کی صداؤں سے گونج اٹھتے ہیں جب تغزیہ کر لیا اس پر پہنچ جاتے ہیں اسوقت معمولی طور پر دفن کر دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح سے کربلا میں پہلے سے قبریں کھدوا رکھی جاتی۔ اور انہیں گڈھوں میں تغزیہ مع کل بخایت عروسی۔ بار بچوں خوشبو وغیرہ کے کاٹو دیے جاتے ہیں۔ اکثر اس موقع پر شیعہ سنی کا پڑانا جھگڑا تازہ ہو جاتا اور فتنہ و فساد کا شعلہ چمک اٹھتا ہے۔ یعنی نقلی تجرید و تدفین میں شور و شرا اور اصلی کشت و خون کی نوبت پہنچ جاتی ہو اور اسیں کچھ نہ کچھ جانیں بھی تلف ہو جاتی ہیں۔

محرم کے روزے رمضان کے روزوں سے کہیں متقاہر و مختلف ہوتے ہیں۔ رمضان کے روزے تیس دن کے ہوتے ہیں اور وہ ساری دنیا کے مسلمانوں کے نزدیک فرض ہوتے ہیں کہیں ہندوستان کے دریائے گنگا سے سیراب ہونے والے مسلمان اور افریقہ غرضی کے بحر اطلانتک سے پیاس بجانیوالے مسلمانان فیضان سب برابر ہیں اور یک قلم تیس روزے رکھتے ہیں یعنی ماہین مطلق و غروب آفتاب کھانا۔ پینا۔ حصہ۔ پان۔ کھانا چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن محرم کے روزے صرف شیعہ لوگوں نے دس دن کے واسطے وضع کر لیے ہیں البتہ جو روز زیادہ یا بند مذہب ہیں وہ چالیس دن اسطرح محرم مناتے ہیں جیسے دونوں گروہ کے پابندان مذہب رمضان سے ایک مہینہ پیشتر اور ایک مہینہ بعد رمضان مناتے ہیں۔

محرم کے زمانے میں ہلوگوں کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عزت بچ کے طور پر کبھی بھل نہوتی تھی۔ وہ حسب معمول دربار ہنگامی ہی برآمد ہوتے تھے اور انہیں ہلوگ بھی حاضری دے آکر کرتے تھے۔ لیکن اکثر یہ دربار بھی نامعہ ہو جاتا تھا۔ اور تمام ملکی ذامی کام اس زمانے میں ملتوی ہو جاتے تھے۔ ہلوگوں کو اگر کسی امر خاص میں یا ضرورت شدید کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارپاہ ہونے کی حاجت پرتی تھی تو سہل ہی تبریر تھی کہ برقت بادشاہ سلامت اپنے مقرب بارگاہ خاصہ تشریف سے

اصلاح بنواتے ہوتے تھے اسوقت حاضر حضور ہو جایا کرتے تھے۔

بادشاہ سلامت یونٹو محتاط بہت تھے لیکن ایک مرتبہ اپنے خود مختاری کے زعم اور نیز بچنے کی فکر ہی ہوئی حالت کی وجہ سے وہ محرم کے زمانے میں انگریزی لباس پہنے اور لندن کی نجی ٹوبی دیکھے امام باڑے میں چلے گئے تھے۔ اُس پر مسلمانوں نے بہت کچھ نفوس اور ملامت کی۔ اور لوگوں نے گردنیں ہلا ہلا کے اور دالھیاں پٹکار پٹکار کے خوب اسکے چرچے کیے۔ ہم یورپین ملازمان شاہی نے بھی اُنکے ہندوستانی مصاحبوں کی طرح اس حرکت کو بہت نازیبا اور محبوب سمجھا تھا۔ بلکہ حتی الامکان اُنکو یہی بھجاتے سمجھاتے رہتے تھے کہ ایسے مواقع پر اپنے قدیمی طریقے پر قائم رہیں اور قومی وضع کو ترک نہ کریں لیکن بادشاہ سلامت اپنے ”راج ہٹنکے“ کے مقابلے میں ہلوگوں کی گفت و شنید کی ذرا پروا نہیں کرتے تھے۔ اُنکی عادت تھی کہ اُنکی خلاف مرضی جو اصلاح و مشورہ یا پسند و نصیحت ہوتی تھی اُس پر وہ کان نہ دہرتے ہی نہ تھے۔ میں خوب جانتا ہوں کہ رزیدنسی میں لوگوں کا خیال یہ تھا کہ ہم ہی لوگ اُنکی اس نازیبا حرکت کے محرک تھے۔ اگرچہ ہم لوگوں کی طرح حساب رزیدنٹ بخوبی جانتے تھے کہ دربار شاہی کا رنگ ڈھنگ کیا ہو مگر اُنکو اس بات کا علم صحیح نہ ہو سکتا تھا کہ ایسی خفیف الحركات خود بادشاہ سلامت کے مزاج میں تھی۔ یا ہم لوگ یہ اُنکے مصاحبین اُسکے محرک ہوتے تھے۔ البتہ اُنکے دل میں یہ بات جم گئی تھی کہ ہم لوگوں کی ترغیب ہی سے ایسے افعال نے سرزد ہوتے ہیں۔ حالانکہ ریویو و دیگر ہندوستانی اخبارات ہلوگوں پر بالکل عجیب و پرہیزگار بھی عاید کرتے ہیں کہ ہم لوگ بادشاہ کے اسلاف اور فضولی کے معین تھے۔ حالانکہ حقیقت میں ہم لوگ ان حرکات کو ویسی ہی برہنہ نگاہ سے دیکھتے تھے جیسے یہ ہمارے الزام دہندہ حضرات۔ اور اگر ہمارا اس پر اتنا تو ہم ضرور اُنکو روک دیتے۔ ہمسہ نے خود بار بار اسے صدق دل سے قابل ملامت سمجھا اور حتی المقدور رد کرنے کی کوشش کی لیکن اس بارے میں ہماری کسی کی کوشش کارگر ہوئی نہیں سکتی تھی۔



## باب سیزدہم

لکھنؤ سے رخصتی

جن اسباب سے کہ مجھے اور نہ صرف مجھے بلکہ ایک اور ملازم خانگی صاحب کو جنگی عزت و توقیر بادشاہ کی نگاہ میں ہمیشہ مجھے زیادہ رہی دربار لکھنؤ سے علحدہ ہونا پڑا۔ اسکی داستان کچھ بہت طویل طویل نہیں ہو۔ خاصہ تراش کا مسخ بادشاہ سلامت کے مزاج میں بڑھ رہا تھا۔ اور اُس کے اقبال کا دریا اس جوش سے موزن تھا کہ ہر شخص کو صاف نظر آنے لگا تھا کہ یہ اُس ترے پیچی کا کام جاننے والا اعوان سلطنت کا مالک ہو رہا ہو اور حکومت کے اوٹ کو جس کی چاہتا ہو بٹھا دیتا ہو۔ صاحب رزیدنٹ تک کو بھی رفتہ رفتہ اس جانب توجہ ہو گئی تھی اور اب یہ بات ہر شخص کے دل میں جم گئی تھی کہ اگر کسی کو دربار میں کچھ رسائی پیدا کرنا ہو تو اُس سب سے پہلے خاصہ تراش سے راہ رزم پیدا کرنا اور اُسکی نظر عنایت اپنے حال پر سید دل کرالیا جانیے۔ لیکن خاصہ تراش کا یہ عروج ہے وہ نہ تھا۔ مختلف اسباب ایسے جمع ہو گئے تھے جن سے یہ نتیجہ پیدا ہو گیا تھا۔ فوجری کی حالت میں ایک مدت تک مطلق الذمان رہنے۔ اور پھر ریکا ایک دولت ہے نہ اندازہ لگانے سے بادشاہ کی طبیعت میں ابتداء آگیا تھا اور مذاق میں اپنی پیدا ہو گئی تھی۔ اور خاصہ تراش نے بادشاہ کی افواج کو دیکھ کے (اسی میں اپنا فائدہ سمجھا کر انھیں باتوں کو ترقی دئے۔ اُس نے رفتہ رفتہ یہ کیا کہ بادشاہ کی نگاہ میں اپنے آپ کو بہت اہم اور ضروری بنالیا۔ ہمیں اُسکو ملکہ حاصل تھا کہ بادشاہ کو اپنی راہ پر ایسی چالاک بی سے دگا لیتا تھا کہ بادشاہ یہی سمجھتے تھے کہ وہ اُنکی مرضی پر کاربند ہو رہا ہو۔ آپ ہی سب کچھ کرتا تھا اور پھر الگ تھلک رہتا تھا۔ بادشاہ کے ہاں شراب کا جقدر صرف تھا وہ سب اُسکی عزت آتی تھی اندامیر کی ہر بوتل سے جو باں گنتی تھی کچھ نہ کچھ اُسکے ہتے ضرور لگ جاتا تھا۔ ایسی تھی میں اُسکا حق تو ایسے تھا کہ جقدر ممکن ہو شراب زیادہ صرف کیا۔ اور اُسے کیا پڑی تھی کہ وہ بادشاہ کی بے اعتدالی میں غلغلہ انداز ہوتا۔ پھر بادشاہ کی نظر عنایت جس خواص یا رزیدنٹ کی پر ہوتی تھی وہ اپنی کمائی میں سے کچھ نہ کچھ خاصہ تراش کے پیشکش ضرور کرتی تھی جس سے کہ نواب اور عساکر شاہی کے کمیز صاحب نے بھی خیریت اسی میں سمجھی کہ اس مقرب بارگاہ کو اگر انہما تحف دہرایا سے اپنے قابو میں کیے رہیں۔ اب ان حالات و واقعات کو سن سمجھ کے اور

اسکی کینہ طینت کو پیش نظر رکھ کے ہرگز یہ محل تعجب نہیں ہو سکتا کہ اُسے بادشاہ کی اُن معائب کی نشوونما کی پوری کوشش کی جسے اُسکو منفعت کثیر حاصل ہو رہی تھی۔

ہم ملازمن خانگی پر بادشاہ کی یہ معائب بالکل آشکارا تھی اور دیں یقین کرتا ہوں کہ جاری سب کی دلی تمنا یہی تھی کہ انکی اصلاح ہو جائے۔ بیشک ہماری آرزو یہی تھی کہ یہ خرابیاں رفع ہوں۔ لیکن بار اکیسکا بس نہ جانتا تھا۔ اور اگرچہ ہم لوگوں نے بار بار اپنے آپس میں اس پر صلاح و مشورہ بھی کیا مگر کوئی معقول تدبیر ہاتھ نہ لگی۔ ہم میں سے ایک صاحب جو ذرا زیادہ منہ لگے تھے انھوں نے آخر اپنے سر پر خدمت کی کہ وہ بادشاہ سلامت کو اذام تفہیم کرینگے کہ یہ ہر وقت کی بخود ہی چھیک نہیں۔ چنانچہ انھوں نے ایسا کیا۔ اور بادشاہ سلامت نے اُسوقت اُسے قول قسم کی۔ تسلی دی۔ اصلاح کا عہد و بیان کیا لیکن جو کچھ کیا اُسے طلاق نسیان پر دہرایا۔ ظاہر ہے کہ ایسی باتوں سے خاصہ تراش کا مرتبہ کچھ اور بڑھتا ہی رہا جھٹکنے کا کیا ذکر۔

میں بیان کرچکا ہوں کہ بادشاہ اور اُنکے چچاؤں کے درمیان سخت دشمنی چلی آتی تھی۔ اور ان لوگوں نے بادشاہ کے والد کے اس منصوبے میں کہ بادشاہ کو مسند نہ ملے جو ساؤ کیا تھا اُسکو بادشاہ نے کبھی دل سے محو نہیں کیا۔ چنانچہ کبھی اُنہیں سے کسی کو بادشاہ خج کی دعوت میں مدعو کرتے تھے تو اُسکی غرض و غائبہ صرف اتنی ہی ہوا کرتی تھی کہ اُنہیں شراب پلا بلا کے خوب سرشار کریں اور مرشار کر کے اُنکو چھڑیں اور ذلیل کریں۔ اس بارے میں جو واقعات میں اُنکے چل مکے لکھنا یقیناً لوگ اُنکو یاد دہر نہ کرینگے۔ لیکن درحقیقت وہ لفظاً بلفظ صحیح و درست ہیں۔ کیونکہ ایسے واقعات کبھی حافظے سے فراموش نہیں ہو سکتے اور میں اُنکو اسی طرح حوالہ دے کر ذکر کیا جس طرح وہ پیش آئے تھے۔

انھیں کم سن سال چچاؤں میں سے ایک بار ایک صاحب کو بادشاہ نے مدعو کیا جب وہ آئے تو اُنکے سامنے نفیس شراب پیش کی گئی۔ اور جتنی دہری سکتے تھے اُس سے کہیں زائد اُنکو پورے دستی پلائی گئی۔ کیونکہ خاصہ تراش دیکھ رہا تھا کہ بادشاہ جس طرح خوش ہو رہے ہیں اُسی طرح اپنے چچا کو بھی سیرست کرنا چاہتے ہیں اور وہ یہ دیکھ دیکھ کے خوش ہو رہے ہیں کہ یہ برفروقت ایک ملازمین گرفتار ہو رہا ہو۔ لہذا اُس نے ایک پیارا گالنا نکالا کہ ایک بار مجھے بھیجے بول اٹھا کہ درقبلہ عالم۔ اسوقت تو اسکی طرح بول رہا تھا چائے۔

اگر قبلہ عالم کی مرضی پانوں تو میں میاں سعادت کے ساتھ ناپوں۔ بادشاہ یہ سنکے بھڑک اٹھے اور فوراً بولے۔ بہتر۔ بہتر۔ پھر اُنھوں نے اپنی کرسی چھپے کھسکا لی۔ گویا ناخ کیو اسلے تیار ہو گئے اور بولے۔ بہت بہتر۔ بہت بہتر۔ ہاں ہاں خان تم ہمارے چچا جان کے ساتھ ناچو۔ اب تو سارا کمرہ جلتا جاگتا ہو گیا۔ اور ایک طرف گوشے میں رنڈیاں تو ناچ ہی رہی تھیں دوسری جانب بادشاہ سلامت خود ناپنے پر آمادہ ہو گئے۔ اگرچہ درحقیقت اُنکو منظور ہی تھا کہ خاصہ تراش اور چچا صاحب ناپیں۔ بیچارہ اپر فرقت اسوقت اس مقرب درگاہ کے پنجے میں پھنسا ہوا تھا۔ اور وہ برابر جکڑ دیے چلا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ وہ بیچارے گھوم گئے اور اب بشکل اُنکے قدم زمیں سے لگنے لگے۔ اسی آباد باجی میں خاصہ تراش نے بیچائے کی بڑی بھی اُچھال دی اور وہ زمیں پر گر پڑی۔ چونکہ ہندوستانیوں میں سر سے بڑی اُتاریا میوب اور اہانت انگیز سمجھا جاتا ہے لہذا اہا وجود المست ہونے کے بڑے بیچائے کو غصہ آگیا اور اُسے فوراً اپنا ہاتھ پیش قبض پر ڈال دیا لیکن دم کے دم میں خاصہ تراش نے پیش قبض کو ہتھیلیا اور میاں سے باہر نکلے ہی نہ دیا۔ پھر تو خاصی دست درازی شروع ہو گئی۔ اور ایک ایک کر کے کر کی ڈاب۔ شالی پٹکا۔ زریں عبا و قبا۔ سب اُتر گئے جسوقت اس بیچائے کی یہ درگتیں ہو رہی تھیں ہمیں سے دو صاحبوں نے چاہا کہ بیچائے کو بچالیں لیکن بادشاہ نے ایک ڈانٹ بتائی کہ صاحب ہٹ جاؤ اور سیر دیکھنے دو۔ نہیں تو خدا کی قسم میں ابھی تم کو گرفتار کرادوں گا۔ اب تو مخمور اور سرشار بادشاہ دجو اپنے مقرب خاص کی این آواؤں سے بہت معظوظ ہو رہے تھے اکایہ عتاب و کیلکے سب اپنی اپنی جگہ تھم گئے کس کی طاقت تھی کہ چوں بھی کرتا۔

جند ہی منٹ میں بیچائے سن سفید بڑے کی یہ نوبت ہو گئی کہ کمرے کے بیچوں بیچ میں ننگ درمٹنگ کھڑا کر دیا گیا۔ بدن پر ایک دھبی نہ رہی۔ اور بادشاہ اُنکے ابالی موالی۔ رفیق رفقا اور خواصوں کا تو وہ ظرافت بن گیا۔ بادشاہ نے حکم دیا اور بیچائے پر پانی بھی ڈالا گیا اور لوگوں نے بودی مار سے مارا بھی۔ اُسکی اس حالت کو دیکھتے بہت ترس آتا تھا کہ اگرچہ بیچارہ افشہ سے چور تھا لیکن پشہ بھی اتنے جو اس باقی تھے کہ اپنی اس ذلت و خواری پر دو فوج ہاتھوں سے بار بار منہ ڈھا لینا اور زار و قطار رو رہا تھا۔

پیائے ناظرین! آپ غائبنا بیچارہ اُنھیں ملے کہ دیکھیں، جی مٹم سب لوگ بیٹھے یہ سب تماشہ رکھا کیے۔ اور کسی سے اتنا نہوسکا کہ اُٹھ کھڑا ہوتا۔ اور بیچارے کو بچا لیتا۔ لیکن بات یہ ہے کہ



ہم نے کئی بار مداخلت کا قصد کیا لیکن ہر بار سختی سے جھڑکے اور ڈانٹے گئے۔ بلکہ میان تک نوبت پہنچ گئی کہ ایک بار کچھ مستند نے تنگی تلوار میں لیکے بارے سر پر مسلط کیے گئے کہ ہم لوگ چوں نہ کر سکیں۔ آخر کار ہم سے یہ دیکھا نہ گیا اور بڑی بیزاری کے ساتھ ہم لوگ چل کھڑے ہوئے۔ اس وقت ہم لوگ اس قدر نفور تھے کہ ہم نے معمولی مراسم تنظیم میں بھی کوتاہی کی اور بادشاہ سلامت جو ہمارے دخل درمقولات سے بچ ہو رہے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ ہم اسکا عیش منفع کر رہے ہیں نہ ہونے بھی نہایت بے پردہابی اور سردمہری کے ساتھ ہلوگوں کو اٹھ جانے دیا۔

ہمارے چلے آنے کے بعد جو کچھ ہوا وہ ہلوگوں بعد ازاں معلوم ہو گیا۔ یعنی جب یہ بیچارہ بالکل تنگ ہو چکا تو بادشاہ نے اور ناچنے پر اصرار کیا اور خاصہ تراش صاحب ہلکا ساتھ دیتے رہے اب اس وقت محل کے تمام ملازم زن و مرد۔ ہر درجہ اور طبقہ کے جمع ہو گئے کہ جانا نہ کے چچا صاحب کی کچھ حرکت ہو رہی ہو اسکا تماشا دیکھیں۔ اور یہ سارا ہلکا اس وقت تک مچا کیا جب تک جا پستا کثرت سے فوشی کے سبب بالکل جو نہیں ہو گئے۔ اس وقت البتہ اس بیچارے کی جان چھوٹی اور مدد کی طرح اور جتنے دوسری دربار میں سب یہ حال ہو کہ وہاں بادشاہ کی ذات ہی سب کچھ ہوتی ہو۔ اور اس کے عزیز اقارب کی وقت کمتریں درجہ کے آدمیوں سے زیادہ نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ وہ شخص جو شاہنشاہی پر زراگے باری سے بادشاہ کو راہی و خرسند کرے یا وہ چھوڑ کر جسکے ناچنے کی ادائیہ بادشاہ نے۔ ازرقیہ ہو بائیں انکی عزت و توقیر کے مقابلے میں بادشاہ کے سگے بھائی یا بیٹی ماں بھی ہمسری نہیں کر سکتی۔ اور چونکہ بادشاہ کو یہی رعایا کی سوت و زندگی پر پورا اتکال حاصل ہوتا ہے لہذا یہ ضرور ہے کہ ان کے منہ میں کوئی حسد انداز ہو اور نہ ان سے جو بدچل میں کوئی بات نہ کرانے والا۔ بلکہ وہ جو چاہیں مطلق العنانی کے ساتھ کرتے رہیں اور نہ اس کا نتیجہ ظلم کے حق پر کچھ اچھا نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ مثلاً ایک بات ایسی ہو جو کسی وقت محض گھڑی دو گھڑی کی تفریح سمجھ کے کی گئی ہو۔ اب اگر اس میں کسی نے درار کو ٹوک کی تو خدا اور استبداد پیدا ہو کے وہ ایک مستقل اور دیر پا زحمت و خرابی کا سبب ہو جائیگی علی الخصوص اگر کبھی یوں ہیں لوگ کسی بات میں دخل درمقولات کر بیٹھتے تھے تو بادشاہ کو ادبھی ضد پڑ جاتی اور کدسی ہو جاتی تھی۔ کیونکہ انکا غم و غصہ یوں بین لوگوں پر تو اتر سکتا تھا۔ چہاں ہمارا کسی غریب کے سر جاتی تھی۔ جسکی حمایت یہ لوگ کرتے تھے۔ چنانچہ جب بنما و سنگھ پر اسکی بیجا ظرافت سے عتاب نازل ہوا تھا (جسکا ذکر کسی گوشہ شباب میں ہو چکا ہو) تو اس وقت اسکو جو چھ

دھڑکا تھا یہی تھا کہ کہیں ہم دو پوچھیں ملا زمان خانگی اس بیچ میں نہ پڑیں۔ جتنی کہ اُس نے خود اکیلا یہ بیان کیا تھا کہ یہ اگر کہیں آپ لوگ اس بیچ میں پڑتے اور میرے حلقہ جتنی جگہ میری سفارش کرتے تو پھر میری جان ہی جاتی اور دنیا میں کوئی قوت ایسی نہ تھی جو مجھے بچا سکتی۔

جس موقع کا میں نے بیان کیا ہے اس وقت بادشاہ نے اپنے چچا سعادت سے یہی برتاؤ کیا تھا اور اس سے پیشتر ہم لوگ اسی قسم کا ایک اور سماں دیکھ چکے تھے۔ اس وقت جس غریب کے سر پر نازل ہوئی تھی وہ ایک نوعمر طوائف تھی کوئی سن سفید بڑھانہ تھا۔ اور اگرچہ اُس نے بہت کچھ ہاتھ پاؤں مائے۔ ہائے دلے کی۔ بلکہ اپنے تحفظ کے واسطے لڑتی جھگڑتی رہی لیکن خاصہ مزاح (جو دونوں دفعہ اصلی محرک اور کارکن تھا) اپنے حرکات سے باز نہ آیا اور اُس غریب کو تاشا کی باوشادہ کا دل خوش کرتا رہا۔ یہ بھی عجیب بات تھی کہ اُس کے برائے نام شوہر نے جو اُس کے سنگتوں لطفایاں میں تھا دراصل رعبہ کہ یہ ناپنے والیاں ہمیشہ اپنے سنگتی ساتھ رکھ کر تھیں اوجب یہ سپرد دیکھی کہ اُسکی اس حرکت سے جاننا محفوظ ہو رہے ہیں تو وہ بھی خاصہ تڑش کا شریک حال درمیان دھڑکا رہو گیا۔ دیکھو ایک خود مختار اور مطلق العنان بادشاہ کے دربار کے راجہ باش اور حاشیہ نشین اخلاق سے کتنا دھڑکا اور رید اخلاقی میں کیسے بیباک ہوتے ہیں۔

حقیقت میں یہ سب حرکات مجھ، مذموم درک ایک تھے اور پہنے بار بار بادشاہ سے یہ عرض عرض کی کہ ہمارے نزدیک یہ بالکل رگناہ ہے۔ اذیت ہے۔ بلکہ یہاں تک کہ اگر ہم کو تو ایسی باتوں سے بڑی نفرت ہوتی ہے۔ لیکن بھلا انکو چاری نہ پسندیدگی یا نفرت کی پردہ بھی کیا ہو سکتی تھی۔ چنانچہ اُس کے بعد ہر کچھ واقع ہوا اور بدتر ہوا۔

بادشاہ کے ایک اور چچا جنکا نام آصف تھا اور جو سعادت سے زیادہ نعم اور ضعیف تھے ایک روز بادشاہ کے ڈنیز میں مدعو کیے گئے۔ ابھی ہلوگ ایک بغل کے کمرے میں بیٹھے جاننا اور اُن کے مقرب ارکان خاصہ تڑش کا انتظار کر رہے تھے۔ آصف بھی ہمارے ساتھ تھے کہ ایک بار انہوں نے مجھے اگلی بجائے چپکے چپکے یہ پوچھا کہ مجھے بادشاہ نے کیوں بلایا ہے۔ آخر مجھے کون کام لینا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ صرف اپنے ساتھ خاصہ نوش کرنے کے لیے آپ کو بلا دیا ہے۔ اس پر انہوں نے بہت حسرتناک طریقہ اور درد بھری آواز سے کہا سپر سر ایسی دل بھرا کر دو بھلا تم دیکھو تو کہیں کس قدر سن رسیدہ ہوں میرے سن سفید بال دیکھو۔ میرے دہندہ اور جانے کی ماری لکھنؤ پر خیال کرو۔ بھلا میں اپنے نوجوان بیٹے کی صحبت کے قابل ہوں کہ جو شباب میں بھرا لڑکے

دو ہوا ہو مجھے تو آثار اچھے نظر نہیں آتے کیونکہ جب کبھی ہم ایسوں کو وہ یاد فرماتے ہیں تو کچھ سمجھا سلوک نہیں کرتے، میں نے انکو تسکین دی کہ ”نہیں آپ ایسا خیال نہ کیجئے اور کچھ ڈریئے نہیں۔ ابھی اُس دن بادشاہ نے آپکے بیٹے کو خاصہ کے وقت یاد فرمایا تھا اور اُس نے ابھی طرح پیش آئے تھے“ اس پر وہ بولے کہ ”اے تم نہیں جانتے جب نصیر الدین حیدر کے باپ مرے ہیں تب میرا بیٹا ادھ میں نہیں تھا اور نہ وہ اُس وقت ادو دھ میں تھا جب غازی الدین حیدر نے ہم لوگوں سے وعدہ وعید کیے تھے کہ نصیر الدین حیدر کی تخت نشینی سے مخالفت کریں۔“  
اسی وجہ سے نصیر الدین حیدر کو میرے بیٹے سے کچھ رنج و ملال نہیں ہو جو کچھ ہے وہ مجھے ہی میں تو خدا سے ہی دعا مانگتا ہوتا ہوں کہ وہ مجھے بغایت گھر میں بڑا رہنے دیں۔ کیا اُنکے خوش کرنے کو سارا شہر اور شہر میں ہو کچھ ہو کافی نہیں ہو۔ یہ باتیں ہو رہی رہی تھیں۔ کہ بادشاہ سلامت اپنے مقرب یار گاہ کے بازو کا سہارا دیے ہوئے نمودار ہوئے۔ آتے ہی آتے اُنھوں نے شاہانہ انداز سے ہمارے سلام لیے کیونکہ اس وقت انہر خاص قسم کا رعب داب تھا۔ پھر انھوں نے آصف اور میرے اور نگاہ جانی اور قریب آ کے بولے کہ ”چچا آصف خیر مقدم۔ خوش آمدید“ پھر ہاتھ چڑھا کے ملایا اور کہنے لگی کہ آپ تو کبھی میری خدمت میں نہیں آئے۔ آگاہیں دھونڈنا کس نے اس پر آصف نے بادشاہ کا ہاتھ ڈرتے ڈرتے اپنے ہاتھ میں لیا اور کہا کہ ”بھائی! کی کیا باتیں بیجا باتیں نے غلام کو سرفراز فرمایا“ بادشاہ آگے بڑھے اور کہنے لگے کہ ”کب میں آپ کو میرے پہلے چلوں گا۔“ ہلو بھی بھیجے بھیجے ہو یہ۔ اُس وقت کوئی بات غیر معمولی نہ تھی۔ بادشاہ اپنی کرسی پر نشن ہو گئے جو سلطان ذرا بلند کی پینچنی تھی۔ ہلوگ بائیں بائیں اپنی اپنی معمولی جگہوں پر بیٹھ گئے۔ آصف کو ٹھیک باؤہ کے سامنے جگہ ملی۔ اور اُنکے اگلے بغل کوئی نہ بیٹھا۔ جب کبھی بادشاہ سلامت کسی ہندوستانی کو خاصہ پر یاد فرماتے تھے تو وہ اسی مقام پر بیٹھتا تھا جہاں آصف بیٹھے تھے۔ یعنی ٹھیک بادشاہ کے روبرو۔

پہلے ڈیر اثرباب کی ایک بوتلی کھلی اور آصف کے سامنے رکھ دی گئی۔ پھر بخنی آئی۔ پھر بھلیان پھر اور سنگین کھانے اور لذتِ غذائیں آتی ہیں۔ بادشاہ سلامت آصف کے ساتھ شراب پیتے رہے۔ بیچارہ جدمہ جام پر جام چڑھاتا چلا گیا۔ اور اپنی عادت کے بموجب بار بار اپنی سفید مونچھوں کو ناؤ دیتا رہا۔ اتنے میں بادشاہ نے ہلوگوں میں سے ایک صاحب کی طرف خطاب کر کے فرمایا کہ کیوں جی! تم ہمارے چچا آصف کا ساتھ نہیں دیتے“ پھر ہر ایک سے مخاطب ہو کے یہی فرمایا۔

چنانچہ باری باری ایک شخص اُنھیں اپنا ہم پیالہ بناتا اور اپنے ساتھ جام پلاتا رہا۔ اسی طرح کئی دورے ہو گئے۔ چوتھا یا پانچواں دورہ تھا کہ اُنھوں نے جو گلاس رکھا تو آدھا خالی کر کے رکھا۔ بادشاہ کی نظر فوراً اسپرٹری اور اُنھوں نے اپنے چپاکی صورت پر پوری نظر جا کے ذرا حسرت کے ساتھ کہا کہ ”کیوں صاحب! کیا میرے ہاں کی شراب اچھی نہیں ہو؟“ اسپرٹری آصف نے شراب کی ثنا و صفت کی اور جو کچھ گلاس میں باقی رہا تھا پی گئے۔

دوسرا خان بڑھا دیا گیا۔ اور آخر کار میوہ جات میز پر آنے لگے میوہ جات ہی کے ساتھ معمولی کھیل تاشے بھی شروع ہوئے۔ اُس رات کچھ بھانجی کے سوانگ تھے اور کچھ نہ چنے والیاں لیکن بادشاہ ادھر بہت ہی کم ملتفت ہوئے اُنکی نگاہیں برابر آصف ہی پر پڑتی رہیں۔ اب وہ ٹڈیرا کی بوتل جو آصف کے سامنے رکھی گئی تھی قریب قریب بالکل خالی ہو گئی یہ دیکھ کر بادشاہ سلامت نے خاصہ تراش سے مخاطب ہو کر فرمایا ”کچھ دیکھتے بھی ہو۔ آصف تو اب کو اور شراب دینا چاہیے۔ جاؤ اُن کے واسطے دوسری بوتل لاؤ“ اور جب وہ بوتل لینے چلا تو بادشاہ نے ایک معنی خیز اداسے کے ساتھ اُس کی طرف دیکھا اور اشاروں ہی اشاروں میں کچھ بات چیت ہو گئی۔ آصف بیچارے نے بہت نہیں نہیں اُنکی اور زور زور سے مونچھیں کوبل دیے۔ لیکن اُنکی ایک نہ چلی۔ اگرچہ اسوقت وہ بہت تکلیف اور تکاؤ سمجھتے ہوئے تھے۔ لیکن شراب کی وجہ سے عالم سرخوشی طاری تھا میں تو خاصہ تراش کی بوتل لانے کی واسطے اُنھیں ہی سے کھٹک گیا تھا کیونکہ وہاں اسپرٹری لازم موجود تھے ایسی حالت میں خاصہ تراش کا اُنھیں کھانا ثابت کر رہا تھا کہ ضرور وال میں کچھ کالا جو میں نے بعد کو جو تحقیق کیا تو معلوم ہوا کہ پھر جو بوتل آئی اُس میں نصف ٹڈیرا تھی اور نصف برانڈی۔ اسکی تصدیق مجھے اُسی خدمتکار سے ہوئی جسے خاصہ تراش کی اعانت اس بار سے میں کی تھی۔ جب یہ بوتل آگئی تو بادشاہ نے کئی جام صحت تجویز کیے۔ پہلا تو اپنے بھائی شاہ انگلستان کا پھر اپنے دوستدار گورنر جنرل ہندوستان کا۔ پھر اسی طرح اور۔ اور آصف بیچارے کو اصرار اور زبردستی سے برابر شراب پینا پڑی۔ جتنے کہ اب وہ بالکل نشہ میں بخود دھوکے جھوٹنے لگے۔ وہ اپنی ہتے دار کرسی پر بڑی سیٹکی سے بیٹھے تھے اور اُنکا سر کبھی ادھر جھکتا تھا کبھی اُدھر۔ کیونکہ ہر مرتبہ وہ اپنے کو سنبھالتے اور آنکھوں کو کھولے رہنے کی کوشش کرتے تھے لیکن تھوڑی دیر بعد وہ نشہ سے بالکل سرشار ہو گئے۔

یہ حالت دیکھ کر بادشاہ غور غور ہو گئے اور ایک بار خوشی خوشی اپنے منظور نظر کھٹن ٹرے

اور بڑھے جیسے کی خمیدہ گردن کی بابت کچھ ارشاد فرمانے لگے جس پر خاصہ تراس سرودند  
 کھڑے ہو کے ہولاکہ حضور انکی مونچھیں بے ترتیب ہو گئی ہیں۔ انکو سنوار دینا چاہیے، اسپر  
 بادشاہ ہنسے اور بولے۔ ہاں۔ رخاں! لے اٹھو اور انکی مونچھیں درست کر دو۔ دیکھو ابھی طرح  
 خوب کس کبلی دینا۔ خاصہ تراس اٹھا اور بڑی بیدردی کے ساتھ دونوں طرف سے مونچھیں  
 کپڑے کے کھینچنے لگا۔ ایسا کہ ہر جھکے میں سر کبھی ادھر جھٹک جاتا تھا کبھی اُدھر۔ یہ حرکت ایسی تھی کہ جس  
 ہر شخص کو ایذا پہنچ سکتی تھی چہ جائیکہ ایک ضعیف۔ معمر۔ سن سفید بڑھے کے واسطے۔ چنانچہ پیدلی  
 دیکھنے ہم میں سے دو صاحب بڑی بیانی کے ساتھ اپنی کرسیوں سے اٹھ کھڑے ہوئے اور غل  
 جانے لگے کہ یہ کیا نظر ہو رہا ہو۔ مگر بادشاہ سلامت بہت جھنجھلا کے ہماری طرف پلٹ پڑے  
 اور کہنے لگے۔ دیکھو! کج دربار! ہوتے اپنی جگہ چھوڑی تو مجھے برا کوئی نہیں۔ کیا یہ بڑھا سونمیرا  
 چچا نہیں ہے! ہمارا بوجی چاہیہا ہمارا رخاں! اسکی درگت بنا لینگے! ایسی حالت میں کون دخل دے سکتا  
 کر سکتا تھا۔ چون کرنا بھی بے سود تھا۔ بلکہ یہ دستہ ہی زیادہ۔ کیونکہ شاید بجایا سے بڑھے ہر ادھر کچھ  
 سختی میں زیادتی ہو جاتی۔ ابھی تک آصف کا سر بے مکان چلے چلا جاتا تھا۔ آنکھیں البتہ خوب  
 کھلی ہوئی تھیں اور جیسی سفاکی کے ساتھ مونچھوں کو تاؤ دینے جارہے تھے اُسے قہر و دیش بکان  
 و دیش سمجھ کے انگیز کر رہا تھا۔ دنگڑی بعد پھر آنکھوں پر پھان پڑ گئے، اور اُنٹا غنیل ہو گیا شراب  
 کے بے انداز بی جانے۔ اُسے بالکل خدی سے باہر کر لیا تھا۔ اسی سے میں تھوڑی دیر کے  
 واسطے بادشاہ بہان متی کے گائے اور رنڈیوں کے تاج کی جانب متوجہ ہوئے۔ اُنکے تیر پر پل  
 پڑے ہوئے تھے اور آنکھیں بھی خشکیں تھیں۔ انکو ہلوگوں کی آواز بھولی نہ تھی۔ یکایک بادشاہ کی  
 نظر پھر بڑھے بجایا سے پڑی کیونکہ جب وہ سامنے دیکھ رہے تھے تو اس بجایا سے کے سرکہ بال بار  
 ہلنے سے حجاب ہو جاتا تھا۔ وہ بولے کہ ”اسکے سر کو تو قرار ہی نہیں ذرا ٹھیک کرنا چاہیے“ فوراً  
 ہی خاصہ تراش صاحب اُٹھ کھڑے ہوئے اور جلدی سے تلی کا ایک ٹکڑے کے دھار آصف کے  
 سر پر پونچھنے۔ پھر تلی کے برابر برابر دو کر کے کر کے اُسے ایک ایک ٹکڑے اور دونوں طرف کی مونچھ  
 سے باندھ دیا۔ ابھی تک ہلوگوں کی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ یہ کیا کر رہا ہو۔ لیکن بادشاہ سلامت خوش  
 ہو رہے تھے کیونکہ وہ سمجھ گئے تھے کہ کیا ہونے والا ہے لہذا اس بات پر خوش تھے کہ کئی سو بھی بچ  
 تو یہ ہے کہ جس مہوٹی سے اُسے گرہ لگائی تھی وہ اُس کا حق تھا۔ اور کوئی جسے قہمی استر سے  
 کبھی کام نہ پڑا ہو اور اسی مونچھ کے رنوز نکالتا کیا سمجھ سکتا تھا۔ لیکن ابھی یہ معاملہ طلب تھا کہ

ستہلی کے دوسرے سروں کا کیا انجام ہو گا۔ خاصہ تراش نے اس گتھی کو جلد سلجھا دیا اور ہر لنگھ کو زیادہ زحمت انتظار کھینچنا پڑی۔ اس عرصے میں بڑھے بیچارے نے دو ایک بار انھیں بھی کھولیں اور کچھ بڑبڑایا بھی۔ لیکن ڈیرہ اور برانڈی خوب دماغ پر تسلط کر چکی تھی۔ وہ انھیں کھولتا تھا مگر فوراً ہی چودھو جاتا تھا۔

میں نے کہا ہے کہ خاصہ تراش نے ہلوگوں کو زیادہ منتظر نہ رکھا۔ اُسے ستلی کے ٹکروں کے دونوں سروں کو جس کرسی پر بڑھا بیچارا بیٹھا تھا اُس کے دونوں ہتھوں سے کس کے بازو دیا۔ اوہرے کارروائی ہو رہی تھی اور ہر بھان ستی اپنے کرب دکھانے اور رٹپاں اپنے اپنے تانے میں مصروف تھیں اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ لوگ اپنے اپنے کام میں ایسا جی لگائے ہیں کہ دھر دیکھتے بھی نہیں۔ اتنے میں بادشاہ نے زور سے مائی پیٹی۔ فٹفٹہ لگایا۔ بفلین بجا میں۔ اور اپنے منظور نظر کی بر محل تجویز پر خوب خوشی ظاہر کی۔ اور اُس بیچارے کی یہ حالت ہو گئی کہ موچپنیں کرسی کے ہتھوں سے بندھ گئیں اب مرنے جو بے اختیاری اور مدہوشی میں جھونک کھائی تو سینے پر جھک کے رہ گیا۔ یہ حالت دیکر کے بادشاہ نے خاصہ تراش کے کانیں کچھ کما چسپروہ اٹھا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ اُس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ اب کی کوئی نیا قسم اس بڑھے بیچارے پر ہو گا۔ اور ایک معنی خیز نظر سے میں نے اپنے اُن مہربان کی طرف دیکھا جنھوں نے میری تقریب دربار میں کی تھی خاصہ تراش کے بعد اور تینے یورپین دربار میں تھے اُنہیں سے زیادہ انھیں کو بادشاہ کے مزاج میں رسوخ حاصل تھا۔ انھوں نے میری حقارت آمیز اور نفرت انگیز نظر کو دیکھا اور میرا مطلب سمجھ گئے۔ پھر تھوڑی دیر سکوت کر کے اُسٹھے اور نہایت آہستہ سے بادشاہ سے عرض کرنے لگی۔ تباہ عالم۔ میں حضور کے چچا کو کچھ خاص۔ کیے دیتا ہوں۔ یہ بڑی چٹک ہو رہی ہے۔ اب بادشاہ سلامت کا غصہ بالسنوں بڑھ گیا۔ چہرہ ہنسا اُٹھا۔ پانوں زمین پر دے مارے بولے تو یہ بولے "جاؤ کر کے سے نکل جاؤ" پھر تمہیں کھانے لگے اور بولے کہ جانیہ صاحب یہاں سے چلے جائیے۔ کیا مجھے اپنے گھر میں بھی اختیار نہیں ہے؟ اپنی محل میں بھی؟ جانیے جانیے اور اگر کرسی اور صاحب کو میرے اور میرے چچا کے بیچ میں دخل در سقولات کرنیکا شوق ہو تو وہ بھی آپ کے ساتھ چلے جائیں۔ یہ شک میں بھی اٹھا نہ سلام کر کے اپنے دوست کے ساتھ ہو لیا اُس وقت اسکا تو خیال کرنا بھی محض حماقت تھا کہ زبردستی کجائے۔ ہم سے جو ممکن تھا یہی تھا کہ اگر ایسی بیدردمی کے دیکھنے کی تاب نہ ہو تو وہاں سے اٹھ آئیں۔ چنانچہ ہم دونوں آدمی ساتھ ہی کمرے کے دروازے

پر پہنچے اور وہاں سے باہر نکل آئے۔ ہمارے بعد جو کچھ وہاں ہوا اسکو بھی ہنسنے دریافت کر لیا  
 لینے جیسے ہی ہلوگ کمرے سے باہر ہوئے ہیں کہ خاصہ تراش کچھ آتشبازی لیے ہوئے ہوں بچا اور  
 یہی آتشبازی بجایے بڑھے کی کرسی کے نیچے پھڑائی لگئی جس سے کنعت کی ٹانگیں بھسک ہو گئیں اور  
 بیتاب ہو کے اُسے کرسی کے ہتھوں پر ہاتھ ٹیک کے ٹانگیں اٹھانا یا اٹھ کھڑے ہونا چاہا تو اُس کے  
 اوپر کے ہونٹ پر سے بالوں کی دو ٹیٹیں الگ ہو گئیں اور اُنھیں کے ساتھ تھوڑا حصہ گوشت  
 کا بھی اتروخون خاصی طرح دہل دہل بننے لگا اور سارا نشہ کا فور ہو گیا۔ طرہ یہ کہ اب جو بھی اپنی  
 جان بچا کے اور یہ عذر معذرت کر کے وہاں سے چلا کہ ناک سے خون جاری ہو کیونکہ مجھے تو  
 اُس نے پہلے بادشاہ سلامت کا شکریہ بابت دعوت و مدارات کے ادا کیا اور پھر اس بات  
 پر تاسف ظاہر کیا کہ زخم کی وجہ سے زیادہ حاضر حضور نہیں رہ سکتا۔ بیشک وہ جانتا تھا کہ اُسکو  
 ساتھ نہایت وحشیانہ و ظالمانہ مدارات کی لگئی ہو لیکن اُس میں مصاحب بنو کا مادہ موجود تھا  
 اس لیے اُس نے حرف شکوہ لب پر آنے نہ کیا نہ اپنی ناراضگی و نفرت کو کسی طرح ظاہر ہونے دیا  
 معاذ اللہ کیا دہر دست مارے اور رونے نہ دے "کا مضمون جو۔ ستم تو یہ ہوا کہ اُس کے  
 ان تکالیف اور عذر خواہی پر بادشاہ سلامت خوب جی کھول کے اور تھقے مار کے ہنسنے۔ البتہ  
 اُس کے یورپین ہمنشین بالکل ساکت رہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ خاصہ تراش کے سوا اور کسی نے  
 ہنسی میں اُنکا ساتھ ہی نہیں دیا۔ اور خاصہ تراش پر بھی اپنی چوڑی جھپٹ کے آخری نتیجے پیش  
 و تر دے کے آثار نظر آتے تھے۔ کہتے ہیں کہ پھر اُس رات کو شاہی میز پر اور زیادہ چل مذاق  
 ہوا۔ اور بادشاہ سلامت سویرے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اب میرا اور میرے دوست کا حال سنئے۔ ہلوگ جو وہاں سے چلے تو سیدھے کانسٹنٹینا  
 (جنرل مارٹین صاحب کے مکان) پہنچے۔ کیونکہ اب یہ عمارت لکھنؤ میں ایک مشرقی سرکاری  
 کے طور پر ہر گئی جو۔ جس میں یورپین مسافر اور سیاح آ کے ٹھہرتے ہیں۔ اُنکو کرایہ مکان دینا  
 نہیں پڑتا۔ لیکن نہ خدمتگار خدمت کرتے کو ملتے ہیں نہ کھانا پینا مہیا ملتا ہو۔ ہلوگ وہاں پہلے  
 غرض سے گئے تھے کہ کچھ کرے خالی کرائیں کیونکہ ہلوگ شاہی مکانات میں رہتے تھے اور ہمیں  
 یہی خیال تھا کہ عنقریب حکم شاہی صادر ہوگا کہ وہ مکان خالی کیجیے اور نوکری سے اپنے کو متوفی  
 کیجیے۔ لیکن ایسا کوئی حکم آیا ہی نہیں۔

بادشاہ کے ہاتھوں آئے دن جہولت و خواری لوگوں کی ہوا کرتی تھی آخر کار رنگ لائی اور

نتیجہ یہ ہوا کہ اُنکے تمام اہل خاندان اُنکے ساتھ سخت کینہ و عداوت رکھنے لگے۔ اب اُنکے ناموں اور چچا اور اُنکی اولاد اور ابالی موالی کا ایک گروہ تھا کہ جو بادشاہی اہلکاروں پر تیوریاں چڑھا اور ہر وقت اُنکے سامنے پرآمادہ رہتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ نوبت پہونچ گئی کہ لکھنؤ میں برہمن اور شورش پھیل گئی۔ ہر طرف سسٹکی اور شور و ہنسی شروع ہو گئی۔ اور نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی فوج کے لوگوں تک بہ بد معاشرے نے اندھیرے اُبلے ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ آخر بیچ برس کے بادشاہ کو صاحب رزیدنٹ کی پناہ ڈھونڈنا پڑی۔ کیونکہ اگر کہنی کی فوج چھاؤنی سے آجائی تو یقیناً شورش فرد ہو جاتی۔ مگر صاحب رزیدنٹ نے اپنی فوج کے ذمے اس خدمت کے ڈالنے سے انکار کر دیا بلکہ بادشاہ کو افہام تغیر کی۔ اور ہر طرح نشیب و فراز سے آگاہ کر کے یہ راسے دی کہ اپنے اعزاء و اقارب سے ربط ضبط پیدا کریں اور جو کچھ شکر بخیاں ہیں اُنکے رفع و دفع کرنے کے واسطے خود بیچ میں بیٹھ کر بھی اقرار کیا۔ چنانچہ ایک ہفتے کی تشویش اور سخت پریشانی کے بعد سب معاملات سلجھ گئے اور اطمینان ہو گیا۔ اب دربار بھی حسب معمول ہونے لگے۔ ہلوگ بھی اپنے معینہ خدمات و منہاج پر سر فراز ہونے لگے۔ اور ہماری اتنے دنوں کی غیر حاضری بالکل نظر انداز کر دی گئی۔

انھیں واقعات کے بعد شاید پندرہ دن بھی نہیں گزرنے پائے تھے کہ بادشاہ نے کسی ضرورت خاص سے خاصہ تراش کو فائلت بھیجا۔ جگوا ب یاد نہیں رہا کہ وہ مزدورت کیا تھی شاید نئے شیشے آلات جھاڑ فانوس یا تیراب کی خریداری کے واسطے بھیجا تھا۔ اُسکی جگہ پر اُسکا بھائی کہ جوا بھی حال میں وارد ہوا تھا لکھنؤ میں رہ گیا۔ لیکن اُسکو مطلق رسوخ اور اقتدار حاصل ہوا۔ خاصہ تراش کے چلے جانے کے بعد ہلوگوں نے اپنے آپس میں یہ مصلحت کی کہ بس اب موقع ہو کہ اُسکے واسطے کوئی جوڑا راجائے اگر اب جگوا ب جگلیا تو جگلیا نہیں تو پھر کبھی نہ چلے گا جن صاحب نے دربار میں میری تقریب کی تھی وہ بھی بڑے مقرب اہلکار تھے اور بادشاہ اُنکو اپنا نہایت مغز اور مخلص دوست سمجھتے تھے اور یہی صاحب زیادہ تر درپے تھے کہ خاصہ تراش کی غیر موجودگی میں اُسکے خلاف پوری کوشش کر کے اُسے بالکل نظر دے کر دینا چاہیے اور ایسا کچھ کرنا چاہیے کہ اس کی واپسی پر بادشاہ اپنے عادات ساتھ کی طرف مودہ کرنے پائیں۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنا تخلیہ کی صحبتوں میں بادشاہ کو وہ تمام خرابیاں اور منفعتیں بھجائیں۔ بھجائیں۔ جسے بادشاہ کی نشان بلکہ صحت و عافیت میں بھی سخت خلل پڑ رہا تھا۔ اور اُنکے مکر کو نہ خاطر کر دیا کہ یہ ہر وقت کی تھی اور بخیر دی اُنکے واسطے کس درجہ سحر و سحر رہا۔ بادشاہ ہمیشہ ان باتوں کو ایسی طرح کان دہا



سنا کرتے تھے جیسے کوئی مدرسے کا لڑکا استاد کی مار کھا کے اسکی باتیں سنا کرتا ہو۔ بلکہ اکثر اوقات وہ خود اپنی حالت پر اسقدر نادم اور متاسف ہوتے تھے کہ ابدیدہ ہو جایا کرتے۔ اور کہنے لگتے تھے کہ ”ہاں۔ ہاں۔ سچ کہتے ہو۔ سچ۔ میں ایک رند خرابا بنی ہو گیا ہوں۔ اور ہر شخص جان گیا ہو۔ لیکن یہ سب خان کی بدولت ہوا ہو۔ واللہ۔ واللہ۔ وہ جو چاہتا ہو مجھے کرا لیا ہو۔“

اسی قسم کی گفتگوئیں۔ بار بار ہوئیں۔ اور آخر بادشاہ نے یہ ٹھان لی کہ جب خاصہ تراش و ٹوٹ کے آئے تو اپنے مدرسے نہ چھوڑے جائے۔ نہ اب وہ منظور نظر بننے کے سامنے آئے۔ یہ منصوبہ خود بادشاہ ہی نے ہلوگوں سے بیان کیا۔ اور ہلوگوں نے انکو امیر مبارک سلامت کی صدائیں سنائیں۔ اور انکو یہ یقین دلایا کہ نہ صرف انکی اپنی شان بلکہ سلطنت کی شان بکروہ چیز جسے وہ سب زیادہ عزیز رکھتے تھے اپنے انکی صحت و تندرستی کا بھی یہی تقاضا تھا کہ ایسا اتفاق جلد کیا جائے چیرا انھوں نے بہت سمجھ بوجھ کے کہا کہ ”موجودہ حکم معلوم نہیں ہو کہ جب میں دل میں ٹھان لیتا ہوں تو کیسا بات کا دعویٰ اور ارادے کا پکا ہوتا ہوں۔ میں اُس موٹے سورینے خان کو دکھلا دوں گا کہ دیکھ اب میں تیرے اشاروں پر نہیں چلوں گا۔ آپ خود اسے دیکھ لیجئے گا۔ اچھی آنکھوں سے دیکھ لیجئے گا۔ اچھا ذرا کلا رٹ کا ایک جام تو بلائیے۔“

اس منصوبے کے ٹھان لینے کے بعد ایک ہفتے تک ہلوگ سلسلے کے ساتھ شاہی میز پر بیٹھ جوتے رہے اور کسی روز ایسا اتفاق نہیں ہوا کہ کوئی شخص نیز پر سے برست ہو کہ اٹھا ہو۔ اب دربار کے قرینے درست ہونے لگے اور بد اخلاقی اور بغیرتی کی باتیں اُٹھنے لگیں۔ آخر کار ایک دن صبح ہلوگ یہ خبر ملی کہ رات کو خاصہ تراش صاحب داخل لکھنؤ ہو گئے ہیں اب ہلوگ اشتیاق پیدا ہو گیا کہ دیکھیں کیا انجام ہوتا ہو۔ ادھر آدھرا دوپہر بچہ بچہ کرنے سے ملو ہو کہ اسکا آنا صبح ہوا اور یہ کہ صبح کو روم وہ حضور میں بار بار بھی ہوا۔ ہلوگ بھی بچ کے دربار میں حاضر ہوئے جاکے دیکھتے کیا ہیں کہ بادشاہ کا سر اپنے منظور نظر کے ہاتھوں پر رکھ کر بھلا اچھی طرح خیال ہو کہ جب ہلوگ رننے ہو چکے تو اس کے چہرے پر تمدنی کی بشارت ظاہر ہو رہی تھی گویا زبان حال سے وہ کہہ رہا تھا کہ ”دیکھو۔ پالا چننا۔ ارا۔“ ہر حال بظاہر اُس نے گرجوشی کے گھر ہم سے علیک سلیک کی اور ہم نے بھی بخندہ پیشانی اُسکا جواب دیا۔ بادشاہ سلامت اُس سے کلکتے کے حالات پوچھنے لگے۔ پھر اسکی خرید و فروخت۔ گورنر جنرل۔ جہاز دہلی۔ روٹنگی وغیرہ سے متعلق سوالات کرتے رہے اور خاصہ تراش اپنے معمولی لب و لہجہ میں جواب دیتا رہا۔

جب ہلوگ وہاں سے اُٹھے اور اپنے ہاتھوں کے قریب پہنچے تو میرے دوست مجھے کہنے لگے کہ ”بھٹے ڈر جو کہ بادشاہ مطلق اپنے وعدہ کا خیال نہ رکھینگے“ اسپر میں نے کہا کہ ”اگر وہ اپنی بات کا پاس کرینگے تو سمجھ لیجئے کہ ہم بھی لکھنؤ میں زیادہ قیام نہیں کر سکتے“ انھوں نے کہا کہ ”ان سے کچھ کہتے ہو۔ اگر معاملات کی یہی صورت رہی تو ہمارا یہاں ٹھہرنا ناممکن ہو گا۔ کیونکہ کوئی ایسا ذرا آدمی اس کا تحمل نہیں کر سکتا“ اب ہم لوگوں نے بجائے خود طے کر لیا کہ اگر رات کو خاصہ کی میز پر خاصہ تراش اپنے معمولی جگہ پر بیٹھیں تو اپنی معمولی جگہ پر بیٹھ جائیں گے تاکہ دیکھیں انجام کار کیا ظاہر ہوتا ہو۔ لیکن میرے دوست صاحب جماعت میں شریک ہونے سے انکار کر دیں گے۔ جب شام ہوئی تو ہلوگ انہیں ذرا بھی شک نہ رہا کہ آتے ہی آتے خاصہ تراش کا رسوخ اور اقتدار بالکل مثل سابق قائم ہو گیا ہو۔ کوئی فرق نہیں ہوا۔ کیونکہ ہم نے دیکھا کہ بادشاہ جب پہلو والے کمرے کے قریب پہنچے تو حسب دستور اپنے منظور نظر کے شانہ پر سر ٹوڑے ہوئے تھے یہ دیکھ کر ہمارے دوست تو راجھتے پھرتے نظر آئے اور لب و ریاجس مکان میں رہتے تھے وہیں پہنچ گئے۔ اب ہلوگ کھانیکے کمرے میں پہنچ گئے۔ آگے آگے بادشاہ اور پیچھے ہم سب۔ پہلے تو بادشاہ نے ہمارے دوست کی غیر موجودگی کو اپنے اوپر لیا ہی نہیں۔ لیکن جب سب لوگ میز پر بیٹھ لیے تو انھوں نے کہا کہ ”ایں ہمارے مہربان کہاں ہیں؟“

میں نے جواب دیا کہ ”قبلہ عالم۔ وہ تو گھر چلے گئے“

اس پر وہ ہنسنے اور بولے ”ایں چلے گئے۔“ واقعہ یہ تو کچھ اچھا نہ کیا۔ اچھا انھیں بلواؤ پچھانچھ ایک چوہدار سے کہا گیا کہ دریا پار اتر کے باغ جائے اور انکو بلا لائے۔ اب کھانا شروع ہو گیا خاصہ تراش اپنی معمولی جگہ پر بیٹھا اور حسب دستور سابق اپنے خدمات بجالا رہا تھا۔ اتنے میں چوہدار واپس آیا۔ اُسے دیکھتے ہی بادشاہ نے پوچھا کہ ”وہ کہاں ہے؟“ ہر کار سے نے عرض کیا کہ ”قبلہ عالم صاحب نے بہت بہت آداب و تسلیم عرض کیا جو اور یہ گزارش کی ہو کہ حضور غیر حاضری معاف فرمائیں“ بادشاہ کہنے لگے کہ ”اباجانی کے سر کی قسم وہ کبھی معاف نہیں کیے جائینگے۔ جاکتے۔ اور ان سے کہا کہ منظور حاضر ہونا چاہیئے“ ہر کار سے نے جھک کے تسلیں کیں اور آہستہ کی کے ساتھ بٹ گیا۔ اب خشک اور بدن کے عوض نقیل کھانے آنے لگے نفیس نفیس کھانوں کی بوباس سے کراہک رہا تھا کہ پھر کھانا داخل ہوا۔ اُسے دیکھتے ہی بادشاہ ذرا تیز کے پکار اُٹھے ”کیوں کیا ہو؟“ یہ اسوجہ سے کہ بجائے کچھ زبان سے کہنے کے ہر کار احمد ن سلام کرنا رہا تھا۔ آخر اس نے بیان کیا کہ ”صاحب کہتے ہیں کچھ

قبلہ عالم سے یہی امید ہو کہ وہ میری حاضری پر زیادہ اصرار نہ فرمائیں گے۔ کیونکہ جاچنا ہ مجھ کی جانچ  
ہیں کہ میں کس وجہ سے حاضر نہیں ہوتا۔ بادشاہ نے بھجلا کے کاٹھانیز پر ٹپک دیا۔ یہ اُن کی  
معمولی عادت اٹھنا غضب کی تھی اور بوسے لگنا بھرجا۔ اور صاحب سے کہہ کر وہ یوں نہ آئیں گے  
تو میں خود اُنکو لے آؤں گا۔ آج اگر اُنکا اپنا بادشاہ ہوتا تو کبھی وہ ایسا براؤ اُس سے نہ کرتے۔  
پھر بھلا مجھے ایسا براؤ کیوں کرتے ہیں۔ جلد جان قیسری بار بھی ہر کار ارواز ہوا اب میوہ دیا  
میز پر آئے۔ اور بادشاہ کے جی بھلانے کے واسطے کھڑ تیلی کا تاشہ ہو رہا تھا کہ پھر ہر کار واپس  
آیا۔ لیکن ایک بار وہ اس شان سے آیا کہ گویا یہ کہہ رہا ہو کہ ”دیکھئے میں صاحب کرے ہی آیا  
وہ دیکھئے وہ آرہے ہیں۔“ بادشاہ نے جب اُن کو دیکھا تو بوسے لگاؤ۔ مہربان آؤ فوراً میرے  
ساتھ ایک جام تو پیو۔ یا حیدر۔ تمہارے یہاں آئے میں تو بیسے بوسے لگائے گئے۔ یہ کہنے بادشاہ  
نے غامی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ لیکن اُنھوں نے عرض کیا کہ ”مفتور مجھے معاف ہی کھین  
میں جاچنا ہ کے گوش گزار کر چکا ہوں کہ میں اب میز پر اس شخص کے ساتھ کبھی نہ بیٹھوں گا۔ یہ کہتے  
وقت اُنھوں نے خاصہ تراش کی طرف اشارہ کیا۔ اور پھر کہا ”اور اب میں ہرگز نہ بیٹھوں گا۔ لیکن  
بادشاہ کہنے لگے کہ ”اوہ جی۔ یہ کیا وایات ہو۔ بیٹھو۔ بیٹھو۔ لاؤ شامپین کی ایک بوتل ہمارے  
واسطے لاؤ۔“ لیکن بادشاہ کی اس بات کا ذرا اثر نہ ہوا۔ اُنکے چہرے پر بھلائی ہوئی تھی۔  
میں کب آسکتا تھا۔ اُسے نہایت انتہا سے اسکا جواب دیا۔ اور بادشاہ کو اُنکے راعید یاہ  
دلوائے آخر بادشاہ نے تنگ ہو کے کہا کہ ”معاذ اللہ معاذا اللہ تم بقدر ستارہ ہی ہو۔ یہ کہنے وہ  
کرسی سے اُٹھ کھڑے ہوئے اور خاصہ تراش اور کپتان باڈی گارڈ کو اپنے ساتھ آئے۔ کاخ ویکو  
بگڑے دل رفیق کو ساتھ لیا اور ایک پہلو کے کمرے میں چلے گئے۔

یہاں پہونچے بہت کچھ قبل و قال ہوئی۔ دونوں طرف سے شکوہ شکایت کے دفر کھلے  
خوب جواب سوال ہوئے۔ اس میں خاصہ تراش نے تو بالکل اپنے کو جاچنا کی مرضی پر چھوڑ دیا  
بگڑے دل رفیق نے بار بار بادشاہ کو اُنکا عہد و بیان یاد دلایا۔ اور کپتان صاحب نے صلح کن  
طریقہ اختیار کر کے دونوں کو دھما کر تنگی کو شمش کی خود بادشاہ سلامت بہت ہی دست باچھے  
یا تو بوسے ہی نہیں یا بوسے تو بہت کم۔ آخر کار بادشاہ نے یہ راہ نکالی کہ سب کھائیں گے کمرے میں چلے  
اور وہیں بیٹھ کر شامپین کی بوتل پر عالم اٹھا رکھیں۔ شیشہ و ساغر سے سب تعذیب فیصل ہو جائیگا  
لیکن اسکو میرے دوست نے کسی طرح فانا اور جب بادشاہ نے دیکھا کہ منانے کی جتنی تدبیریں تھیں

سب کرتھکے اور کچھ نتیجہ نہ نکلا تو انھوں نے پہلے ٹھنڈی سانس لی۔ پھر قسمیں کھائیں۔ دھکی دی۔ اور خاصہ تراش کی بغل میں ہاتھ دیکے کھانے کے کمرے میں چلے آئے۔ اُنکے پیچھے پیچھے کپتان جیسا بھی آئے لیکن باگڑے دلی برقیق صاحب اپنے گھر بیٹ گئے۔

جب بادشاہ نے شرکے کمرے میں دیکھا اور اُنکو نہ پایا تو بے کر وہ چلے گئے۔ چہرے پر کٹکٹ نظر نظر نے جواب دیا کہ خیر کیا مضائقہ ہے۔ انکی جگہ باسانی بھر سکتی ہو۔ بادشاہ سلامت یہ سنکے کہنے لگے کہ وہ اُٹھ۔ جانے بھی دو۔ مردود کو۔ اسکی جگہ کا بھرنا بھی کوئی جبری بات ہو۔ اب یہ معلوم ہوتا تھا کہ بات رفع دفع ہو گئی۔ لیکن بتوڑ یہ معاملہ ختم نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ اب میری بات بھی جب بادشاہ نے نظر اُنکے کے ایک بار اپنے سب مہانوں کو دیکھا تو اُن کی نگاہ بھیر پرتیج سے ہم گئی۔ چونکہ اسوقت میں بھی انھیں کیڑے دیکھ رہا تھا لہذا ہم دونوں کی نگاہیں اُن کی گئیں۔ لیکن انھوں نے فوراً اپنی آنکھ پھیر لی اور نقل کی طرٹ ہاتھ پڑھا کے دبی زبان میں شراب کی بات کچھ کہنا۔ چہرے میں سے اپنا کلاس بھرا اور بادشاہ نے اپنا۔ ابھی اُنکا ہاتھ بوتل پر تھا اور نگاہ بھیر گئی۔ دبی جتنی۔ لیکن اب اُنکے چہرے پر شاشت نہ تھی بلکہ آنکھیں خوفناک ہو رہی تھیں۔ اتنے میں جس نے اپنا کلاس اٹھایا اور دبار کی مہر لی داب و دستو کے مہر جیہ یہ کہنے کو تھا کہ خدا جاننا یہ پانی برکت نمازل کرے یا کہ بادشاہ سے اپنا کلاس چھپا دیا۔ شراب لٹھک گئی اور بہت زور سے غصہ بنا کہ ہو کے فرمایا نہیں۔ صاحب میں آپ کے ساتھ شراب نہ پونگا۔ تم بھی اُسی کے دوست ہو۔ میں نے عرض کیا کہ اگر ابھی کل کی بات ہو کہ حضور بھی اُسی کے دوست تھے اور اس سے ارشاد فرماتے تھے کہ کسی کچھ قدر اسکی حضور کے دلی میں جو اب تو بادشاہ بہت برہم ہے اور کہنے لگے۔ "سنئے ہو آپ کیا کہ رہی ہیں۔ اس ذرا سنا تو آپ کیا کہ رہے ہیں۔ میں نہیں جانتا انکو کیسے اس لب و لہجہ میں مجھے بات کرنے کی جرأت ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ "حضور رجا پناہ خواہ اگر یزوں کے قدر دان ہیں۔ اور حضور کی سرفرازی و قدر دانی نے اُنکو جرمی کر دیا ہے۔ کہ بعض اوقات وہ اپنا دل کھول کے حضور کے سامنے رکھ دیتے ہیں۔ شاید حضور کو میری موجودگی ناگوار ہو۔ اس واقعی میں نے خود بہت تاخیر کی۔ یہ کہتے ہی کہتے میں اُٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف چلا۔ جب تک میں دروازے تک پہنچا سنتا ہا کہ پہلے تو بادشاہ نے کچھ نہیں کھائیں پھر سیز پر زور سے کانٹا مارا۔

اسی شب کو میرے دوست کو شاہی حکم پہنچا کہ جس مکان میں وہ مقیم ہیں اُسے خالی کر دیں

جو ہر کار سے یہ سم لائے تھے انکو یہ بھی حکم ملا تھا کہ مکان کا اسباب نکال کے باہر پھینک دیجئے لیکن نواب کا دل نہیں چاہتا تھا کہ ایسے حکم کی تعمیل میں کچھ سختی کریں۔ کیونکہ انکو یورپین لوگوں سے بچ طرح کا ڈر مایا ہوا تھا۔ چنانچہ ان کے آدمیوں نے مختلف اشیاء کی کاسٹنٹیا بہت بہو پنا دینے میں بڑی اعانت کی۔ یہی مقام تھا جہاں معتبہ رفیق اور اُسکے اہل خاندان کیوسٹے کرے نے رکھے گئے تھے۔

میری یہ حالت ہوئی کہ میری علیحدگی بہت جلد سرانجام پاگئی۔ میرے ساتھ نہ جو رہنجال تھی نہ لڑکے بھونچال لہذا میرے پاس اسقدر ساز و سامان ہی نہ تھا جسکے اٹھانے بٹھانے میں کچھ بہت زحمت ہوتی۔ خیر صبح ہونے سے پہلے ہی پہلے ہلوگ کاسٹنٹیا میں مزے سے آرام کرنے لگے۔ کیونکہ یہاں پہونچکے ہلوگوں نے صاحب ریڈیٹ کی حفاظت و سرپرستی حاصل کر لی تھی اور انھوں نے اس باب میں نواب سے کچھ خط و کتابت بھی کی تھی جس میں انکو اکٹھا کر دیا تھا کہ اگر ہمارا ذرا بھی مال بچا ہوگا تو اُسکے جوابدہ ہی ہوں گے۔

ہلوگ چند روز تک کاسٹنٹیا میں نہایت اطمینان سے رہے۔ اور جب سب انتظامات درست ہو گئے تو ہلوگ گوتمی کے ذریعے گنگا پہونچے۔ اور فوراً کلکتہ کے مسافریں گئے۔ یہ انجام تھا اُس شاہی نظر عنایت کا جو میرے حال پر تھی۔ اب مجھے صرف چند الفاظ اور کہنا ہیں جن میں خاصہ تراش اور جانناہ دونوں کے سرگزشتین ٹھل ہو جائیگی۔

جب خاصہ تراش کلکتہ گیا تھا جسکا حال میں اوپر بیاں کر چکا ہوں تو اُسکا یہ ارادہ معلوم ہوتا تھا کہ بس ہندوستان سے چلا ہی جائے۔ اُسے ایک معتد بہ رقم کمائی کے خزانے میں امانت جمع کی۔ کیونکہ اتنا تو آخر وہ خود بھی جانتا ہو جتنا تھا کہ اُسکی حیثیت آہر دیکھا ہے اور کس قدر پائدار اور مستقل ہو۔ اور اسی وجہ سے اُسے یہ قصد کر لیا تھا کہ بس اب کچھ کو خیر باد کہنا ہی مناسب ہو۔ ورنہ کہیں بادشاہ کی تلون طبع تک نوبت پہونچی تو بہت زبوں ہوگا۔ اُسے کچھ شک نہیں کہ اپنے چلنے کی طیاری کا ایک ہندو بہت یہ بھی تھا کہ اُسے انگلستان سے اپنا ایک بھائی کو بلا لیا تھا۔ اور اسی بھائی نے اُسے کلکتہ سے واپس آنے پر اسکو مفصل اطلاع کر دی تھی۔ اُسکی نیت میں اُسکے واسطے کیا کیا سازشیں کی گئیں تھیں۔ کیونکہ ہلوگوں نے جو اصلاحات تجویز کی تھیں اُنکو بار بار اور ریڈیٹسی دونوں جگہ بڑا چرچا تھا۔ خاصہ تراش کو یہی امید تھی کہ اُسکی غیر بڑی بین اُسکا بھائی اُسکی دونوں خدمتوں کو سرانجام دے لیا جائے بادشاہ کے بال بھی سنواریا لگا

اور رتنے اور ترش خانے کا بھی انتظام کیا کرے گا۔ لیکن یہ اسکی غلطی تھی۔ یا تو اسنے بادشاہ کی طبیعت کو نہیں پہچانا تھا کہ کتنی مستقل اور وضع دار ہو اور یا اپنے بھائی کی دختر کن او اؤن کا اندازہ غلط کیا تھا۔ خیر۔ ہلوگوس کی علیحدگی کے بعد جب خاصہ تراش پھر اپنی جگہ پر قائم ہو گیا اور بادشاہ کی نظر عنایت پھر حسب دستور اسپر پڑنے لگی تو اب اسنے اور بھی زیادہ غرور مختاری اور مطلق العنانی دکھلانا شروع کر دی۔ اور دربار میں اب کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ اسے کسی بات میں روک ٹوک سکے جتنی کہ اس زمانے میں جیسے واقعات اور معاملات دربار میں پیش آئے انپر ہندوستان بھر میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ چنانچہ کلکتہ ریونیونے اس زمانے کا حال لکھا ہو کہ دربار سے تہذیب و مقنات اور ادب آداب سب تشریف لے گئے اور اب بادشاہ کی یہ کیفیت اکثر ہو جاتی ہو کہ کرنل صاحب رزیدنٹ نے اُن سے ملاقات کرنے سے بارہا انکار کر دیا اور اُن کے کینہہ خصایل اور ذلیس مہاجوں سے معاملات میں بات چیت کرنا تو مطلقاً چھوڑ دیا۔ لیکن اس تمام ابتری اور شور و شر کے زمانے میں بھی بادشاہ کو ہم لوگوں کی حیوانی کا صدمہ بہت ہوا۔ وہ خود محسوس کرنے لگے کہ خاصہ تراش اُنھیں موسم کی ناک بار بار ہوا اور جو چاہتا ہوا اُن سے کرا لیتا ہو۔ یہ حالت اُنکو آخر میں بہت شاق ہو گئی۔ اور ایک بار نہیں بلکہ کئی مرتبہ اُنھوں نے کھلم کھلا اسکو اس بات پر بہت باتیں سنائیں کہ اُسی کی وجہ سے اُنکے دو ایسے دوست بچھڑ گئے کہ جو ہر وقت نیک صلاح دیتے رہتے تھے۔ خاصہ تراش کو قہر سلطانی کے آثار نظر آنے لگے تو اسنے بھی اپنا بوریا بدھنا سنھنا اُسکے بھائی پر بادشاہ کا دل کھپی نہ آیا۔ بادشاہ کچھ کھٹک گئے تھے۔ اور سمجھنے لگے تھے کہ خاصہ تراش کا منشا یہ ہے کہ اپنی ہی ایسی بڑے لوگوں کی صحبت میں مجھے دن رات رکھے۔ اور ہر طرف سے ایسے ہی آدمی میرے ارد گرد رہیں۔ خاصہ تراش نے دربار میں ایک یورپین چیف کلرک جیسا خطا دار و غمہ باور چیخا نہ تھا۔ اور جڑھا دیا تھا۔ اور یہ شخص جو اسکا مرغ و دست پر دربار میں یورپین ملازماں غائی میں پہلے کے دو آدمی جو باقی رہ گئے تھے وہ بالکل برائے نام تھے اب دربار کے مالک ہی میں تھے۔ خاصہ تراش۔ اسکا بھائی۔ اور داروغہ باور چیخا نہ۔ اور جو کچھ وقار و اقتدار تھا اُنھیں کا تھا۔

آخر کا معاملات حد سے گزر گئے اور بگڑنے کی انتہا ہو گئی۔ دربار کی باتریوں اور بیہودگیوں سے صاحب رزیدنٹ بھی عاجز آگئے تھے اور کئی ناگواری روز افزوں تھی

تھے کہ اب وہ بڑے مشہور و مد سے اور بہت جلد جلد اصلاح حالت پر توجہ دلانے لگے بادشاہ بھی دق ہو رہے تھے۔ اور تنگ آگئے تھے۔ کیونکہ دربار میں ایسے ہندوستانیوں کی کمی نہ تھی جو ہر وقت بادشاہ کے کان خاصہ تراش کی برائیوں سے بھرتے رہتے تھے۔ اور مختلف مخفی تدبیروں اور ترکیبوں سے انکو دکھاتے بھجاتے رہتے تھے کہ سارا فساد اس کجبت کی ذات کا ہے۔ کیونکہ ان لوگوں کو یہ جرات تو تھی نہیں کہ علانیہ اور علے الرغم اس کے خلاف کوئی کارروائی کرتے۔ آخر کار ایک روز بادشاہ نے بکڑ کے اس سے کہا کہ منوجی تمہیں نے میرے دو مشیروں کو مجھ سے جدا کر دیا۔ اور اب تم یہ سمجھتے ہو کہ تم اور تمہارا بھائی جو چاہیں گے مجھ سے کرا لیں گے۔ لیکن تمکو بہت جلد معلوم ہو جائیگا کہ یہ سو اسے خام خٹکے پکا ہوا رزیدنٹ صاحب کا یہ کہنا سچ ہے کہ تمہیں پس کی کانٹھ اور فساد کی جڑ ہوا اور تمہاری ہی دتا سے دربار کا رنگ بگڑا ہے۔ یہ سن کے خاصہ تراش کے دل میں ہول سا اٹھی۔ پھر اسی کے ساتھ ہی اُس نے دیکھا کہ اُس کے ایک یا دو کار کے اخراج کے واسطے بھی کچھ سامان ہو رہے ہیں تو اور بھی سمجھا گیا۔ حتیٰ کہ اسی وحشت اور اضطراب میں ایک شہر و شہنشاہ وہ کانپور ہو گیا۔ یہاں پہنچ کر وہ کمپنی کی عکدار ہی میں داخل اور بادشاہ کے دسترس سے باہر ہو گیا۔

جب نصیر الدین حیدر نے اُس کی مفرد ری کا عالی سنا تو کچھ عہدہ دار سرداروں کی اُس کے مکان پر بھیجے جنہوں نے اُس کے بھائی اور بیٹے کو گرفتار اور مال اسباب کو ضبط کر لیا۔ اگر صاحب رزیدنٹ صاحب کا قدم در میان میں نہ ہو جاتا تو یقیناً ان دونوں کی گردنیں ماری جاتیں۔ لیکن رزیدنٹ صاحب سینہ سپر ہو گئے اور ان کی وجہ سے یہ دونوں صرف دس دن تک مقید رہے پھر چھوڑ دیے گئے۔ دس دن تک اس وجہ سے کہ اتنی مدت میں بادشاہ اور اُس کے وزیر نے اسباب کی منبلی قرقی کی کارروائی باطنی کر لی۔ کہتے ہیں کہ جو جائیداد منبلی میں ملی اُسکی قیمت تخمیناً ایک لاکھ روپیہ رہے۔ دس ہزار پانچ (۱۵) تھی۔

اسلئے یہ واقعہ مفردی میں نے ایک ایسے شخص کی زبانی سنا ہے جو اُس زمانہ میں لکھنؤ میں موجود تھا اور مجھے اسکی صحت پر کچھ شبہ نہیں ہے۔ اگرچہ لٹریچر کی کثرت مفید ہے۔ مگر مشہور ہے اس کی بابت ایک اور واقعہ لکھا ہے (منع)

اب خاصہ تراش کا حال سنئے کہ کانپور پہونچے اُسے فوراً کلکتہ کی راہ لی ۔ اور جب اُسکے عزیز واقارب کلکتہ میں اُس سے مل گئے تو اُسے وہاں سے انگلستان کا کوچ بول دیا۔

خاصہ تراش نے جتقدر دولت پیدا کی اور جو وہ اپنے ساتھ لے گیا۔ اُسکا بالکل ٹھیک اندازہ تو نہیں کیا جاسکتا لیکن میں نے یہ سنا ہے کہ لوگوں کا تخمینہ یہ تھا کہ اُسے جو بیس لاکھ روپیہ دینے دو لاکھ چالیس ہزار پاوند اُس سے کسی طرح کم جمع نہیں کیا جب وہ انگلستان میں پہونچا تو اُسے اس روپیہ کو کاروبار میں لگایا اور ایک مدت تک اُسکا کام خوب چلتا رہا وہ سوداگر بھی۔ ایک شراب کے کارخانے کا شریک بھی تھا اور تھوک فروش بھی کام کرتا تھا۔ پھر اُس نے ریلوں میں حصہ لیا۔ مگر اس میں اُسکو سب سے پہلے خسارہ ہوا کیونکہ بہت بڑا حصہ اُسکی دولت کا اسی ذریعے سے ٹوٹے میں پڑ گیا۔ پھر شراب کے کارخانے میں بھی بڑا گھٹا ہوا۔ اور آخر کار انجام یہ ہوا کہ ۱۸۵۷ء میں اُسے دیوالیہ عدالت میں جانا پڑا۔ تاہم اُسکا نام لندن ڈائریکٹری میں اب بھی ”..... صاحب سوداگر“ کر کے لکھا ہے اور وہ حوالی شہر کے ایک نہایت صاحب تھری اور فیشن اہل عمارت میں رہتا ہے۔

نصیر الدین حیدر جانناہ و قبلہ عالم کا یہ حال ہوا کہ خاصہ تراش کا چلا جانا اُن کے واسطے پیغام اجل آنا ہو گیا۔ اُسکے جاتے ہی اُنکے اہل خاندان کو موقع مل گیا اور اُنھوں نے اپنے آؤسے و بار میں بھرتی کرنا شروع کر دیے۔ اور ابھی خاصہ تراش کو لکھنؤ سے گئے صرف چار مہینے ہوئے تھے کہ درگاہ میں بادشاہ سلامت کو زہر دیا گیا۔ اُنکے بعد اُنکے ایک چچا جیسے وہ ہمیشہ نہایت بڑی طرح پیش آتے رہے تھے مسند نشین ہو گئے اور اُنھیں چچا کا بیٹا فی الحال بادشاہت کر رہا ہے۔



## ﴿ خاتمۃ الکتاب ﴾

معزز ناظرین۔ اودھر کے فرمانروائے محل اور نصیر الدین حیدر کے مفصل حالات اور بادشاہی کی کیفیت آپ سن چکے اور اچھی بُری رائے بھی قائم کر چکے۔ یہ بھی آپ کو معلوم ہو گیا کہ یورپ میں مورخ اور ستیاج اودھر کے بارے میں کیا خیالات ظاہر کر چکے ہیں۔ اب ذرا تصویر کا ایک اور رخ ملاحظہ کیجیے۔ دیکھئے ایک محب وطن کس حسرت اشتیاق اور جوش سے اپنے بادشاہ کی تصویر الفاظ میں کھینچتا ہے۔ اس کے جذبات حب الوطنی آنکھوں کو نہ دوسری طرف متوجہ ہونے نہ دل میں نکتہ چینی کی ہوا اگنے دیتے ہیں اُسے سب بھلا معلوم ہوتا ہے۔

شامیونین بین الاوّل یوم شنبہ ۱۲۳۳ھ اور ۱۲۳۴ھ اکتوبر ۱۲۳۳ھ تھے کہ زیب دہ اور نگ شاہی ہوا اور بعد پھر مرزا غازی الدین حیدر جلوس عینت مانوس سریر سلطنت پر کیا اس سن و سال میں بادشاہی ہاتھ آئی۔ فرمانروائی فرمائی کہ شاہان گذشتہ کو جسکی تمنا رہی میسر نہ آئی۔ جو ان بخت و جواں دولت جواں سال پچیس برس کا سن عین شباب جوانی کی آب و تاب مزے کے دن تھے تخت و تاج ہاتھ آیا۔ زیست کی کیفیت۔ حکومت کا لطف خوب اُٹھایا۔ جلسہ وہ موجود رہا جو محمد شاہ کو نصیب نہوا۔ ہزار ہا پری پیکر حور و شہسمن نگین نازک اندام بالباس پر تکلف و زربزمہ خضام دست بستہ حاضر رہیں۔ گلاب و کیوڑہ تو کیا عطر کی نہریں بہیں۔ مکان و باغ ہر اک بہشت کا نمونہ۔ گلشن شداد سے طیاری میں دونا۔ روپیہ اشرفی کے گنج خالی کر دیے۔

ناقہ کشدان اور محتاجوں کے گھر بھر دیے گلشن شباب سکھ لہلہا رہا تھا۔ پھولوں کا یہ صرف رہا کہ ہاروں باغ سرور کی عجیب روش و غریب طیاری کے تھے اسپر کئی سو روپیہ روز کے بازار سے آئے صبح کو خراشینوں کے ہاتھ جاندی کے ڈھیر لگاتے تھے۔ جلسے والیاں نادر زمانہ شہرہ آفاق۔ گائیں پڑی پیکر موسیقی میں گیتا۔ دلبری میں طاق۔ انکے علاوہ ہزاروں مسہرہ۔ رشک مسہرہ کسمن۔ انکی لاوا لیاں اُمنگ کے دن۔ کہاریاں پر یونکی صورت۔ ہمیشہ ہوا در مثل سلیمان علیہ السلام ہوا پر رہا۔ ناز و انداز نے ہر سرزمین یاؤں نہ نکلے دیا۔ اکثر مسہرہ کو جین بندہ می مشوقان طنز و گلزار ناظرین کا دل باغ باغ ہو جاتا مدام اُس تختہ کلفام پر لالہ دل کا تابی سنبھل اُنکی زلف مسلسل دیکھتے پڑے

مہی کی دھڑی کی دید میں روئے سوئے کہو تھا۔ بلج کو سوز بان سے موجود تھا۔ ٹرگس کی آن آنکھوں  
 پر ہنسی رہتی تھی۔ دیدہ آہوئے غن سے خون کی ندی بہتی تھی۔ زرخیز دل دیکھ سب کا دل ڈوب  
 جاتا منہ میں پانی میں پانی بھرتا تھا۔ ہی کا ضرر ہوتا۔ دھب لک جاتا تھا۔ سولائف دیہاتی اور سوشہ کا  
 چیدہ نوکر خلائق پر سب سے موجود ہوئے پچیس پچیس طائفوں نے ایک رنگ کے جوڑے عتایت  
 سکار باغ دہار پہنے۔ اور زیور بھی مناسب میل کا۔ معلوم ہوا کہ چین روانی ہو۔ بلکہ بھولوں میں  
 نیز اکت و لطافت۔ روشن رفتار تکلف گفتار طرز و انداز۔ غرہ دناز کہاں ہو۔ اور بھانمتی۔ جو نے  
 والیاں نٹیاں وضع کی زلالیاں۔ تو ال بین کار۔ رہا پیس۔ سرودیے۔ یہاں تک کہ کچھ والے قلندر  
 اور بڑا بند بھی موجود رہتے۔ کمرے میں سامان عیش تیار۔ انگریزی میز ایک سے ایک تختہ بقیش و نگار  
 جہاں تک پیک نگاہ جانے گلدستہ بندی پائے۔ گرد کنڑ باد ہار غوانی گذار۔ زمرہ دام چنے۔  
 قریب گزک کو نو اک۔ ہر قسم کے کباب۔ کشتریوں میں بادام پستے بچھے۔ متصل اس کے لغت غیر مترب  
 طرح طرح کے پلاؤ۔ دو بیازے۔ متعدد دیکوان۔ بے حساب بورانی۔ بھرتہ چٹنی۔ اپار۔ ہر گلدستے کے  
 اتنا سامان کہ دوسری طرف۔ ہاتھ بڑھانے کی فبت نہ آئے جس شے کی خواہش ہو کھائے۔ کرہ دوزن  
 کی صورت کا سجا۔ جھاڑ۔ کنول۔ فانوس ہوشہ با۔ پردوں میں سیروں بنت۔ گو کھو۔ بادولہ۔ پکا کھا۔ فرش  
 سے تاسقف و جدار آئینہ بندی معقول۔ سکندر اگر دیکھتا حیرت آتی۔ اپنی سلطنت بھل جاتی  
 جدھر نظر اٹھاؤ ایک کے ہزار پاؤ۔ ادھر خود بدولت رونق افزا ہوئے ادھر پریوکا بلج ہونے لگا۔  
 کمرے کے باہر انگریزی باجے بچے گئے۔ تو ال بین کار ساز پلاؤ بچے لگے جو جوا اندر باہر حاضر تھا اپنے کام میں  
 مشغول۔ حضور اکل و شرب میں متوجہ ہوئے کیسی طرف آنکھ نہ اٹھاتے تھے۔ ان کے اظہر آئینوں میں نظر  
 آتے تھے۔ اب جسکا بخت مددگار و اطلاع یار ہوا اسکو قریب بلا یا کچھ کھلایا پلا یا اور جو اختلاط منظر  
 ہو تو اس کا دل زرد و رہو ایک دم میں نہال کیا۔ دولت دنیا سے مالا مال کیا۔ ایک دن میں پانچو  
 جوڑی جوا ہر نگار کر کے کی نرم رنگا تھوں میں رنڈیوں کے چڑے نصف شب گزری محبت موقوف  
 یہ قافلہ روانہ ہوا۔ وہ جلسے والیاں اور محل کی گائیکیں پری وش۔ ذی ہوش مرصع پوش تھیں اٹھا  
 آنا ہوا۔ کوئی تلوے سلانے لگی کوئی پنکھا پلانے لگی۔ کسی نے کمانی شروع کی۔ کوئی پیہ لگھانے  
 لگی۔ کوئی شہر جہتہ پڑھنے لگی۔ کوئی پاؤں دہانے کے ہانے سے دے پاؤں بڑھنے لگی۔ اب اسمین  
 جسکا نصیب جاگا وہ اپنا حصہ لے بھاگا۔ دم سحر جب بیدار ہوئے۔ سیر کو سوار ہوئے۔ ہر روز نیا  
 مکان تازہ سامان۔ غرض کہ ہر شب شب برات جو دن تھا خرم کے سوا عید تھی ہر دم بھری رخنہ

دید تھی۔ قابل دید یہ جلسہ تھا۔ خوش نصیب اُسکے جس کی نظر سے گذر اہمیت کے روبرو عالم بخیل تھا۔  
 گو ملک قلیل تھا۔ چشمہ فیض سد جاری تھا۔ لینے والا عاری تھا جس جس کی قسمت میں لے لیا تھا۔  
 الماس و زمرہ کا گنا تھا۔ قدسیہ محل پر طبیعت جو آئی۔ خاک سے پاک کیا۔ دو گھڑی میں آسمان  
 پر بارگاہ پونچائی۔ جاڑے کی فصل میں لاکھ روپیہ عینے کی تین رضائیاں بنتی تھیں۔ گریوں  
 میں اُنکی ہوا معلوم نہوتی تھی کہ کیا ہوئیں۔ ملکہ زمانہ اور مخدوم علیا اور تاج محل ان سب کا  
 خرچ رہا اور تازیت رہیگا۔ احتیاج قریب نہ آئے گی کئی پشت اُنکی مرے اُٹ اُسے جی  
 ڈلوئی اور دھنیا کھاریاں تھیں۔ دس باغ لاکھ روپیہ اُنکی نگاہ میں نہ سہا یا اُن کو کھلایا۔ مٹکا  
 خیاط کی قطع برید دینا سے نزاری رہی۔ ہر دم عیش و طرب لاوا با رہی۔ کچھ صندوق کترنے جمع تھے  
 نائب سے زر خیر اُسکی قیمت لیکے حضرت نے مٹکا کو عنایت کیے وہ منہ دیکھتے رہے۔ لاکھوں  
 روپے کی عمارت اُسے اپنی بستی میں بنائی۔ اور بارہ ہزار گنج۔ بارغ کی طیار سی کی جو پوشاک  
 ایک بار زیب جسم کی پھر نہ پہنی سے ڈالی گو لاکھوں کی ہوئی۔ خوش دامنی میں تانا شاہ بر طعنہ  
 زن ہوں تو بجا ہو کہ مروج میرا نازک دماغ ایسا ہو۔ ایک دن تلخ کی بانڈی میں تیل چڑ گیا  
 وہ بھی موہتا کے عطرسے کہ نہ تھا مگر طبیعت کدرد دماغ پریشان ہوا۔ خوش ساز طلب ہوئے۔ پوچھا  
 گیا کیا ہوتا ہے۔ عرض کی موافق معمول انھوں نے باہم اثبات کیا تو سیل نکلا۔ بیٹے کا تیل نکلا۔ تلخ  
 سا و اس قوت شام صفائی دماغ پر خطا کے مقرر ہوئے۔ ترجمہ یہ تھا کہ قصور معاف ہوئے مگر دلائف  
 ہوئے۔ مغلانیاں ہزار ہا سوراہے کی نوکر۔ گولے چلے۔ بارے اور زریفت کی کترن باقی تھیں۔  
 کوسونے چاندی کی اینٹیں گھڑواتی تھیں۔ خاصہ دایوں نے مشک۔ جہیز۔ زعفران کے کارے سے  
 رنگ لایا اُنکی کے خاصہ خاصہ گل بنائے ڈیاں چلنی دورخی جیر دل پھیلے اُنکے انبار لگائے۔  
 الائج وہ کچھوٹی بڑی کی تیز نہ آئے۔ شب کو جسے طمائے۔ ہر شے کا صرف بے حساب رہا۔ کارندوں  
 نے جو ٹکڑیاں دے لیا۔ گھوڑی گز بھر کی تہی تھی۔ جہاں سے کاٹ کر کھائے سب مصاحم برابر پائے۔  
 شہر کے تنوکی سیٹھ ہو گئے۔ موہے اور گھم میں پاؤں نہ رہے۔ گھوڑی جو کھلائی وہ سرخ دیکھا کیا اعظم  
 باقی تھی ایک روز باغ توڑے اشرفی کے اور کئی ہزار کی چادر جو اُسوقت زیب و دس تھی عتبات  
 کی۔ اُسکی خاطر میں نہ آئی۔ روکھی صورت بنائی۔ گھر لٹنے پر مرے اُٹائے ہوس نکالتی ہو۔ سونا  
 اچھالتی ہو۔ گھوڑے وہ کہ اوہم صبا نے ہم اہی میں ہر بار تھوکر کھائی۔ گرد بنائی۔ وہم انسان خیال  
 قیام میں لگ۔ گمان تصور میں لنگ۔ ریش رستم بندہ زخیر بھی گرد تھا۔ ہر ایک ستر لپسٹ

جہان گرد تھا۔ باقی ایسے کہ دھن کی جان۔۔۔ پیل فلک سے زیادہ رفعت و شان سبک رو و بھول  
ایسے کہ جب چلنے پر آئیں حشرات الارض آزار نہ پائیں ہزار ہا جامہ دار گراں قیمت سہلا بھول  
اور گردنی کے واسطے قطع ہو گئے کشمیر سرود ہو گئی اور ہودج و زین سونے چاندی کے اتنے بنے  
کہ زمین سفید اور زرد ہو گئی۔ جسٹن خیال آیا اُسے اتنا سے کمال کو پہونچایا۔ اس عیش پسندی  
پر عشرہ محرم میں تار بعین دن رات ردنا۔ زمین پر سونا۔ لباس آبی یا سیاہ۔ لب پر نالہ و آہ بھولے  
سے نہ مسکراتا۔ ہزاروں روپیہ مرتجے خواں اور سادات محتاج آب و نان کو دینا رحسان لیتا۔ دوازدہ  
امام کی درگاہ۔ صاحب الام علیہ السلام کا غار بنوایا۔ لاکھوں روپیہ کا اسباب و ہاں چڑھایا۔ بیٹھے  
بیٹھے طبیعت جو لہرائی۔ گنگا سے نہر نکائی۔ چشمہ فیض جاری ہوا۔ یادگار رہا۔ مزدور غریب نہال  
کا رفرما صاحب مال و منال ہوئے۔ گرمی کی فصل میں گلدستوں کا چمن بنتا تھا۔ بھولونکا شیانہ متنا  
تھا اُسکے تلے مسہری لکھا سے خوشبو کی بھٹی تھی۔ گرد چار حوض رکھے جاتے تھے۔ دوسرے کار و چوبی  
کے پر نقش و نگار۔ عطر سے لبریز۔ بڑے نقتہ خیز۔ فوارے کی جا درخت بنتے تھے۔ بھول اور کلی سے  
فوارہ چھٹتا تھا۔ اور چوبی کے حوضوں میں درختوں پر جانور تھے۔ ان کی کرمیاں سے عطر اُچھلتا تھا  
ہر شام یہ سامان طیار ہوتا اور جس جگہ منظور ہوتا وہ باغ درست ہوتا۔  
آخر چرخ ستم گار نے اس صحبت کا رشک کھایا۔ ایسی بہار پر خزاں لایا۔ لکھو تباہ روز  
روشن سیاہ ہوا۔ صدائے اناحد وانا الیہ راجعون "آئی۔ سلطنت خاک میں ملائی۔ طبیعت اس  
صاحب افسردہ تاج کی ناساز ہوئی۔ لاش گور و کفن کی محتاج رہی۔ روح اس جان جہاں کی ہشت  
بریں کو بلند پرواز ہوئی۔

سیماں کشتہ زہر و غاشد غروب مہ بہ برج کر بلا سفد  
وہ صدر نشین چارہ باش عیش و طرب متوجہ دامن خاک ہوا اگر سیاں صبر جاگ ہوا تیسری تاریخ  
ربیع الثانی ۱۲۵۷ھ اور ساتویں جولائی ۱۸۴۱ء روز جمعہ تھا کہ یہ حادثہ غم انجام لہو میں آگیا۔  
سبحان امدوس برس سے زیادہ سلطنت کی۔ تمام شب گریس نہوئی۔  
فا عتبر ویا اولی الابصار



تصانیف دینیہ مولوی اشرف علی صاحبی

کلید ثنوی منوی حصہ ۱۴

۱۴ حصہ ۲

۱۶ تعلیم الدین

۱۶ فہرغ الا بیان

۱۱ جزائر الاعمال

۱۴ اصلاح الرسوم

۱۳ ہشتی زیور گیارہ حصہ فی حصہ

۱۴ نیکسا بیوان

۱۴ اعمال قرآنی ہر حصہ

۱۳ فتاویٰ اشرفیہ حصہ

۱۴ ایضاً حصہ

۱۴ فردوس آسیہ

۱۶ اور اور حافی

متفرق دینیات

۱۶ شفا العلیل ترجمہ قول الجلیل

۱۶ فوز الکبیر فی اصول التفسیر

۱۶ ہدیہ مجیدیہ ترجمہ تحفہ ثنائی عشرہ

۱۶ آیات بنیات حصہ اول جلد ۱

۱۶ جلد ۲ حصہ ۲

۱۶ جلد ۲

۱۶ فتاویٰ عزیز اُردو

۱۶ مکتوبات امام ربانی

۱۵ مقامات امام ربانی

تصانیف مولانا نذیر احمد دہلوی

۱۴ مراۃ العروس

۱۴ نبات النعش

۱۴ توبۃ النصوح

۱۸ محضات (فسانہ مبتلا)

۱۸ ایاط

۱۲ رویائے صادقتہ

۱۸ ابن الوقت

۱۸ مبادی الحکمت

۱۴ چند پند

تصانیف خواجہ الطاف حسین حالی

۱۴ حیات سعدی

۱۴ یادگار غالب

۱۴ مسدس حالی

۱۸ مجموعہ حالی نظم

۱۰ شکوہ ہند

متفرقات

۱۴ مخزن المفردات

۱۴ بستان المفردات

۱۴ تذکرہ علماء ہند

۱۴ تذکرہ علماء حال

۱۴ گلستان سخن (تذکرہ شعرا)

۱۴ سراپا سخن

۱۴ خزینۃ الاثمال

تصانیف عبدالحلیم صفا شریک دیر و گلزار		تصانیف حلیم محمد علی صفا دیر مرقع عالم	
ملک الغزیز ورجا	۱۵	جان و مهنور یا رحمت اکمل	عبد
منصور موبنا	۱۵	جعفر و عباسه	عبد
حسن انجلنا	۱۵	نیل کاسانپ	عبد
شید و فا	۱۶	اختر و حسینه	عبد
دکشن حصه ۱۰۲	حصه ۲	حسن سرور	عبد
دلچسپ حصه ۲	حصه ۳	دیوان دیوی	عبد
فردوس برین	۱۲	گورا	عبد
مقدس نازمین	عبد	تصانیف نشی سجاد حسین صفا دیر و دیرچ	عبد
زیا و دولا ده	۱۴	کایا پلٹ	عبد
یوسف و نجمه	عبد	احق الذی	عبد
درگیش نندنی	عبد	عاجی انجلول	عبد
میوه تلخ	عبد	طلسمی فانوس	عبد
بدور النساء کی مصیبت	عبد	میٹھی چھری	عبد
ایام عرب	عبد	پیاری دنیا	عبد
ماه ملک	عبد	تصانیف نشی جوالا پرشاد برق	عبد
جروب صلیب	عبد	معتوقہ فرنگ	عبد
شوقین ملکہ	عبد	آفتیاد	عبد
زوال بغداد	عبد	روہنی	عبد
قیس و لیلی	عبد	مار آستین	عبد
تصانیف مرزا محمد ہادی مرزا	عبد	مرزا لنی	عبد
امرا کو جان ادا	۱۶	پر تاب	عبد
ذات شریف	۱۶	بنگالی دھن	عبد
شریف زادہ	۱۶	بروگ	عبد

اطمشہ شفاعت علی علی شیریہ انارکلیک بحسب من آباد منستو







